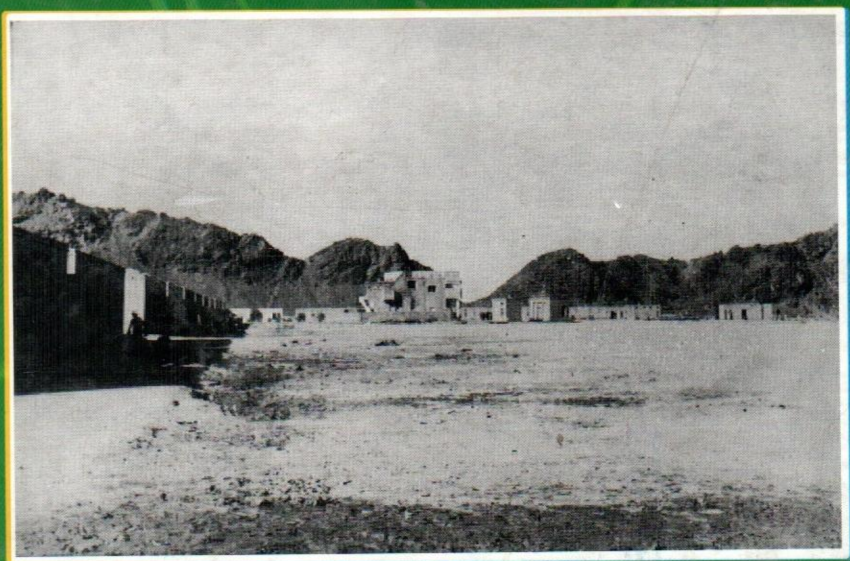
مضامینِ شاکر

(مطبوعہ مضامین عبدالرحمان شاکر صاحب)



ترتیب وتدوین

کلیم احمد

مبارک حسن

مضامینِ شاکر

(مطبوعہ مضامین عبدالرحمان شاکر صاحب)

ترتیب وتدوین

کلیم احمد

فہرست مضامین



چوہدری عبدالرحمان صاحب شاکر (مرحوم)

بسم اللہ الرحمان الرحیم

پیش لفظ

والد گرامی مکرم ومحترم عبد الرحمان شاکر صاحب ابن چوہدری نعمت اللہ گوہر صاحب (رفیق حضرت مسیح موعودؑ) کی ۵۰ سالہ علمی وادبی کاوشوں کو پہلی مرتبہ کتابی شکل میں مرتب کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

جو بھی اس کتاب کا مطالعہ کرے اس سے درخواست ہے کہ والد صاحب کے متعلق کوئی واقعہ یا تصویر اگر اس کے پاس ہو تو براہ کرم مندرجہ ذیل ایڈریس پر Email کردیں تو ممنون ہوں گی۔

kalimahmad @ rocketmail.com

تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کو بھی شامل کیا جا سکے۔ نیز اگر کتاب میں کوئی سقم ہو تو بھی راہنمائی فرما کر عند اللہ ماجور ہوں تا کہ آنے والے ایڈیشن میں اس کی درستگی کی جا سکے۔

ربقہ زاہدہ

بنت محترم عبد الرحمان شاکر صاحب



چوہدری نعمت اللہ صاحب گوہر (مرحوم)

عجب نوریست در جانِ محمد

میرے والد صاحب مرحوم چوہدری نعمت اللہ خان صاحب گوہر بی اے نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مشہور فارسی نظم عجب ''نوریست در جانِ محمد'' کا اُردو ترجمہ شروع کیا تھا۔ جو افسوس کہ مکمل نہ ہوسکا۔ جس قدر اشعار ہوگئے وہ پیش کرتا ہوں۔

عجب نور جانِ محمدؐ میں ہے
عجب لعل کانِ محمدؐ میں ہے
کبھی نفس کی دُور ظلمت نہ ہو
محمدؐ کی گر اس میں الفت نہ ہو
وہ نااہل ہیں اور ہیں ناشعور
جو خوانِ محمدؐ سے رہتے ہیں دور
خدا اس سے بے زار ہے لاکھ بار
محمدؐ سے جو رکھے دل میں غبار
مرا سر فِدا اُس کی ہے خاک پر
مرا دل فِدا احمدؐ پاک پر
مَیں ڈرتا نہیں راہ میں دین کی
محمدؐ سا ایمان ہے فطرت مری
کسی اور کا میں نہ دلدادہ ہوں
محمدؐ کے مکتب کا میں خواندہ ہوں
محمدؐ کا شیدا ہوں آشفتہ ہوں
محمدؐ کی میں آن کا کُشتہ ہوں
اُس جواں کو ہے رعب اس قدر
مقابل میں آتا نہیں ہے بشر
اے دشمنِ شوخ! رحماں سے ڈر
محمدؐ کی تُو تیغ بُرّاں سے ڈر

مائل ہے کشف و کرامت کا تُو
کہ منکر خدا کی ہے قدرت کا تُو
ذرا صبر کر اور کرامت کو دیکھ
غلامانِ احمدؐ کی سطوت کو دیکھ

ربِّ کریم............ہمارا مشکل کشا

ملکی تقسیم کے آخری ایام میں خاکسار ٹی آئی سکول قادیان میں کلرک تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر کہ اب کسی وقت بھی ہم کو یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ ضروری رجسٹر الگ رکھ رہا تھا کہ یکا یک ایک قوی ہیکل سکھ فوجی رائفل لیئے آ گیا۔ مجھ سے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہا دفتر کے کاغذات دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میرے ہاتھ میں ۵۰ کے قریب میٹرک کی سندات جو کامیاب طالب علموں نے وصول نہیں کی تھیں اس کی طرف وہ دیکھنے لگا اور میرے ہاتھ سے چھین لیں اور اوپر کی دس بارہ سندیں پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیں اور وہاں سے چلا گیا۔

آخر ہم قادیان سے نکلے اور ۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو چنیوٹ آئے۔ نارمل سکول کی صفائی کر کے سکول جاری ہو گیا۔

ایک دن ۔۔۔۔۔۔ابوذر صاحب جو ان دنوں گروٹ تحصیل خوشاب میں معلم تھے آ گئے۔ وہ میرے واقف تھے۔ بیٹھ کر کہنے لگے کہ یہ لڑکا میرا عزیز ہے اس کو داخل کرانا ہے۔ میرے ساتھ لڑکے کا والد بھی ہے۔ ہم غریب آدمی ہیں اس کی فیس معاف کر دی جائے میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب سیّد محمود اللہ شاہ سے بات کی۔ وہ فرمانے لگے جہاں باقی لڑکے ہمارے پاس ایسے ہی ہیں ایک اور سہی۔

..........صاحب موصوف نے مجھے آہستہ سے کہا کہ ہم تینوں رات کے بھوکے ہیں تم گھر کہلا بھیجو کہ کھانا تیار کریں۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ میں خود فاقے سے تھا۔ اب مجھے سخت گھبراہٹ ہوئی۔ سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ میری گھبراہٹ کا بس خدا تعالیٰ ہی کو علم تھا۔

اسی گھبراہٹ میں باہر سڑک پر نکل آیا اور دعا کی کہ خدایا زمین سے دو یا آسمان سے۔ اب میری تو عقل حیران ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے کہ جھنگ کی طرف سے ایک فوجی جیپ آئی اور میرے قریب آ کر رک گئی۔ اندر سے ایک نوجوان فوجی اترا اور بڑی بے تکلفی سے کہنے لگا کہ شاکر صاحب سلام۔ میں نے جواب تو دیا۔ میں اسے پہچان نہ سکا۔ وہ کہنے لگا واہ آپ ،قادیان میں ہمارے ہی محلّہ میں ریلوے سٹیشن کے قریب ہمارا گھر تھا۔ محمد حسین افریقہ والے میرے والد تھے۔ تب میں نے اسے پہچان لیا۔

وہ کہنے لگا کہ تقسیم کی وجہ سے ہندوؤں کے بہت سارے عہدے فوج میں خالی ہو رہے ہیں ایسا ہی ایک عہدہ میرے لئے بھی نکلا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ میرا میٹرک کا سرٹیفکیٹ لاؤں۔ آپ مجھے میرا میٹرک کا سرٹیفکیٹ عنایت کر دیں اور میں ابھی واپس جا کر بڑے افسر کے سامنے پیش کر دوں۔

میں نے کہا کہ کچھ سندات تو ایک سکھ نے پھاڑ دیں تھیں کچھ بچ گیئں وہ دیکھتا ہوں شاید اس میں تمہارا کام بن

جائے۔

وہ مجھے اس قدر لجاجت سے کہتا تھا کہ شاکر صاحب جلدی کریں آپ جس قدر چاہیں مجھ سے روپے لے لیں مگر سند تلاش کر دیں۔ چنانچہ اس نے میرے سامنے ایک رومال بچھا کر ۵۰،۶۰ روپے رکھ دیئے۔

میں نے دفتر جا کر دیکھا تو اُسی لڑکے کی سند اوپر ہی پڑی تھی۔ وہ سند لے کر فوراً واپس چلا گیا ؎

رکھ لی میرے خدا نے میری بے کسی کی شرم

(روزنامہ الفضل ۳ مئی ۱۹۹۳ء)

اِنفاق فی سبیل اللہ کی بَرکات

مجھ سے اگر کوئی پوچھتا ہے کہ تم کو تمہارے مرزا صاحب نے کیا دیا تو میں کہا کرتا ہوں کہ حضور علیہ السلام نے ہم کو دو ایسی چیزیں دی ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق۔ دوسرے دُعا کا گر۔ اب ہم کو خرچ کرنا آگیا ہے اور خوب سمجھ لیا ہے کہ خدا سے اگر کچھ لینا ہے تو اس کی راہ میں خوب خرچ کرو ؎

ہرچہ داری صَرف کُن در راہِ اُو

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا

(مثنوی رومی)

جہاد کی یوں تو کئی اقسام ہیں مگر آج کل کے زمانہ میں خُدا کے راہ میں روپیہ خرچ کرنا ہی ایک قسم کا بڑا جہاد ہے آیئے ایک احمدی دوست کا واقعہ سُنیے جس نے تبلیغ احمدیت کے لئے اپنا بہت سا مال خرچ کیا۔ تکلیف اُٹھائی۔ مگر خدا تعالیٰ نے اس کے بدلہ میں اسے بیشمار دیا اور ایسے طریقے سے دیا کہ اُس کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتا تھا۔

ضلع لاہور میں لدھیکے نیویں ایک معمولی سا گاؤں ہے۔ جنگ عظیم اوّل کے دنوں میں وہاں ایک احمدی جھنڈے خاں رہا کرتا تھا۔ اسے تبلیغ کا جنون تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے اپنی علمیت واستعداد کے مطابق پیغامِ حق سناتا رہتا۔ علاوہ ازیں مرکز سے علماء کو بلوا کر گاؤں میں پیغام احمدیت پہنچاتا۔ اس طریق میں اُس کی مخالفت بڑھ گئی اور لوگ اُسے خوب تنگ کرنے لگے۔ آدمی غریب تھے زمین بھی تھوڑی تھی اور وہ بھی آہستہ آہستہ گاؤں کے ہندو ساہوکار کے پاس رہن ہوگئی۔ فصل جو تھوڑی بہت آتی وہ ساہوکار ہی لے جاتا۔ ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ چوہدری جھنڈے خاں نے بوریوں میں ''پھک'' (یعنی چاولوں کا چھلکا) بھروا کر اندر رکھوالی تاکہ لوگوں پر یہی ظاہر ہو کہ غلّے کا انبار لگ رہا ہے۔ وہ خود اور اُن کی اہلیہ کھیتوں میں گرے ہوئے گندم کے خوشے چُن کر کچھ عرصہ گزراوقات کرنے کا سامان کر لیتے۔ غرض یہ کہ نہایت تنگی کے دن تھے۔ کچھ عرصہ بعد ساہوکار نے تمام رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔ اسی گھبراہٹ میں اُن کو خیال آیا کہ قادیان جا کر مقامات مقدسہ پر دُعا کروں ممکن ہے خدا تعالیٰ کوئی سبیل مخلصی کی نکال دے۔ مگر قادیان جانے کا کرایہ بھی نہ تھا۔ مجبوراً پیدل کئی دنوں میں وہاں پہنچے۔ مسجد مبارک میں نمازِ عشاء کے بعد دو نفل پڑھے اور نہایت عاجزی سے دُعا کی۔ چونکہ سخت اضطراب کی حالت تھی دُعا میں مُنہ سے یہ الفاظ نکلے۔

''مِرزیا ہُن میری لاج تُوں رکھ۔''

یعنی اے حضرت مرزا صاحب اب میری لاج آپ ہی رکھیں۔

تھکے ماندے تو تھے ہی وہیں فرش پر لیٹ گئے اور خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور کہا کہ تمہارے گاؤں کے باہر جو ''تھہ'' ہے وہ جا کر خرید لو۔

قادیان سے پھر پیدل واپس اپنے گاؤں آئے اور ''تھہ'' کی خریداری کا ارادہ کرلیا۔ یہ سیم زدہ ناکارہ زمین اُن کے ایک غیر احمدی عزیز کی تھی اُن سے کہا کہ بولو''تھہ'' کوفروخت کرتے ہو۔ اُس نے بھری مجلس میں کہا کہ اُسے لے کرکیا کرو گے؟ یہ بولے تم قیمت بتاؤ۔ وہ کہنے لگے تم جوگھاٹے کا سودا کرلیتے ہو۔ پہلے احمدیت قبول کر کے کیا نفع پایا ہے جواب ''تھہ'' کا سودا کرنے لگے ہو۔ غرضیکہ ۲۰ روپے میں سودا طے ہوگیا۔ جھنڈے خاں نے اُسی ہندو سے ۲۰ روپے لے کرادا کر کے زمین کاغذاتِ سرکار میں اپنے نام منتقل کرالی۔

اُنہی دنوں انگریز افسر فوج کی بھرتی کے لئے گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے ایک انگریز افسر مع فوج کے لدھیکے نیویں میں آ گیا۔ اُسنے ''تھہ'' کے قریب خیمے لگوائے۔ نمبردار حاضر تھا۔ صاحب نے اِدھراُدھر دیکھ کر پوچھا کہ یہ زمین کس کی ہے نمبردار نے کہا کہ ایک غریب سے آدمی کی ہے۔ اُس نے کہا کہ صبح اُسے بلوالو۔ کام ہے۔ نمبردار نے گاؤں کے چوکیدار کے ذریعہ جھنڈے خاں کو کہلوا بھیجا کہ کل صبح تم نے صاحب کے پیش ہونا ہے کہیں چلے نہ جانا۔ یہ بے چارے بہت ڈرے کہ کہیں نمبردار احمدیت کے بُغض کی وجہ سے مجھے بھرتی کروا کے فوج میں نہ بھجوا دے۔ غرض کہ رات پریشانی میں گزاری اور صبح خود ہی صاحب کے پاس چلے گئے۔

صاحب نے کہا کہ یہ زمین تھہ والی کیا آپ کی ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ بس سرکار کی ہے۔ صاحب نے قیمت پوچھی یہ کہنے لگے سرکار کے نام منتقل کرا دیتا ہوں۔ قیمت کیا لینی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ کہیں بھرتی نہ کرلیناز مین لے کرلو میری جان چھوڑو۔ آخر صاحب سے کہا کہ میرے ذمہ کچھ قرضہ ہے وہ اُتار دو۔ صاحب نے بہت سمجھایا کہ اس کی بہت زیادہ قیمت ہے تم کو معلوم نہیں۔ ہم یہاں پر سے قلمی شورہ لے کر بارود بنائیں گے جو جرمن کے خلاف استعمال ہوگا۔ پٹواری کو بلا کر وہ زمین سرکاری لکھ لی گئی ااور جھنڈے خاں کو کہا جاؤ تم کو قیمت گھر بھجوا دیں گے۔

کئی ماہ گذر گئے آخر ایک دن تحصیل لاہور کے سرکاری پیادے مع پولیس کے گاؤں میں آئے اور جھنڈے خاں کا مکان دریافت کیا۔ وہ خچروں پر چھ ۶ بوریاں چاندی کے روپے بطور قیمت کے لائے تھے جو سرکار نے بھجوائی تھی یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ بڑی سرکار نے جھنڈے خاں کو اُس کے صبر کا بدلہ دیا تھا۔ (نوٹ اس زمانہ میں بہت ہی کم تھے)

روپیہ ڈھیر کر کے رسید لے کر وہ تو رخصت ہو گئے۔ لیکن جھنڈے خاں خوشی خوشی ہندو ساہوکار کے گھر گیا کہ آ کر اپنی تمام رقم لے جاؤ۔

وہ ہندو بڑی عاجزانہ وضع بنا کر ہی کھاتہ بغل میں لئے آیا۔ چوہدری صاحب کو سلام کر کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ابھی یہ رقم گننے ہی لگے تھے کہ ہندو نے چیخ مار کر چارپائی سے چھلانگ ماری اور باہر بھاگ گیا۔ رنگ اس کا زرد ہو گیا اور نہایت عاجزی سے درخواست کرنے لگا کہ جناب چوہدری صاحب مجھے تمام روپیہ وصول ہو گیا ہے میری بہی مجھے دیدو میں رقم کاٹ دوں گا۔ سب وصول ہو گیا ہے۔ اس کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی۔ جھنڈیخاں نے بہت کہا کہ

اندر تو آؤ۔روپیہ تو لے لومگر اس نے ایک پیسہ نہ لیا اور سخت سہمی ہوئی حالت میں واپس چلا گیا اور پھر کبھی روپے کا مطالبہ نہ کیا۔(خاکسار کا خیال ہے کہ اسے کشفی حالت میں کوئی ہیبت ناک فرشتہ یا سانپ وغیرہ دکھائی دیا ہوگا اور اُس نے اسی میں خیر جانی کہ چپکے سے چلا جائے)اس کے بعد چوہدری صاحب نے ریلوے سٹیشن ترنڈا (نزد رحیم یار خان ریاست بہاولپور) سے دو میل پر زمین زرعی خریدی اور بڑے مزے سے باقی زندگی گزاری۔آج بھی بستی بابا جھنڈا پنجابی میں ہماری جماعت قائم ہے۔چندہ آتا ہے۔بابا تو دو تین سال ہوئے فوت ہو چکا ہے اُس کے پوتے موجود ہیں۔**واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب**

(ماہنامہ مصباح جون ۱۹۷۳ء)

تربیّتِ اولاد

اَیَوَدُّ اَحَدُکُم اَنْ تَکُونَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِیْهَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْکِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ . فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ٥

(سورۃ بقرہ رکوع ٣٦)

ترجمہ:۔ کیا تم میں سے کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اُس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس کے اندر نہریں بہتی ہوں (اور) اُسے اُس میں سے پھل ملتے ہوں اور اُسے بڑھاپے نے آلیا ہو اور اُس کے بچے (ابھی) چھوٹے چھوٹے ہوں ۔ پھر اُس باغ پر ایک ایسا بگولہ چلے جس کے اندر آگ ہو (اور) وہ باغ جل جائے ؟ (دیکھو) اللہ تمہارے لئے کس طرح کھول کر اپنی ہدایات بیان کرتا ہے تا کہ تم فکر کرو۔

جُوں جُوں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا زمانہ ہم سے دور ہوتا جارہا ہے نورِ نبوت کم ہوتا جارہا ہے دوسری جگہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِی خُسْرٍط یعنی انسان ہر روز گھاٹے میں جارہا ہے اس لئے ہم کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کی تربیت ایسے رنگ میں کریں کہ بعد میں کوئی پچھتاوا نہ ہو۔ ہم نے ہمارے بزرگوں نے احمدیت کو پرکھ کر بڑی گراں قیمت دے کر خریدا ہے۔ اس کے لئے بہت قربانی دی ہے ۔ وطنوں سے جُدا ہوئے ۔ رشتہ داریاں ترک کردیں مگر حضرت مہدی علیہ السلام کا دامن تھاما ہے اُسے مضبوطی سے تھامے رکھا۔ اب اگر ہماری اولادیں اس مقدس ورثہ کو بھلا دیں تو ہمارے لئے وہ دن سخت مصیبت کا ہوگا۔

کہنے کو تو یہ صرف دو لفظ ہیں ''تربیت اولاد'' مگر اس کے اندر بڑے وسیع معانی اور بے شمار قسم کی شدید ذمہ داریاں ہیں ۔ اس مضمون کے کئی پہلو اور ہر پہلو کی کئی شاخیں ہیں ۔ تاہم مختصراً تربیت اولاد کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی کان میں اذان اور تکبیر کہی جائے ۔ پہلا نام اللہ سکھایا جائے جب کھانے پینے لگے تو بسم اللہ سکھائی جائے ۔ ذرا بڑا ہو تو دائیں اور بائیں ہاتھ کی تمیز سکھائیں ۔ کلمہ طیبہ وغیرہ یاد کرایا جائے ۔ سات برس کا ہوجائے تو نماز یاد کرائیں ۔ دس سال کے بچے پر تو نماز ویسے ہی فرض ہوجاتی ہے ۔ قرآن مجید ناظرہ آتا ہو بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ ذرا سے خرچ اور توجہ سے بچے کو قرآن کریم حفظ کرایا جائے ۔ اس کا بہت ثواب ہے ۔ ایک خاندان میں اگر ایک حافظ قرآن ہو تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سات پشت کے گناہ معاف کردیتا ہے اور نزول برکات کا مورد بناتا ہے۔

جوں جوں بچہ جوان ہوگا اس کے فرائض بڑھتے جائیں گے اور انشاء اللہ اس دنیا اور آخرت میں کام آئیں گے ۔ سکول کے علاوہ گھر پر اسلامی عقائد کی تعلیم ہونی چاہیئے ۔ وقت کی پابندی سکھائیں ۔ اسلام اور احمدیت کی مختصر تاریخ سے آگاہی دیں ۔ بچے کے ہمجولیوں کو دیکھیں کہ وہ کس قسم کے ہیں ۔ بُرے لڑکوں سے اجتناب سکھائیں۔

بچے کے اساتذہ سے اُس کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کی رپورٹ لیتے رہیں اور بالکل غافل نہ ہو جائیں ۔ خدام الاحمدیہ اور لجنہ نے تربیت اولاد سے متعلق جو چھوٹے چھوٹے معلوماتی رسالے شائع کئے ہیں ان کے پڑھنے اور زیر مطالعہ رکھنے کی بچوں کو مسلسل تلقین کرتے رہیں۔

مگر یہ تمام کام آسان نہیں ہے۔ ہر شخص اتنی توجہ نہیں دے سکتا تاہم جس گھرانے پر اللہ کا فضل ہو وہاں کے مرد اور سمجھدار فرض شناس خواتین یہ سب کام بڑی ذمہ داری سے کرتے ہیں بشرطیکہ ان کو اپنے بچوں کی تربیت اور اپنی ذمہ داری کا احساس ہو۔

آجکل چونکہ مغربی بیماریاں آوارہ گردی۔ بے مقصد گھومنا۔ لغو اور فحش فلمی گانے۔ لمبے لمبے بال رکھنا ننگے سر پھرنا۔ ایسا لباس پہننا جو شرفاء کا لباس نہ ہو۔ یہ سب ہمارے معاشرے کو خرابی کی طرف لے جا رہا ہے۔ ان سب سے دامن بچا کر چلنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ تربیت کے بعض پہلوؤں کی مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۱) ۱۹۲۵ء میں خاکسار نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحبؓ ان دنوں وہاں تھے مجھ سے دریافت فرمایا کہ اب کیا کرو گے؟ میں نے جواب دیا کہ آوارہ گردی کریں گے! آپ کو بہت غصہ آیا اور مجھے حکم دیا کہ کل ہسپتال میں آ کر مریضوں کا رجسٹر لکھا کرو۔ آوارہ نہیں پھرنا۔ میں اُن کے سامنے بیٹھا رجسٹر لکھتا رہتا اور آپ گہری نگاہوں سے مجھے گھورتے رہتے اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ کوئی چیز میرے اندر سمائی جا رہی ہے۔ آپ کی صحبت کی یاد اب تک دل کو گرماتی رہتی ہے ؎

گر تو سنگِ خارہ و مرمر شوی
چوں بہ صاحب دل رَوِی گوہر شوی

(۲) بچوں کی تربیت کے لئے بعض دفعہ اپنے نفس کو مارنا پڑتا ہے اور اپنی سطح سے اُتر کر بچوں کی اصلاح کرنی ہوتی ہے۔ یہاں مجھے حضرت مولانا شیر علی صاحب کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔

نویں جماعت میں مولانا ہمیں انگریزی گرامر پڑھا رہے تھے۔ اور میں ریاضی کے سوالات نقل کر رہا تھا ۔ آپ نے دیکھ لیا اور فرمایا یہ کیا کر رہے ہو؟ میں چپ رہا۔ فرمانے لگے کہ آپ کلاس سے باہر چلے جائیں۔ مَیں جا کر برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ کے بعد مولانا میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ:۔

''آپ اب کلاس میں تشریف لا سکتے ہیں۔'' وہ ندامت اب تک دل پر ہے اور مولانا کے اخلاق عالیہ کا اثر جو میرے دل پر ہے وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

(۳) ہماری جماعت میں بھائی عبدالرحیم صاحبؓ (سابق سردار جگت سنگھ ساکن سُرسنگھ نزد پٹی ضلع لاہور) نو مسلم کا اپنا ہی مقام ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ کے رنگ میں رنگین اور دینیات اور عربی کے بہترین استاد تھے۔ بورڈنگ میں وہ ہمارے ٹیوٹر تھے۔ ایک غیر احمدی لڑکا جو بڑے امیر خاندان کا اکلوتا بیٹا تھا کہنے لگا کہ میرا تو نماز پڑھنے کو دل

نہیں چاہتا۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ بھائی جی کے اندر ایک بگولہ سا اٹھا مگر کمال ضبط کے ساتھ فرمایا ''جب تمہارا دل نہیں چاہتا تو نماز نہ پڑھو''۔ دوسرے تمام لڑکے نماز کے لئے چلے گئے۔ وہ اکیلا کمرے میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ضمیر نے اسے کاٹا اور وہ بورڈنگ سے آ کر نماز میں شریک ہوگیا۔ نماز کے بعد وہ بھائی جی کے آگے پیچھے پھرتا رہا تا دیکھ لیں کہ وہ بھی شامل نماز ہے مگر اُنہوں نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

چند روز کے بعد بھائی جی کو کہنے لگا کہ میری بیعت کرا دو۔ بھائی جی نے فرمایا کہ اپنے والدین سے تحریری اجازت منگوا لو وگرنہ مشکل ہے۔ اُسکے والدین نے لکھا کہ ہم نے تم کو قادیان میں نیک صحبت اور بہتر تعلیم کے لئے بھجوایا ہے۔ یہ بڑی سعادت ہے اگر تمہارا دل چاہتا ہے تو بیعت کر لو۔ اور اس نے بیعت کر لی۔

اگر اس کے نماز کے انکار پر بھائی جی ڈنڈا لے کر مارتے تو بجا تھا مگر اُن کی حکمت اور دلی دعاؤں اور تحمل اور بردباری نے کام بنا دیا۔

(۴) قادیان میں حکیم عبیداللہ بسمل صاحب بہت بڑے عالم۔ حکیم۔ فلسفی اور فارسی دان بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت مسیح موعودؑ نے ان کو اپنی جماعت کا فردوسی فرمایا۔ حضرت خلیفہ اوّلؓ فرماتے تھے کہ ''کاش مجھے عبیداللہ جتنی فارسی آتی ہو۔''

خاکسار اپنا فارغ وقت اُن کی خدمت میں گزارا کرتا تھا۔ آپ نے فارسی نظم میں فلسفہ حیاتِ انسانی پر ایک کتاب ''حیاتِ بسمل'' لکھی۔ جب وہ چھپ کر آئی تو مجھ سے فرمایا کہ کیوں کیسی ہے کتاب؟ میری بیوقوفی کہ میں نے جوش میں کہہ دیا کہ یہ نام درست نہیں۔ پوچھا کیا چاہیئے؟ میں نے کہہ دیا ''رقص بسمل'' چاہیئے۔ صاف ظاہر ہے کہ میری نادانی تھی۔ مولوی صاحب نے سخت بُرا منایا اور چہرہ سُرخ ہوگیا۔ میں یہ حالت دیکھ کر وہاں سے بھاگا اور تین دن متواتر ان کے ہاں نہ گیا تو ایک رات ۱۰ بجے کے قریب مولوی صاحب خود ہمارے گھر تشریف لائے۔ والد صاحب نے پوچھا کہ ایسا کیا کام تھا جو اس وقت تشریف لائے ہیں۔ فرمایا۔ ''آپ کو علم نہیں۔ عبدالرحمٰن شاکر ناراض ہو گیا ہے اُسے منانے آیا ہوں۔ تین دن سے ملنے نہیں آیا'' جب والد صاحب کو تمام واقعہ کا علم ہوا تو مجھے بہت سخت سست کہا اور مجھے کہا کہ فوراً معافی مانگو۔ مَیں مولوی صاحب کے قدموں میں بیٹھ گیا اور معافی چاہی۔ اب دیکھئے کہ اس قدر عالمِ بے بدل نے میری اصلاح کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا۔ آپ فرما سکتے ہیں کہ یہ تمام فرائض ادا کرنے کے لئے پھر تمام گھروں میں سکول ہی کھل جائیں گے۔ جواب یہ ہے کہ ہاں۔ اگر تربیت کرنی ہے اور بچوں کو پکا احمدی بنانا ہے تو یہی طریق ہے۔ اگر بار بار مسائل اُن کے دماغوں میں بسائے نہ جائیں گے تو محفوظ کیسے ہونگے۔

انگریزی زبان میں ایک لفظ ہے Drill جس کے معنی ''برمے'' کے ہوتے ہیں۔ ایک جگہ پر سوراخ بنا پھر دوسری جگہ پر بنا۔ یہی لفظ ڈرل فوج میں اور سکول میں استعمال ہوتا ہے کہ ایک مشق کو بار بار کرایا جائے۔

(۵) میرے والد محترم مولوی نعمت اللہ صاحب گوہر بی۔ اے نے بچپن سے ہمیں سکھا دیا کہ احمدیت کے سوا

دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔ میں سوائے احمدیوں کے کسی دوسرے کو مطلق خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر عبدالغنی صاحب اور والد صاحب کے ہمراہ میں لاہور کی شاہی مسجد دیکھنے گیا۔ واپسی پر ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ کیوں بھئی یہ مسجد تم کو پسند آئی؟ میں نے پوچھا اسے کس نے بنوایا تھا؟ انہوں نے بتایا کہ اورنگ زیب نے۔ اتنا مجھے علم تھا کہ اورنگ زیب ایک نیک اور بزرگ مسلمان بادشاہ تھا۔ اب میں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ ”یہ بتائیں کیا اورنگ زیب احمدی تھا؟ وہ میرے اس سوال پر بہت ہنسے۔

(۶) حضرت میر محمد اسحٰق صاحبؓ کا طریق تربیت:۔ خاکسار ایک دن ننگے سر جامعہ احمدیہ قادیان چلا گیا ۔میر صاحب میرے حال پر بہت مہربان تھے ہم اُن کے پڑوس میں عرصہ تک رہے تھے۔ فرمانے لگے کہ جاتے ہوئے مجھ سے مل کر جانا۔ میں حاضر ہوا تو مجھے دُور درختوں کے ایک جھنڈ میں لے گئے اور فرمایا کہ تمہارے دوست تم سے پوچھیں گے کہ میر صاحب سے کیا بات ہوئی مگر کسی کو کچھ نہ بتانا۔ میں نے کہا درست ہے۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ ”دیکھو! شریف زادے ننگے سر نہیں پھرا کرتے۔“

یہ تمام معمولی واقعات ہیں مگر بڑے سبق آموز ہیں۔ ایک اور نہایت اہم چیز جو بچوں کے ذہنوں میں جاگزیں کرائی جائے وہ یہ ہے کہ خلیفہء وقت کی کیا عظمت ہے۔ مرکز سلسلہ کی کیا اہمیت ہے۔ وہاں اکثر حاضری دی جائے ۔بزرگان سلسلہ کی خدمت میں حاضری دی جائے۔ بہر حال مرکز سے رابطہ ضرور ہونا چاہیئے۔

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

آجکل کے مخرب اخلاق رسائل۔ ناول وغیرہ سے خود پرہیز کریں اور بچوں کو پرہیز کرائیں۔ ہاں صحتمند لٹریچر ضرور مطالعہ کرائیں۔ کتب بینی بھی بہترین شغل ہے۔ ان سب امور کے حصول کیلئے والدین کی بچوں کے حق میں دعائیں بھی بڑی چیز ہیں۔

احمدیت ہے زمانے میں وہ یکتا گوہرا\
جوہری سر بگریباں ہیں قیمت کے لئے

مولوی نعمت اللہ گوہر والد خاکسار عبدالرحمان شاکر (ماہنامہ مصباح اگست ۱۹۷۸ء)

قدیم ہندوستان کا محمدی المشرب نبی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَافِیْھَانَذِیْر ۔یعنی دنیا کی ہر قوم میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا آیا ہے۔ لازم تھا کہ ہندوستان میں بھی ایک نہیں بہت سارے نذیر آتے۔

ہندو قوم میں حضرت کرشن علیہ السلام کی بڑی مانتا ہے۔ کروڑوں آدمی ان کے نام لیوا ہیں اور اپنے وقت کے بہت بڑے خدا رسیدہ بزرگ خیال کرتے ہیں۔

ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ زمرۂ انبیاء میں سے تھے۔ حدیث حسب ذیل ہے:۔

کَانَ فِیْ سَوَادِالْھِنْدِنَبِیٌّ اَسْوَدَاللَّوْنِ اِسْمُہٗ کَاھِنٌ

ترجمہ۔ ہندوستان کے ملک میں ایک کالے رنگ کا نبی ہوا ہے جس کا نام کاہن (کنہیا) تھا۔

(فردوس الاخبار (دیلمی)۔ دیلمی پانچویں صدی کا محدث اور مورخ بھی ہے)

اور یہ تو مشہور خلائق بات ہے کہ حضرت کرشن کو عام طور پر کنہیا کہہ کر پکارا جاتا ہے اور ان کا رنگ سیاہ رنگ ظاہر کیا جاتا ہے۔ حضرت ہرگز کالے نہ تھے مگر ایک دفعہ جنگل میں سوئے ہوئے تھے کہ کسی شکاری نے ان کو شکار سمجھ کر زہر میں بجھا ہوا تیر مارا جس کے اثر سے رنگت حسن ملیح کی اعلیٰ مثال بن گئی [1]

حضرت کرشنؑ ایک نہایت محتاط اندازے کے مطابق ۳۵۰۰ برس قبل متھرا میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے اور دہلی سے ۸۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ نہایت سرسبز علاقہ ہے۔ چاروں طرف ہریاول ہی ہریاول ہے۔ وہاں پر اُس زمانہ میں حضرت کرشنؑ کے ماموں کنس کا راج تھا یہ شخص سخت ظالم تھا۔ اور تمام رعایا اس کے مظالم کے سامنے دم بخود تھی۔

آپ کے والد کا نام واسودیو اور والدہ کا نام دیوکی تھا۔ واسودیو کی دس بیویاں موجود تھیں کہ کنس کی ہمشیرہ سے شادی کی۔ جب واسودیو اپنی نئی بیوی کو لے کر جلوس میں آ رہا تھا تو آسمان سے ایک بلند آواز آئی کہ "اے مورکھ! جس لڑکی کو اُس کا خاوند لئے جا رہا ہے اُس کا آٹھواں بچہ کنس کو قتل کریگا۔"

کنس ڈر گیا اور پریشان رہنے لگا۔ اُس نے دھیان رکھا کہ جب بھی اس کی ہمشیرہ کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ اس کو قتل کرا دیتا۔ آٹھویں بچے کی پیدائش سے قبل اس نے اپنے بہنوئی اور ہمشیرہ کو جیل خانہ میں ڈال دیا۔ مگر انہوں نے جیل کے اندر سے باہر رابطہ قائم کرلیا۔ اور جب ایک نہایت تند و تاریک طوفانی رات حضرت کرشنؑ

---

[1] حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"ایک بار ہم نے کرشن جی کو دیکھا وہ کالے رنگ کے تھے پتلی ناک، کشادہ پیشانی والے ہیں۔ (تذکرہ ص ۳۹۲ طبع دوم)

پیدا ہوئے تو باپ نے افسران جیل سے پہلے ہی ساز باز کی ہوئی تھی فوراً بچے کو لے کر اپنے ایک دوست نندا کے گھر پہنچے اور اسکی نوزائیدہ بچی کو لا کر جیل میں لٹا دیا۔ صبح کو جب کنس نے دیکھا کہ اُس کی ہمشیرہ کی گود میں ایک لڑکی ہے تو اُس نے اُس کو فوراً دیوار سے پٹخ کر ہلاک کر دیا۔

حضرت کرشنؑ بچپن میں بڑے خوبصورت، خوش شکل، ہونہار، صحت منداور ذہین وفطین تھے۔ اُن کی معصوم اداؤں سے تمام خورد وکلاں محظوظ ہوتے تھے۔ جب وہ خاصے بڑے ہوگئے تو کنس کو علم ہوا کہ یہ لڑکا دراصل اس کا بھانجہ ہے ایک میلہ میں کنس نے اُن کو دھوکے سے قتل کرنا چاہا مگر کرشن زیادہ پھرتیلے تھے اُنھوں نے اپنے ماموں کو سب کے سامنے قتل کر دیا اور ملک کو اس ظالم اَظلم سے نجات دی۔

ازاں بعد آپ کاشی گئے تا کہ علم حاصل کریں مگر اُن کو جلد واپس لوٹنا پڑا کیونکہ کنس کے خسر نے متھرا پر بدلہ لینے کے لئے حملہ کر دیا تھا۔ اس کا دفاع بہت ضروری تھا۔ اس کے بعد آپ ہجرت کر کے کاٹھیاواڑ گجرات (موجودہ ریاست جوناگڑھ) میں چلے گئے اور وہاں اپنی ریاست میں امن وامان سے رہنے لگے۔ تاہم اپنے عزیزوں سے ملنے کیلئے کبھی کبھی متھرا آیا کرتے تھے۔ کورو پانڈو کی جنگ مہا بھارت میں جو ۱۸ دن جاری رہی تھی آپ بذات خود تو اپنے بھانجوں، پانڈو، کی طرف تھے مگر اپنی تمام فوج کوروں کو دیدی تھی۔

جنگ کے وقت جب آپ نے دیکھا کہ ارجن اپنے مدّ مقابل اپنے ہی قریبی عزیزوں کو صف آراء دیکھ کر دل چھوڑ بیٹھا ہے اور لڑنا نہیں چاہتا تو اُس وقت آپ نے جو تقریر فرمائی وہ گیتا کہلاتی ہے۔ اسے ایک خطبہء الہامیہ سمجھئے۔ یعنی مہا بھارت کے اندر ایک اور جنگ لڑی گئی جس کو باطنی جنگ کہہ سکتے ہیں۔ یہ فرائض اور جذبات کی جنگ تھی۔ ارجن رتھ پر سوار تھا اور رتھ بان حضرت کرشنؑ تھے۔ ارجن جب دیکھتا ہے کہ اس کے مدِ مقابل اس کے گورو، چچا، بھائی وغیرہ ہیں تو اس کے مَن کے اندر ایک جنگ شروع ہوگئی۔ اس اپدیش میں آپ ارجن کو سمجھاتے رہے کہ یہ راجے، مہاراجے، لشکری وغیرہ محض فریبِ نظر ہیں۔ تمام کاموں کا باعث خود خدا ہے جس کو قطعاً زوال نہیں ہے۔ انسان کو اپنے اعمال خدا کی رضاء کے لئے کرنے چاہئیں۔ ایسے وقت میں اپنے جذبات اور تعلقات سے بلند ہو کر خدا تعالیٰ کی رضاء کو پورا کرنا چاہیئے اور اپنی رتھ (مراد قوتِ عمل) کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں دیدے۔ جذبات کو فرائض پر غالب نہ آنے دے۔ حق کے لئے پوری کوشش کرے اور تمام کاموں کو خدا کا کام سمجھ کر پورا کرے وغیرہ۔

گو اب گیتا اپنی اصل شکل میں نہیں ملتی تاہم جو کچھ ملتا ہے اس میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جنہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی کتاب ہوتی تھی۔ ہندو قوم آج تک حضرت کرشنؑ کی بعثت ثانیہ کی منتظر ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کے قانون کے مطابق جو شخص فوت ہو جائے پھر وہ کبھی اس دنیا میں واپس نہیں آ سکتا۔ ہاں اس کا مثیل یا بروز ضرور آ سکتا ہے۔

چنانچہ اس زمانہ میں حضرت کرشنؑ کے بروز جری اللہ فی حلل الانبیاء حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ہیں۔

حضورؑ نے بمقام سیالکوٹ ۲ نومبر ۱۹۰۴ء کو بڑی تحدی سے اعلان فرمایا:۔

''اور جیسا کہ خدا نے مجھے مسلمانوں اور عیسائیوں کے لئے مسیح موعود کر کے بھیجا ہے۔ ایسا ہی میں ہندوؤں کے لئے بطور اوتار کے ہوں۔ اور میں عرصہ بیس برس سے یا کچھ زیادہ برسوں سے اس بات کو شہرت دے رہا ہوں کہ میں اُن گناہوں کے دُور کرنے کے لئے جن سے زمین پُر ہوگئی ہے جیسا کہ مسیح ابن مریم کے رنگ میں ہوں ایسا ہی راجہ کرشن کے رنگ میں بھی ہوں جو ہندو مذہب کے اوتاروں میں سے ایک بڑا اوتار تھا یا یوں کہنا چاہیئے کہ روحانی حقیقت کی رُو سے وہی ہوں۔ یہ میرے خیال اور قیاس سے نہیں ہے بلکہ وہ خدا جو زمین اور آسمان کا خدا ہے اُس نے یہ میرے پر ظاہر کیا ہے۔ اور نہ ایک دفعہ بلکہ کئی دفعہ مجھے بتلایا ہے کہ تُو ہندوؤں کے لئے کرشن اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے لئے مسیح موعود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جاہل مسلمان اس کو سُن کر فی الفور یہ کہیں گے کہ ایک کافر کا نام لے کر کفر کو صریح طور پر قبول کیا ہے لیکن یہ خدا کی وحی ہے جس کے اظہار کے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔ اور آج یہ پہلا دن ہے کہ ایسے بڑے مجمع میں اس بات کو میں پیش کرتا ہوں کیونکہ جو لوگ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ اب واضح ہو کہ راجہ کرشن جیسا کہ میرے پر ظاہر کیا گیا ہے اپنے وقت کا اوتار یعنی نبی تھا جس پر خدا کی طرف سے روح القدس اُترتا تھا۔ وہ خدا کی طرف سے فتح مند اور با اقبال تھا۔ جس نے آریہ ورت کی زمین کو پاپ سے صاف کیا۔ وہ اپنے زمانہ کا درحقیقت نبی تھا جس کی تعلیم کو پیچھے سے بہت باتوں میں بگاڑ دیا گیا۔ وہ خدا کی محبت سے پُر تھا اور نیکی سے دوستی اور شر سے دشمنی رکھتا تھا۔ خدا کا وعدہ تھا کہ آخری زمانہ میں اس کا بروز یعنی اوتار پیدا کرے۔ سو یہ وعدہ میرے ظہور سے پورا ہوا۔ مجھے منجملہ اور الہاموں کے اپنی نسبت ایک یہ بھی الہام ہوا تھا کہ ہے۔ **کرشن رودر گوپال تیری مہما گیتا میں لکھی گئی ہے۔ سو میں کرشن سے محبت کرتا ہوں کیونکہ میں اُس کا مظہر ہوں۔''** (لیکچر سیالکوٹ)

اب ہندوستان کے دو چوٹی کے بزرگوں کی شہادت پیش کرتا ہوں جس سے حضرت کرشنؑ کے برگزیدہ نبی ہونے کا قطعی ثبوت ملتا ہے اور ان کے نبی ہونے کا اقرار کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے:۔

(۱) حضرت خواجہ مظہر جان جاناں صاحب دہلوی ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے ملفوظات کو اُن کے خلیفہ حضرت غوث علی شاہ صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کے صفحہ ۲۶ پر انہوں نے ابو صالح خاں سے ایک روایت نقل کی ہے کہ وہ ایک دفعہ متھرا گئے۔ وہاں ان کو کچھ روپوں کی ضرورت پیش آئی۔ رات کو تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک شخص بعینہٖ کرشن کے مشہور حُلیہ میں اُن کے سامنے آئے اور بعد سلام کے اس نے سات روپے بطور نذرانہ پیش کیئے۔ انہوں نے کہا ٹھہرو! میں نماز ادا کر لوں۔ نماز ادا ہو چکی تو انہوں نے شخص مذکور سے پوچھا کہ تمہارا نام

کیا ہے؟ اسنے کہا میرا نام کرشن ہے اور یہ سات روپے آپ کی ضیافت کے ہیں کیونکہ آپ میرے شہر میں آئے ہوئے ہیں۔

ابو صالح نے کہا کہ میں مسلمان محمدی المشرب ہوں۔ میں مشرکوں کا ہدیہ قبول نہیں کر سکتا۔ کرشن نے کہا واہ! کیا آپ ہمیں مشرکوں میں شمار کرتے ہیں؟ ہم تو آپ ہی کے مشرب پر ہیں۔ پھر بولے کہ ہم نے تو نبی آخرالزمانؐ کی تعریف اور آپؐ کے پیروؤں کے اخلاص کا ذکر سُنا تھا اب اس سے زیادہ مشاہدہ کر لیا ہے۔''

(۲) اسی طرح تیرھویں صدی کے صوفیاء میں سے حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے ملفوظات موسومہ بہ ''تذکرہ غوثیہ'' سے آنجناب کے ایک خواب کا اندراج اس جگہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا لیکن خواب کے ذکر سے پہلے انہوں نے وہ واقعہ درج کیا ہے جو اس خواب کے آنے کا موجب ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ہندو پنڈت کے اصرار کی بناء پر انہوں نے ''برہم گائتری منتر'' کا پاٹھ کیا تھا۔ جب پاٹھ ختم ہو گیا تو فرماتے ہیں کہ جس روز ہم پاٹھ کر چکے تو آخرِ شب میں یہ خواب دیکھا کہ عین دریائے گنگ میں ایک طرف خاتم الرسل محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام تشریف لائے ہیں اور ایک مجلس آراستہ پیراستہ ہوئی۔ دوسری جانب شری کرشن جی مہاراج بمع اپنے رفیقوں کے رونق افروز ہوئے۔ تب شری کرشن نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ان کو (جناب غوث علی شاہ کو) سمجھائیے یہ کیا کرتے ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا مہاراج تم ہی سمجھاؤ۔ پھر مہاراج نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ برخوردار! تمہارے ہاں کیا کچھ نہیں جو دوسری طرف ڈھونڈتے ہو؟ کیا تم نے دوئی سمجھی ہے؟ یہاں اور وہاں ایک ہی بات ہے (بحوالہ تذکرہ غوثیہ ص ۴۷۔۴۸ مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی ۱۹۱۱ء) یعنی حضرت کرشن جی مہاراج نے جناب غوث علی شاہ صاحب کو گائتری منتر کا پاٹھ کرنے سے منع کیا۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ گائتری منتر خداتعالیٰ کی تعریف میں نہیں ہے بلکہ آفتاب کی تعریف میں ہے اور اسے تسخیر آفتاب کا منتر ہندو پنڈت خیال کرتے ہیں۔ ایک ہندو پنڈت نے یہی منتر اکبر بادشاہ کو سکھا کر دین اسلام سے بدظن کر دیا تھا۔ لیکن آج تک کبھی کوئی ایسا شخص دیکھا نہ سُنا جس کے حکم پر آفتاب چلتا یا پھرتا ہو۔

پس ثابت ہوا کہ گو حضرت کرشن علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اندازاً ۲۱۰۰ برس قبل مبعوث ہوئے مگر ہیں وہ قبیلہ انبیاء میں سے اور محمدیؐ المشرب۔ اور آجکل حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ السلام ان کے بروز ہیں۔

نوٹ نمبر۱۔ گائتری منتر کا منظوم اُردو ترجمہ علامہ اقبال نے کیا ہے۔ دیکھئے بانگ درا ص ۳۰ ''آفتاب''

نوٹ نمبر۲۔ حضرت کرشنؑ کی عمر ۱۲۵ برس تھی

(ماہنامہ خالد جون ۱۹۷۳ء)

عاقِبةُ المُکَذِّبِیْن

ا۔ مولوی کرامت اللہ پٹیالوی

پٹیالہ میں مہندرا کالج ایک مشہور درسگاہ ہے۔ ۱۹۰۰ء کے قریب اس میں فارسی کے ایک نہایت قابل پروفیسر مولوی کرامت اللہ صاحب ہوتے تھے۔ میرے والد صاحب مرحوم مولوی نعمت اللہ خان صاحب گوہر بی۔اے بھی ان کے شاگرد تھے۔

میاں خدا بخش صاحب عرف مومن پٹیالوی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں عرض کیا کہ پٹیالہ میں کرامت اللہ صاحب بڑے مشہور مولوی ہیں اگر حضور پسند فرمائیں تو کچھ کتب عنایت فرمائیں جو ان کو پیش کروں۔ شاید وہ مطالعہ کے بعد احمدی ہو جائیں۔ حضور علیہ السلام نے مومن جی کو کچھ کتب عنایت فرمائیں۔ جب وہ لے کر اُن مولوی صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت مرزا صاحب نے یہ آپ کیلئے بھجوائی ہیں تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔

مومن جی نے حضورؑ کو لکھا کہ وہ تو کتب لینے سے انکاری ہیں۔ حضورؑ نے فرمایا کہ آپ وہ کتب ان کی مسجد میں رکھ دیں وہ خود توجہ کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر اُن مولوی صاحب کی جو آئی شامت انہوں نے وہ کتابیں اُٹھا کر باہر نالی میں پھینک دیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد خدا تعالیٰ کی قدرت سے مولوی کرامت اللہ صاحب کا دماغی توازن بگڑ گیا اور وہ اس قدر پاگل ہو گئے کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ حتّٰی کہ جب ان کو پیاس لگتی تو وہ کسی نالی کے آگے مٹی کا بند لگا کر پانی روک لیتے۔ اور وہی جمع شدہ پانی چلّو سے پیتے۔

۱۹۱۳ء میں میرے والد صاحب مزنگ لاہور کے سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ پاگل خانہ اور جیل خانہ کے ملازمین کے بچے مزنگ سکول میں پڑھنے کیلئے داخل تھے۔ ان کے والدین نے ایک دفعہ تمام سکول سٹاف کو دعوتِ طعام دی اور ساتھ ہی پاگل خانہ دکھانے کی بھی پیشکش کی۔ مجھے خوب یاد ہے ایک سہ پہر کو ہم سب وہاں گئے۔ ابھی ہم جا کر اُترے ہی تھے کہ صاحب نے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شیشم کے ایک بہت بڑے درخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اُوپر کے ٹہنے پر اور ایک نچلے ٹہنے پر۔ دوسرے آدمی کے ہاتھ میں ایک انگریزی اخبار تھا اور وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا کہ میں نبی ہوں اور یہ میری کتاب ہے۔ جب وہ اپنی بات ختم کر لیتا تو اوپر والا پاگل کہہ دیتا کہ ''میں نے اس کو نبی بنا کر نہیں بھجوایا یہ غلط کہتا ہے۔''

اس کے بعد ہم اندر گئے۔ یکا یک ایک جگہ میرے والد صاحب رُک گئے اور جو صاحب ہمیں دکھا رہے تھے

ان سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟انہوں نے بتایا کہ یہ پٹیالہ کا کوئی شخص ہے، ہے بہت لکھا پڑھا والد صاحب نے کہا کہ یہ تو میرے فارسی کے استاد مولوی کرامت اللہ ہیں۔ان سے باتیں کرنے کیلئے کوشش بھی کی مگر انہوں نے توجہ ہی نہ کی۔

حضرت امام الزمان علیہ السلام کی کتب نالی میں پھینکنے کی سزا کس قدر سخت ملی!

۲۔ چراغ دین جمونی کا واقعہ

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے مریدوں میں ایک شخص چراغ دین نامی جموں میں رہا کرتا تھا۔اوائل ۱۹۰۲ء میں اسکے دماغ میں جو خبط سمایا تو دعویٰ کر دیا کہ خدا نے اُسے مسلمانوں اور عیسائیوں کے اختلافات مٹانے کیلئے مبعوث کیا ہے۔حضور علیہ السلام نے جو اس کے متعلق جناب الٰہی میں توجہ فرمائی تو الہام ہوا:۔

نزل به الجبیز

جبیز سے مراد خشک بے مزہ روٹی۔جو حلق سے بمشکل تمام اترے حضور نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ یہ سب اسکے اپنے نفس کے دھوکے ہیں۔چراغدین کے متعلق دوسرا الہام ہوا۔

اَنی اُذیبُ مَنْ یُریبُ

یعنی میں فنا کردوں گا۔میں غارت کردوں گا۔میں غضب نازل کردوں گا اگر اس شخص نے حضرت مسیح موعودؑ پر ایمان نہ لایا تو۔حضور نے یہ اعلان چھپوا کر اسے بھجوادیا نیز حضرت مولانا محمد احسن صاحب امروہی کو فرمایا کہ اسے دوستانہ رنگ میں سمجھائیں تاکہ تباہی سے بچ جائے حضور نے اس اعلان کو اپنے رسالہ دافع البلاء کے ساتھ ہی چھاپ دیا اس پر چراغدین سنبھل گیا اور ایک توبہ نامہ لکھ کر حضرت کی خدمت میں بھجوادیا جو منظور کر لیا گیا۔

مگر کچھ عرصہ بعد پھر جو اس کا دماغ خراب ہوا تو اس نے اب کی بار ایک کتاب بنام منارۃ المسیح بھی لکھ دی اور لکھا کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مجھے اپنا عصا دیا ہے تاکہ میں دجال کو قتل کر دوں وغیرہ تقریباً ایک سال بعد ایک اور کتاب لکھی اس میں حضرت اقدس کے خلاف دعاء مباہلہ بھی لکھی اس دعا مباہلہ کا عکس حضور نے حقیقۃ الوحی کے صفحات ۲۲۰ اور ۳۷۲ تا ۳۷۸ پر دیا ہے۔

خدا تعالیٰ کی حکمت کہ ابھی وہ کاپیاں پریس میں پتھر پر جمی بھی نہ تھیں کہ چراغدین کے دو بیٹے (جو دو ہی تھے) پلیگ سے فوت ہو گئے جس کا اسے از حد رنج ہوا۔اور چند روز کے بعد وہ خود بھی بیمار ہو گیا۔

حضرت قاضی عبدالرحیم صاحب سابق افسر تعمیرات ان دنوں جموں میں ملازم تھے انہوں نے یہ واقعہ حضرت کی خدمت میں لکھ دیا۔جس کا جواب حضرت مفتی محمد صادق صاحب نے دیا اور لکھا کہ مزید حالات بھجوائیں۔

اب آگے آپ قاضی صاحب کے الفاظ میں سنیئے:۔

''آج میں چراغدین کے مزید حالات دریافت کرنے کیلئے اس کے مکان کی طرف جارہا تھا کہ راستے میں یعقوب مسیحی امریکن مشن کے پادری سے ملاقات ہوئی یہ شخص اس کا (چراغدین کا) بڑا انیس تھا۔ چراغدین عموماً اس سے مجلس رکھتا تھا۔ یعقوب مسیحی اس کی تصانیف کا ازحد ثنا خواں تھا......... یعقوب کہتا ہے کہ اگر کوئی مرزائی اسے بغور دیکھے تو اس کے دیکھنے کے بعد وہ مرزائی نہیں رہ سکتا......... یعقوب اس کا نہایت مداح ہے...... زندگی میں اس کی (چراغدین کی) حالت نہایت ردی اور ذلیل تھی اس کی عورت پر لوگ یاری آشنائی کا الزام لگاتے تھے ممکن ہے کہ وہ اس کی زندگی میں ہی خراب ہو یہ شخص مقروض تھا اور اس کی اور اس کے بچوں کی تکفین پر چندہ کیا گیا تھا۔

یعقوب مسیحی سے مل کر بعد ازاں میں چراغدین کے مکان پر پہنچا وہاں اس کی عورت اور دو ایک محلہ دار عورتیں موجود تھیں ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بروز ہفتہ چراغدین کے دونوں لڑکے فوت ہوئے۔ سوموار دس بجے کے قریب وہ اپنے بچوں کا افسوس کرتا تھا کہ بخار میں مبتلا ہو گیا........ بیماری کے دوسرے روز مسہل کرایا گیا مگر پاخانہ نہ آیا پھر تیسرے روز مسہل کرایا گیا مگر قبض کشائی نہ ہوئی اس کی زبان سیاہ ہو گئی تھی........ ساتویں روز بدھ ۴ اپریل ۱۹۰۶ء کو وہ مر گیا۔

مرنے سے پیشتر اس سے پوچھا کہ کسی چیز کی خواہش ہے تو اس نے برف مانگی چنانچہ لا کر تھوڑی سی کھلائی گئی ...... ایک دو گھونٹ دودھ پیا۔ عام رائے یہی ہے کہ اس نے کچھ نہیں کھایا اور پاخانہ مطلق نہیں آیا ڈاکٹر کہتا ہے کہ شروع میں اسے پلیگ فیور تھا ساتویں روز سے مہلک نمونیا ہو گیا۔ اس کا پیٹ پھول گیا تھا۔ مرنے کے بعد تو اچھا خاصا سوج گیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر رات کو رکھا جاتا تو شاید پھول کر پھٹ جاتا بدھ کو ۴ بجے مرا ہے اسی وقت دفن کر دیا گیا۔ بیماری سے پہلے بہت لوگوں کے روبرو اس نے بچوں کے افسوس میں کہا کہ اب خدا بھی میرا دشمن ہو گیا ہے........ ڈاکٹر کے روبرو کہا کہ خدا پر مجھے کوئی امید نہیں۔''

حضرت مفتی صاحب نے یہ خط جو پرائیوٹ نوعیت کا تھا اخبار میں چھاپ دیا اسکے شائع ہونے پر مخالفین نے ایک مقدمہ کھڑا کرنا چاہا اور نتیجہ اگر ان کی حسب مراد نکلتا تو گویا یہ نشان مشتبہ ہو جاتا اور لوگ خیال کرتے کہ اگر چراغدین کی تذلیل ہوئی تو دیکھ لو کہ مرزا صاحب بھی بچ نہ سکے۔

چنانچہ مقدمہ کی پیروی کیلئے غیر احمدیوں اور عیسائیوں نے ایک کمیٹی بنائی ۵۰۰ روپیہ چندہ بھی جمع کر لیا گیا مگر جس روز یہ مقدمہ عدالت سرکاری میں دائر کرنا تھا معلوم ہوا کہ چراغدین کی عورت اسی یعقوب عیسائی کیساتھ راتوں رات بھاگ گئی اور پھر اسکا کچھ پتہ نہ لگا۔

(ماہنامہ مصباح نومبر ۱۹۵۹ء)

حضرت میر ناصر نواب صاحب دہلویؓ

اُس شخص کے عزّ و شرف کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔ جو حضرت مہدی علیہ السلام کا بھی جائے ادب ہو۔

آپ کا اسم گرامی میر ناصر نواب۔ والد کا نام میر ناصر امیر والدہ کا نام روشن آرا بیگم تھا۔ سن پیدائش ۱۸۴۶ عیسوی تھا۔ ابھی عالم طفولیت میں ہی تھے کہ پہلی جنگ آزادی یا ۱۸۵۷ء کا غدر بپا ہوا۔ اُس وقت شہر دہلی اور اس کے مسلمان مکینوں پر انگریز اور سکھ سپاہیوں کے ہاتھوں جو آفت آئی وہ ناقابل بیان ہے۔

حضرت میر ناصر نواب صاحب کے والد ۱۰ ستمبر ۱۸۵۴ء کو فوت ہو گئے۔ گو دادا صاحب زندہ تھے مگر وہ ۸۰ سالہ پیر تھے۔ جائیداد بھی کوئی نہ تھی۔ گھر میں جمع جتھا مطلق نہ تھا۔ غرضیکہ میر صاحب کی آزمائش یتیمی سے شروع ہوئی۔ غدر کا زمانہ۔ گھر سے بے گھر۔ دردر پھر رہے تھے۔ ایسی حالت میں تعلیم کا کسے ہوش ہوسکتا تھا۔ کچھ تعلیم آپ کے ماموں میر ناصر حسین صاحب نے دلوائی (جو محکمہ نہر میں بمقام مادھوپور نزد پٹھان کوٹ ملازم تھے جہاں سے نہر اپر باری دوآب دریائے راوی سے نکلتی ہے) اس طرح آپ اس قابل ہو گئے کہ محکمہ نہر میں پہلے نقشہ نویس اور بعد میں اوورسیئر بن گئے۔ اس طرح باعزّت روٹی کمانے لگے۔ آپ کی ملازمت کی ابتداء لاہور سے ہوئی یہ ۱۸۶۵ء کا واقعہ ہے۔ اتفاق سے محکمہ والوں نے ہر کارکن کیلئے لازمی قرار دیا کہ وہ یکصد روپیہ کی ضمانت پیش کرے۔ مشہور یہی ہے کہ محکمہ نہر والوں کے ہاں رزق کی کمی نہیں ہوتی کیونکہ اُوپر کی آمدنی سے بہت کچھ مل جاتا ہے۔ مگر حضرت میر صاحب ضمانت پیش نہ کرسکے۔ کسی نے مشورتاً کہا بھی کہ کہیں سے قرض لے کر ضمانت کی رقم دیدیں تو آپ نے فرمایا کہ پھر قرض کہاں سے ادا کروں گا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انگریز افسر کے سامنے کیس پیش ہوا کہ میر صاحب ضمانت پیش نہیں کرسکے تو اس نے اپنے اختیارِ خاص سے آپ کو ضمانت سے مستثنیٰ قرار دیدیا۔ اس اُکلِ حلال کی کمائی سے خداتعالیٰ نے ۱۸۶۵ء میں وہ صاحبزادی عنایت کی جس نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زوجیت میں آنا تھا۔

کچھ عرصہ بعد میر صاحب کا تبادلہ موضع ستھیانی جو قادیان سے ۸ میل جانب شمال ہے ہو گیا۔ اسی سلسلہء ملازمت میں آپ کچھ عرصہ قصبہ کاہنووان اور موضع تتلے (متصل قادیان) میں رہائش پذیر رہے۔ یہ تمام گاؤں ضلع گورداسپور میں واقع ہیں۔

چونکہ حضرت مسیح موعودؑ کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر صاحب سپرنٹنڈنٹ مال تھے وہ ہر ہفتے گورداسپور سے قادیان گھوڑے پر آیا کرتے تھے۔ تتلے میں میر صاحب نہر کھدوا رہے تھے تو ان سے شناسائی ہوگئی۔ بقیہ واقعات حضرت نانی اماں صاحبہ کی زبانی سنیئے:۔

''خاکسار کی نانی اماں نے مجھ سے بیان کیا کہ جب تمہارے نانا جان کی اس نہر کے بنوانے پر ڈیوٹی لگی

جو قادیان سے جانب غرب دواڑھائی میل کے فاصلے پر سے گزرتی ہے تو اُس وقت تمہارے تایا مرزا غلام قادر کے ساتھ اُن کا کچھ تعارف ہو گیا اور اتفاق سے اُن دنوں میں کچھ بیمار ہوئی تو تمہارے تایا نے میر صاحب سے کہا کہ میرے والد بہت ماہر طبیب ہیں آپ اُن سے علاج کرائیں۔ چنانچہ تمہارے نانا مجھے ڈولے میں بٹھا کر قادیان لائے۔ جب میں یہاں آئی تو نیچے کی منزل میں تمہارے تایا مجلس لگائے بیٹھے تھے اور کچھ لوگ آس پاس بیٹھے تھے اور ایک نیچے کی کوٹھڑی میں تمہارے ابّا (حضرت مسیح موعودؑ) ایک کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے قرآن شریف پڑھ رہے تھے اور اُوپر کی منزل میں تمہارے دادا صاحب تھے۔ تمہارے دادا نے میری نبض دیکھی اور نسخہ لکھ دیا اور پھر میر صاحب کے ساتھ اپنے دلی جانے اور وہاں حکیم محمد شریف صاحب سے علم طب سیکھنے کا ذکر کرتے رہے۔

اور اُس کے بعد جب دوسری مرتبہ قادیان آئی تو تمہارے دادا فوت ہو چکے تھے اور ان کی برسی کا دن تھا (۲ جون ۱۸۷۶ء) جو قدیم رسوم کے مطابق منائی جا رہی تھی۔ چنانچہ ہمارے گھر بھی بہت سا کھانا وغیرہ آیا تھا۔ اس دفعہ تمہارے تایا نے میر صاحب سے کہا کہ آپ تتلہ (قادیان کے قریب ایک گاؤں ہے) میں رہتے ہیں جہاں آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی اور وہ گاؤں بھی بدمعاش لوگوں کا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ ہمارے مکان میں آ جائیں۔ میں گورداسپور رہتا ہوں۔ اور غلام احمد (یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام) بھی بہت کم آتا جاتا ہے اس لئے آپ کو پردہ کی تکلیف نہ ہوگی۔ چنانچہ میر صاحب مان گئے اور ہم یہاں آ کر رہنے لگے اُن دنوں میں جب بھی تمہارے تایا گورداسپور سے قادیان آتے تھے تو ہمارے لئے پان لایا کرتے تھے اور میں اُن کے واسطے کوئی اچھا سا کھانا وغیرہ تیار کر کے بھیجا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جو میں نے شامی کباب اُن کے لئے تیار کئے اور بھیجنے لگی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ گورداسپور واپس چلے گئے ہیں۔ جس پر مجھے خیال آیا کہ کباب تو تیار ہی ہیں میں اُن کے چھوٹے بھائی کو بھجوا دیتی ہوں۔ چنانچہ میں نے نائن کے ہاتھ تمہارے ابّا کو کباب بھجوا دیئے اور نائن نے مجھے آ کر بتایا کہ وہ بہت ہی شکر گزار ہوئے تھے اور انہوں نے بڑی خوشی سے کباب کھائے اور اس دن انہوں نے اپنے گھر سے آیا ہوا کھانا نہیں کھایا۔ اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن اُن کو کچھ کھانا بنا کر بھیج دیا کرتی تھی اور بڑی خوشی سے کھانا کھایا کرتے تھے۔ لیکن جب اس بات کی اطلاع تمہاری تائی کو ہوئی تو انہوں نے بہت بُرا منایا کہ میں کیوں اُن کو کھانا بھیجتی ہوں کیونکہ وہ اُس زمانہ میں تمہارے ابا کے سخت مخالف تھیں اور چونکہ گھر کا سارا انتظام اُن کے ہاتھ میں تھا وہ ہر بات میں انہیں تکلیف پہنچاتی تھیں مگر تمہارے ابا صبر کے ساتھ ہر بات برداشت کرتے تھے۔ اُن دنوں میں گو میر صاحب کا زیادہ تعلق تمہارے تایا سے تھا مگر وہ کبھی کبھی گھر میں آ کر کہا کرتے تھے کہ مرزا غلام قادر کا چھوٹا بھائی بہت نیک اور متقی آدمی ہے۔

اس کے بعد ہم رخصت پر دہلی چلے گئے اور چونکہ تمہاری اماں اُس وقت جوان ہو چکی تھیں ہمیں ان کی شادی کا فکر پیدا ہوا اور میر صاحب نے ایک خط تمہارے ابا کے نام لکھا کہ مجھے اپنی لڑکی کے رشتہ کی بہت فکر ہے۔ آپ دُعا کریں کہ خدا کسی نیک آدمی کے ساتھ تعلق کی صورت پیدا کر دے۔ تمہارے ابا نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ پسند

فرمائیں تو میں خود شادی کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو معلوم ہے کہ گو میری پہلی بیوی موجود ہے اور بچے بھی ہیں مگر آجکل میں عملاً مجرد ہی ہوں وغیرہ ذالک۔

میر صاحب نے اس ڈر کی وجہ سے کہ میں بُرا مانوں گی مجھ سے اس خط کا ذکر نہ کیا اور اس عرصہ میں اور بھی کئی جگہ سے تمہاری اماں کے لئے پیغام آئے لیکن میری تسلی کسی جگہ نہ ہوئی حالانکہ پیغام دینے والوں میں سے بعض اچھے اچھے متمول آدمی بھی تھے اور بہت اصرار کے ساتھ درخواست کرتے تھے۔ مولوی محمد حسین بٹالوی کے ساتھ تمہارے نانا کے بہت تعلقات تھے۔ انہوں نے کئی دفعہ تمہارے ابا کے لئے سفارشی خط لکھے اور بہت زور دیا کہ مرزا صاحب بڑے نیک اور شریف اور خاندانی آدمی ہیں مگر میری یہاں تسلی نہ ہوئی کیونکہ ایک تو عمر کا بہت فرق تھا اور دوسرے ان دنوں دہلی والوں میں پنجابیوں کے خلاف بہت تعصب تھا۔

بالآخر میر صاحب نے ایک دن لدھیانہ کے ایک باشندہ کے متعلق کہا کہ اُس کی طرف سے بہت اصرار کی درخواست ہے اور ہے بھی وہ اچھا آدمی اُسے رشتہ دیدو۔ مجھے شرح صدر نہ ہوا اور میں نے انکار کر دیا۔ جس پر میر صاحب نے کچھ ناراض ہو کر کہا کہ لڑکی اٹھارہ سال کی ہو گئی ہے کیا ساری عمر اسے یُونہی بٹھا چھوڑ و گی؟ میں نے جواب دیا کہ ان لوگوں سے تو پھر مرزا غلام احمد ہزار درجے اچھا ہے۔ میر صاحب نے جھٹ ایک خط نکال کر میرے سامنے رکھدیا کہ لو پھر مرزا غلام احمد کا بھی خط آیا ہے۔ جو کچھ بھی ہو ہمیں جلد فیصلہ کرنا چاہئے۔ میں نے کہا اچھا پھر غلام احمد کو لکھدو۔ چنانچہ تمہارے نانا جان نے اُسی وقت قلم دوات لے کر خط لکھ دیا اور اس کے آٹھویں دن بعد تمہارے ابا دہلی پہنچ گئے اُن کے ساتھ دو نوکر تھے اور بعض ہندو اور مسلمان ساتھی تھے۔ جب ہماری برادری کے لوگوں کو معلوم ہوا تو سخت ناراض ہوئے کہ ایک بوڑھے شخص کو اور پھر پنجابی کو رشتہ دے دیا ہے اور کئی لوگ اُن میں سے اسی ناراضگی میں نکاح میں شامل ہی نہیں ہوئے مگر ہم نے فیصلہ کر لیا ہوا تھا کہ نکاح پڑھا کر رخصتانہ کر دیا جائے۔

تمہارے ابا اپنے ساتھ کوئی زیور یا کپڑا وغیرہ نہیں لے کر گئے تھے بلکہ صرف اڑھائی سو روپیہ نقد لے گئے تھے۔ اس پر بھی برادری نے بہت طعن دیئے کہ اچھا نکاح ہوا ہے کہ کوئی زیور کپڑا ساتھ نہیں آیا۔ جس کا جواب ہماری طرف سے یہ دیا گیا کہ مرزا صاحب کے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ زیادہ تعلقات نہیں ہیں اور گھر کی عورتیں ان کی مخالف ہیں اور پھر وہ جلدی میں آئے ہیں اس حالت میں وہ زیور اور کپڑے کہاں سے بنوالاتے؟ الغرض برادری کی طرف سے اس قسم کے طعن تشنیع بہت ہوئے اور مزید برآں یہ اتفاق ہوا کہ جب تمہاری اماں قادیان آئیں تو یہاں سے ان کے خط گئے کہ میں سخت گھبرائی ہوئی ہوں اور شاید اسی غم اور گھبراہٹ سے مر جاؤں گی۔ چنانچہ ان خطوط کی وجہ سے ہمارے خاندان کے لوگوں کو اور بھی اعتراض کا موقعہ مل گیا اور بعض نے کہا کہ اگر آدمی نیک تھا تو اُس کی نیکی کی وجہ سے لڑکی کی عمر کیوں خراب کی؟ اس پر ہم لوگ بھی کچھ گھبرا گئے اور رخصتانہ کے ایک ماہ بعد میر صاحب قادیان جا کر تمہاری اماں کو لے گئے۔ جب وہ دہلی پہنچی تو میں نے اس عورت سے پوچھا جس کو میں نے دہلی سے ساتھ

بھیجا تھا کہ لڑکی کیسی رہی ؟ اس عورت نے تمہارے ابا کی بہت تعریف کی اور کہا کہ لڑکی یونہی شروع شروع میں اجنبیت کی وجہ سے گھبرا گئی ہوگئی ورنہ مرزا صاحب نے تو ان کو بہت ہی اچھی طرح رکھا ہے۔ اور وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اور تمہاری اماں نے بھی کہا کہ مجھے انھوں نے بہت آرام کے ساتھ رکھا مگر میں یونہی گھبرا گئی تھی۔ اس کے تھوڑے عرصے کے بعد تمہاری اماں پھر قادیان گئی اور پھر بہت عرصہ کے بعد واپس آئیں۔''

(روایات حضرت مرزا بشیر احمد صاحب سیرت المہدی حصہ دوم ص ۳۱۰)

جن دنوں حضرت میر صاحب قصبہ کاہنووان میں مقیم تھے اُن دنوں کا ایک واقعہ اور سُنیں:۔

''بیان کیا مجھ سے میری نانی اماں صاحبہ نے کہ ایک دفعہ جب تمہارے نانا کی بدلی کاہنووان میں ہوئی تو تمہارے نانا مجھے ڈولی میں بٹھا کر قادیان تمہارے دادا کے پاس علاج کے لئے لائے تھے اور اُسی دن میں واپس چلی گئی تھی۔ تمہارے دادا نے میری نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیا تھا اور تمہارے نانا کو یہاں اور ٹھہرنے کے لئے کہا تھا مگر نہیں ٹھہر سکے۔ کیونکہ پیچھے تمہاری اماں کو اکیلا چھوڑ کر آئے تھے۔ نیز نانی اماں نے بیان کیا کہ جس وقت میں گھر آئی میں نے حضرت صاحب کو پیٹھ کی طرف سے دیکھا تھا کہ ایک کمرہ میں الگ بیٹھے رحل پر قرآن شریف رکھ کر پڑھ رہے تھے۔ میں نے گھر والیوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ مرزا صاحب کا چھوٹا لڑکا ہے اور بالکل ولی آدمی ہے۔ قرآن ہی پڑھتا رہتا ہے۔

نیز والدہ صاحبہ نے بیان کیا کہ مجھے اپنی اماں اور ابا کا اکیلے چھوڑ کر قادیان آنے کے متعلق صرف اتنا یاد ہے کہ میں شام کے قریب بہت روئی چلائی تھی کہ اتنے میں ابا گھوڑا بھگاتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔ اور مجھے کہا کہ ہم آگئے ہیں۔

(سیرۃ المہدی حصہ اوّل ص ۲۳۸)

یہاں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرت اماں جانؓ اپنے بچپن میں اپنے والدین کے ہمراہ سٹھیالی۔ کاہنووان اور تتلے میں مقیم رہے۔ اور قادیان میں ۶۔ ۷ ماہ ٹھہرنے کا موقع ملا۔ اس طرح خدا تعالیٰ نے وہ گھر پہلے ہی دکھلا دیا جہاں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنھا نے دلہن بن کر آنا تھا۔ اس وقت عمر ۱۰ یا ۱۱ سال کی تھی۔

(دیکھئے سیرۃ المہدی حصہ اول ص ۵۶)

حضرت میر ناصر نواب صاحب سے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا جو یہ تعلق ہوا اور نیک اولاد ہوئی۔ اس کے متعلق ایک اور رؤیا حضرت اقدسؑ کی بڑی واضح ہے۔ وھوھذا:۔

میر ناصر نواب صاحب اپنے ہاتھ پر ایک درخت رکھ کر لائے ہیں جو پھل دار ہے اور جب مجھ کو دیا گیا تو وہ ایک بڑا درخت بن گیا جو بیدانہ توت کے مشابہ تھا اور نہایت سرسبز تھا۔ اور پھلوں اور پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور پھل اُس کے نہایت شیریں تھے اور عجیب تر یہ کہ پھول بھی شیریں تھے۔ مگر معمولی درختوں میں سے نہیں تھا۔ ایک ایسا

درخت تھا کہ کبھی دنیا میں نہیں دیکھا گیا۔ میں اُس درخت کے پھل اور پھول کھارہا ہوں کہ آنکھ کھل گئی۔''

(تذکرہ طبع ثانی ص ۵۴۴)

اِس خواب کی تعبیر ظاہر ہے تشریح کی ضرورت نہیں۔ اسی سلسلہ میں حضرت اقدسؑ کو ۱۸۸۱ء میں الہام ہوا:۔

(۱) **اُشکر نعمتی رَئیتَ خَدیجتی ۔**

(۲) **الحمدللّٰہ الذی جعل لکم الصہر والنسبَ ۔**

(۳) میں نے ارادہ کیا ہے کہ تمہاری ایک اور شادی کروں۔ یہ سب سامان میں خود ہی کروں گا اور تمہیں کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ ے

ہر چہ باید نو عروسے را ہمہ ساماں کنم
وآنچہ مطلوبِ شما باشد عطائے آن کنم

''اور الہامات میں یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ وہ قوم کے شریف اور عالی خاندان ہوں گے۔ چنانچہ ایک الہام میں تھا کہ خُدا نے تمہیں اچھے خاندان میں پیدا کیا اور پھر اچھے خاندان سے دامادی کا تعلق بخشا۔ سو قبل از ظہور یہ تمام الہام لالہ شرمپت کو سنا دیا گیا۔ پھر بخوبی اُسے معلوم ہے کہ بغیر ظاہری تلاش اور محنت کے محض خدا تعالیٰ کی طرف سے تقریب نکل آئی یعنی نہایت نجیب اور شریف اور عالی نسب بزرگوار خاندانِ سادات سے یہ تعلقِ قرابت اس عاجز کو پیدا ہوا اور اس نکاح کے تمام ضروری مصارف تیاری مکان وغیرہ تک ایسی آسانی سے خدا تعالیٰ نے بہم پہنچائے کہ ایک ذرہ بھی فکر نہ کرنا پڑا اور وہ اب تک اسی اپنے وعدے کو پُورا کئے جاتا ہے۔''

(شحنۂ حق ص ۵۷)

پھر حضرت اقدس تریاق القلوب ص ۶۴ پر فرماتے ہیں:۔

''اس پیشگوئی کو دوسرے الہامات میں اور بھی تصریح سے بیان کیا گیا ہے یہاں تک کہ اُس شہر کا نام بھی لیا گیا تھا جو دہلی ہے اور یہ پیشگوئی بہت سے لوگوں کو سنائی گئی تھی .... اور جیسا کہ لکھا گیا تھا ایسا ہی ظہور میں آیا۔ کیونکہ بغیر سابق تعلقاتِ قرابت اور رشتہ کے دہلی میں ایک شریف اور مشہور خاندانِ سادات میں میری شادی ہوگئی .... سو چونکہ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا کہ میری نسل میں ایک بڑی بنیاد حمائتِ اسلام کی ڈالے گا اور اس میں سے وہ شخص پیدا کرے گا جو آسمانی روح اپنے اندر رکھتا ہوگا۔ اس لئے اُس نے پسند کیا کہ اس خاندان کی لڑکی میرے نکاح میں لادے اور اس سے وہ اولاد پیدا کرے جو اُن نوروں کو جن کی میرے ہاتھ سے تخم ریزی ہوئی ہے دنیا میں زیادہ سے زیادہ پھیلادے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح سادات کی دادی کا نام شہر بانو تھا اُسی طرح میری یہ بیوی جو آئندہ خاندان کی ماں ہوگی اُس کا نام نصرت جہاں بیگم ہے۔ یہ تفاؤل کے طور پر اس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ خُدا نے تمام جہان کی مدد کے لئے میرے آئندہ خاندان کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی عادت

ہے کہ کبھی ناموں میں بھی اس کی پیشگوئی مخفی ہوتی ہے۔''

اس سے قبل ۱۸۶۸ء میں حضرت مسیح موعودؑ کی والدہ محترمہ چراغ بی بی صاحبہ فوت ہو چکی تھیں اور اب گھر کا تمام نظم و نسق حضور علیہ السلام کی بھاوجہ حرمت بی بی صاحبہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ ہر جگہ ان کا حکم چلتا تھا۔ یہ تھیں مرزا امام دین کی ہمشیرہ جو سخت دہریہ طبع اور بے دین آدمی تھا۔ لہٰذا حضور کی بھاوجہ کو حضور سے خُدا واسطے کا بَیر تھا۔ دوسری طرف حضرت اقدسؑ کی پہلی بیوی جن کا نام بھی حرمت بی بی تھا (یعنی والدہ حضرت مرزا سلطان احمد اور مرزا فضل احمد) بڑی سادہ طبع عورت تھیں مگر جٹھانی حرمت بی بی نے دیورانی حرمت بی بی کی فرضی خیر خواہ بن کر اُن کے کان کچھ اس طرح سے بھرے کہ میاں بیوی کو آپس میں اچھی طرح بیزار کر کے دم لیا۔ چونکہ حضور علیہ السلام کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر صاحب لاولد فوت ہوئے تھے اور تمام جائیداد حضرت کے نام منتقل ہو چکی تھی لہٰذا بھابھی صاحبہ نے یہ سکیم بنائی کہ مرزا سلطان احمد صاحب کو اپنا متبنیٰ بنالیا۔ حالانکہ اسلام میں متبنیٰ ہوتا ہی نہیں۔ بھابھی صاحبہ نے حضرت سے درخواست کر کے نصف جائیداد مرزا سلطان احمد کے نام کرالی۔ حضورؑ ایسے دنیاداری کے معاملات سے پہلے ہی بچ کر چلتے تھے آپ نے اپنی بھابھی کی بات مان لی۔

آگے حضرت میاں بشیر احمد صاحبؓ کی ایک روائت سنئیے:۔

''والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ میری شادی کے بعد حضرت صاحب نے انہیں کہلا بھیجا کہ آج تک تو جس طرح ہوتا رہا ہوتا رہا۔ اب میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اس کے بعد دونو بیویوں میں برابری نہیں رکھ سکوں گا تو میں گنہگار رہوں گا۔ اس لئے دو باتیں ہیں یا تو تم مجھ سے طلاق لے لو یا مجھے اپنے حقوق چھوڑ دو۔ میں تم کو خرچ دیئے جاؤں گا۔ اُنہوں نے کہلا بھیجا کہ اب میں بڑھاپے میں کیا طلاق لوں گی بس مجھے خرچ ملتا رہے۔ میں اپنے باقی حقوق چھوڑتی ہوں۔ والدہ صاحبہ فرماتی ہیں چنانچہ پھر ایسا ہی رہا۔''

(سیرۃ المہدی حصہ اول ص ۳۳-۳۴)

الغرض نومبر ۱۸۸۳ء میں سیّد نذیر حسین صاحب امام جامع مسجد دہلی نے حضرت کا نکاح مبلغ ۱۱۰۰ روپے کے عوض سیّدہ نصرت جہاں بیگم صاحبہ سے پڑھا۔

اس نکاح سے حضرت میر ناصر نواب کے بزرگوں کی وہ پیشگوئی بھی پوری ہوگئی جو اس بارہ میں تھی نیز یہ حدیث بھی پوری ہوگئی کہ

یتزَوَّجُ وَیُولَدُلَهٗ

عہد مغلیہ میں سپہ سالار افواج نواب روشن الدولہ تھے ان کے بیٹے خواجہ محمد ناصر تھے جو محاورہ کے مطابق مُنہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ہر طرف نوابی ٹھاٹھ تھا۔ مگر آپ نے بڑے ہو کر مسند فقر سنبھالی۔ شاہ جہان آباد سے جانب شمال ایک ویرانے میں معمولی سے مکانات بنا کر رہنے لگے۔ دن رات عبادت میں مصروف رہتے

تھے اور یہی دُعا کرتے تھے کہ خدایا اگر میں فی الواقع بنو فاطمہ میں سے ہوں تو مجھے صرف اتنا دے کہ بمشکل دو وقت کھا سکوں۔ روزے بکثرت رکھنے لگے۔ اپنی جان پر بے حد سختی کرنے لگے۔ اسی حالت استغراق میں لمبا عرصہ گزر گیا۔ آخر ایک دن حجرہ میں یکا یک نُور کی روشنی ہوئی اور معلوم ہوا کہ حضرت امام حسنؓ تشریف لائے ہیں اور اس قدر مشقت اٹھانے سے منع کیا کہ تیری تکلیف سے ہمارے جدِ امجد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف ہوتی ہے اس لئے ایسا ہرگز نہ کرو حضرت امام عالی مقام نے ان کو اپنے سینے سے لگا لیا اور فرمایا کہ میں سب باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے مطابق کہہ رہا ہوں۔ جا تجھے دولتِ ولایت سے مالا مال کر دیا۔

حضرت امامؑ نے مزید فرمایا۔ ''ایک خاص نعمت تھی جو خانوادہ نبوت نے تیرے واسطے محفوظ رکھی تھی اُس کی ابتداء تجھ سے ہوئی اور انجام اُس کا مہدی علیہ السلام پر ہوگا۔''

حضرت خواجہ محمد ناصر صاحب نے ایک نیا سلسلہ جاری کیا اور نام اُسکا سلسلہء محمدیہ رکھا۔ پہلا مرید اور خلیفہ اپنے بیٹے حضرت خواجہ میر دردؔ کو بنایا جو اُردو کے صوفی شعراء میں بہت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کے بعد مسندِ خلافت خواجہ ناصر امیر صاحب کو ملی کیونکہ ان کی اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ ان کی بیٹی کی اولاد میں سے خواجہ ناصر امیر صاحب بھی تھے جو میر ناصر نواب صاحب کے والد محترم تھے۔ اور جن کی بیٹی سیّدہ نصرت جہاں بیگم صاحبہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زوجیت میں آئی۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے ''مے خانہء دردؔ'' صفحات ۴۶۔۱۲۸ اور ۱۴۵ تا ۱۴۸) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اسی اہلیہ سے وہ مبارک اولاد پیدا ہوئی جس کے متعلق حسن رہتاسی صاحب مرحوم کے یہ دو شعر یاد رکھیں ؎

جناب میر ناصر کے نواسے
خدائے پاک جن پر مہرباں ہو
رہے سر پر ہمارے اُن کا سایہ
اور اُن پر سایہء نصرت جہاں ہو

اب ہم لوٹ کر حضرت میر صاحب کی طرف آتے ہیں۔

حضرت سیّدہ نصرت جہاں بیگم صاحبہ کی ولادت ۱۸۶۵ء کی ہے اور اُن کے بعد میر صاحب کے ہاں پانچ بچے پیدا ہوئے مگر صغرسنی میں ہی فوت ہو گئے۔ آخر ۱۸۸۱ء میں حضرت میر محمد اسمٰعیل صاحبؓ پیدا ہوئے جو بڑے ہو کر شہرۂ آفاق ڈاکٹر بنے اور ہماری جماعت میں تو وہ قطب الاقطاب شمار ہوتے ہیں۔

حضرت میر صاحب بسلسلہء ملازمت لدھیانہ میں مقیم تھے کہ وہاں ۱۸۹۰ء میں دوسرا لڑکا خدا نے عطا فرمایا جن کا اسم گرامی میر محمد اسحاقؓ تھا۔

اُنہی دنوں حضرت میر صاحب کے پرانے دوست سیّد نذیر حسین صاحب دہلوی ملاقات کے لئے لدھیانہ

تشریف لائے اوران دونوں بچوں کو دیکھ کر حسب ذیل شعر پڑھا ۔

برائے کردن تنبیہ فُسّاق
دوبارہ آمد اسمٰعیل و اسحاق

میر صاحب نے ملازمت کے سلسلہ میں حسب ذیل مقامات پر قیام فرمایا:۔

مادھو پور نزد پٹھان کوٹ ۔ لاہور ۔ ستھیالی ۔ کاہنووان ۔ تتلے نزد قادیان ۔ ضلع لاہور انبالہ کینٹ ۔ پٹیالہ۔ لدھیانہ۔ فیروز پور شہر اور ہوتی مردان۔

یہاں سے آخرکار ۱۸۹۴ء میں آپ نے پہلے فرلو لی اور پھر پنشن پائی۔

مردان سے سیدھے قادیان آگئے۔آپ نے ۲۹ برس ملازمت کی اور ۳۱ برس پنشن پائی۔

ابتداء میں حضرت میر صاحب چونکہ مولوی محمد حسین بٹالوی کے زیر اثر تھے لہٰذا باوجود حضرت اقدس سے اس قدر قریبی رشتہ کے حضورؑ کی بیعت نہ کی۔آخر کار حضرت اقدس نے دوسرے جلسہ سالانہ (۱۸۹۲ء) کے موقع پر حضرت میر صاحبؓ کو قادیان تشریف لانے کی دعوت دی۔آپ آئے اور جلسہ سالانہ میں شریک ہوئے یہاں جو قال اللہ اور قال الرسول کی مجالس دیکھیں اور رجوع خلق دیکھا تو اپنے سابقہ رویئے سے تائب ہو کر اپنے داماد کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلسلہء عالیہ احمدیہ میں داخل ہو گئے ۔

بیعت پیر مغاں شیخ زماں نے کر لی
ساقیا میکدے میں آج چراغاں ہو جائے

حضرت اقدس کو بہت خوشی ہوئی۔ساتھ ہی میر صاحب نے ایک اشتہار شائع کیا کہ پہلے میں غلطی پر تھا اب توبہ کرتا ہوں میں منافق نہیں تھا کہ رشتہ داری کی وجہ سے بیعت کر لیتا وغیرہ۔

(ماہنامہ مصباح ۱۹۸۰ء)

مرزا گُل محمدؐ برلاس

حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مسیح موعود مہدیٔ معہود علیہ السلام کے ایک چچا مرزا غلام محی الدین صاحب کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں جنکا ذکر ہمارے سلسلہ کے لٹریچر میں اکثر آتا ہے۔ انکا شجرہ نسب حسب ذیل ہے:۔

مرزا غلام محی الدین صاحب

مرزا امام الدین　　مرزا نظام الدین　　مرزا کمال الدین　　حرمت بی بی　　فضل النساء　　عمر بی بی

لاولد فوت ہوئے　　(لاولد فوت ہوئے) زوجہ مرزا غلام قادر صاحب　　اہلیہ مرزا اکبر　　زوجہ مرزا

صرف ایک لڑکی　　بھاوجہ حضرت اقدسؑ　　بیگ　　احمد بیگ

خورشید بیگم تھی　　تائی خلیفہ ثانیؓ مدفون　　ہوشیار پوری (والدہ

جو مرزا سلطان احمد صاحب　　بہشتی مقبرہ قادیان　　محمدی بیگم صاحبہ)

کی دوسری بیوی تھی۔ احمدی　　مدفون بہشتی

ہو کر قادیان میں مدفون ہیں　　بہشتی مقبرہ قادیان

مرزا اسلم بیگ　　مرزا احسن بیگ

مرزا دل محمد　　مرزا گل محمد صاحب　　حمیدہ بیگم　　خسر اول حضرت مرزا عزیز صاحب

(جوانی میں فوت ہو گئے)　　ان کی اولاد احمدی ہے اور انڈیا میں رہتی ہے)

مرزا اکمل بیگ مدفون

ربوہ ۶۰۔۱۰۔۸

مرزا انیس احمد　　مرزا نفیس احمد　　مرزا لطیف احمد　　شاہدہ بیگم　　مرزا رفیق احمد

بچپن میں فوت ہوئے　پیدائش ۱۹۳۶ء　پیدائش ۳۹۔۵۔۱۶　(اہلیہ خلیفہ منیر الدین احمد شہید　(پیدائش جنوری ۱۹۴۵ء)(ستارۂ جرأت)

۱۸۹۵ء کے ارد گرد یہ تمام خاندان بڑا سر سبز تھا۔ مگر حضرت اقدس کے یہ قریبی رشتہ دار سخت بے دین اور دہریہ طبع لوگ تھے۔ حضورؑ سے دشمنی اور عناد میں الکفر ملّۃ واحدۃ کے مصداق تھے۔ حضور بہت چاہتے تھے کہ ان عزیزوں کی اصلاح ہو جائے مگر وہ سب حضورؑ کا مذاق اُڑاتے تھے اور مخالفت میں حد سے زیادہ بڑھ گئے تھے۔ حضور کی نیکی اور پارسائی کو یہ لوگ مکاری خیال کرتے تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں مرزا امام الدین صاحب کی کتاب ''گل شگفت''، موجودہ خلافت لائبریری ربوہ اور راقم الحروف کے دو مضامین مندرجہ رسالہ خالد بابت ماہ نومبر

ودسمبر ۱۹۷۵ء)

نیز مذہبی رنگ میں حضورؑ کی ترقی اور شہرت۔ مہمانوں کی اطراف عالم سے آمد کی وجہ سے یہ لوگ حسد کی آگ میں جلنے لگے اور حضورؑ کی پیشگوئیوں پر تمسخر اُڑایا کرتے تھے ۱۸۸۵ء میں مرزا امام الدین نے لاہور جا کر شاتم رسول مقبول ﷺ لیکھر ام کو قادیان آنے کی دعوت دی اور خود چندہ ادا کر کے آریہ سماج کے ممبر بنے۔

حضرت مسیح موعودؑ نے اپنی کتاب ''آئینہ کمالات اسلام'' میں ان لوگوں کے متعلق لکھا ہے کہ:

''ایک رات میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص روتا ہوا آیا۔ میں اس کے رونے سے ڈر گیا اور پوچھا کہ کیا تم کوئی موت کی خبر لائے ہو؟ اُس نے کہا اس سے بھی زیادہ۔ اُس نے کہا میں ان لوگوں کے پاس بیٹھا تھا (یعنی مرزا امام الدین وغیرہ۔ ناقل) جو دین اللہ سے مرتد ہو گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک نے رسول اللہ ﷺ کو نہایت غلیظ گالی دی جو میں نے کسی کافر کے منہ سے بھی نہیں سنی اور میں نے دیکھا کہ قرآن کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھتے ہیں اور ایسے کلمات منہ سے نکالتے ہیں کہ زبان اُن کے نقل کرنے سے قاصر ہے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی وجود نہیں ہے...... پھر انہوں نے ایک اشتہار لکھا جس میں رسول اللہ صلعم کو گالیاں دی تھیں یہ اشتہار اُس نے لکھا تھا جو عمر اور خباثت میں سب سے بڑا تھا۔''

تب حضرت اقدسؑ نے ان لوگوں کے متعلق خداوند تعالیٰ سے دُعا کی اور فیصلہ چاہا تو اللہ تعالیٰ نے حضور کو الہاماً بتلایا کہ:۔

''میں نے ان کی عصیان اور سرکشی دیکھی۔ جلد میں ایسی آفات کا عذاب ان پر وارد کروں گا جو آسمانوں کے نیچے سے انہیں ملے گا اور تُو دیکھے گا کہ میں ان کے ساتھ کیا کرتا ہوں...... میں ان کی عورتوں کو رانڈ کردوں گا اور ان کے بیٹوں کو یتیم بنادوں گا اور ان کے گھروں کو ویران کردوں گا تا کہ جو کچھ اُنہوں نے کمایا ہے اُس کا مزہ چکھیں۔ لیکن میں ایک ہی مرتبہ ان کو ہلاک نہیں کردوں گا بلکہ تھوڑے تھوڑے کر کے ہلاک کروں گا تا کہ وہ رجوع کریں اور توبہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ بے شک میری لعنت نازل ہونے والی ہے ان پر اور ان کے گھروں پر اور ان کے چھوٹوں پر اور ان کے بڑوں پر اور ان کی عورتوں پر اور ان کے مردوں پر اور ان کے مہمانوں پر جو ان کے گھر میں داخل ہوں۔ اور وہ سب کے سب ملعون ہیں سوائے ان کے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اور اُن سے تعلقات منقطع کرلیں اور ان کی مجالس سے دُور ہیں اُن پر رحم کیا جائے گا''

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۶۸۔۵۶۹)

چونکہ حضرت مسیح موعودؑ اصلاحِ خلق کیلئے مامور ہوئے تھے لہٰذا سب سے پہلے قرآنی حکم وَاَنذِرۡ ...رتک

ل مرزا امام الدین نے جو مندر قادیان میں بالمیک کے نام پر بنوایا تھا وہ قادیان کے موجودہ لنگر خانہ اور بہشتی مقبرہ کے پل کے درمیان مرزا محمد اشرف صاحب کے مکان کی جگہ پر تھا۔ روائت عبدالرحیم حجام در رجسٹر روایات صحابہ جلد ا)

الاقربین کے ماتحت اپنے رشتہ داروں کو سمجھایا مگر کسی نے مطلق پرواہ نہ کی۔

الغرض یہ وہ عظیم خاندان تھا جس کے متعلق حضرت مسیح موعودؑ کو الہاماً خبر دی کہ

سُبْحَانَ اللہِ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ. زَادَمَجْدَکَ. یَنْقَطِعُ اٰبَاؤُکَ وَیَبْدَأُمِنْکَ

ترجمہ۔ ''سب پاکیاں خدا کے لئے ہیں جونہایت برکت والا اور عالی ذات ہے اُس نے تیرے مجد کو زیادہ کیا تیرے آباء کا نام اور ذکر منقطع ہو جائے گا۔ یعنی بطور مستقل اُن کا نام نہیں رہے گا اور خدا تجھ سے ابتداء شرف اور مجد کرے گا۔'' (تذکرہ طبع دوم ۶۸)

بعدہٗ مرزا امام الدین اور مرزا نظام الدین نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت حضرت اقدسؑ کے گھر کے سامنے ایک دیوار بنادی جس سے حضور کے گھر میں آنے جانے کا راستہ بند ہو گیا۔ یہ ۷ جنوری ۱۹۰۰ء کا واقعہ ہے۔ آخر کار ۱۲۔ اگست ۱۹۰۱ء کو یہ مقدمہ حضرت صاحب کے حق میں ہوا۔ اور ۲۰ راگست ۱۹۰۱ء کو اُسی بھنگی نے وہ دیوار گرائی جس نے بنائی تھی۔ ادھر خواجہ کمال الدین صاحب نے خرچہ، مقدمہ کیلئے درخواست ازخود ہی دیدی بغیر حضورؑ کے علم کے۔ جب عدالت کا پیادہ وارنٹ لے کر آیا تو مرزا نظام الدین صاحب نے حضرت اقدس کو خط لکھا کہ:۔

''مقدمہ دیوار کے خرچہ وغیرہ کی ڈگری کے اجراء کا نوٹس میرے نام آیا ہے اور میری حالت آپ کو معلوم ہے اگرچہ میں قانونی طور پر اس روپیہ کے ادا کرنے کا پابند ہوں اور آپ کو بھی حق ہے کہ آپ ہر طرح سے وصول کریں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہماری طرف سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی تکلیف آپ کو پہنچتی رہی ہے مگر یہ بھائی صاحب (مراد مرزا امام الدین۔ ناقل) کی وجہ سے ہوتا رہا ہے جس میں مجھے بھی شریک ہونا پڑتا تھا۔ آپ رحم کر کے مجھے معاف کر دیں اور اگر معاف نہ کریں تو بالاقساط وصول فرمائیں۔''

اس پر حضور نے سخت رنج کا اظہار فرمایا کہ کیوں میری اجازت کے بغیر اجراء کر دیا۔ تو خواجہ صاحب نے کہا کہ میعاد کے اندر کارروائی ضروری تھی۔ اس پر حضور نے فرمایا:۔

''آئندہ کبھی اس ڈگری کا اجراء نہ کرایا جائے۔ ہم کو دنیاداروں کی طرح مقدمہ بازی اور تکلیف دہی سے کچھ کام نہیں۔ انہوں نے اگر تکلیف دہی کیلئے یہ کام کیا تو ہمارا یہ کام نہیں ہے خدا تعالیٰ نے مجھے اس غرض کیلئے دُنیا میں نہیں بھیجا۔'' (سیرت حضرت مسیح موعودؑ ص ۱۱۸)

اس واقعہ سے مرزا نظام الدین صاحب بہت نادم ہوئے اور انہوں نے بھی مخالفت ترک کر دی۔

''ایک دفعہ مرزا نظام الدین صاحب سخت بیمار ہو گئے۔ قادیان میں حضرت اقدس کے سوا چونکہ کوئی اور طبیب نہ تھا۔ حضور کو بلوا بھیجا۔ حضور نے مرض کی تشخیص کر کے ایک مُرغا ذبح کرا کے مرزا صاحب کے سر پر بندھوایا اور علاج

بھی کیا جس سے شفاء ہوئی'' (سیرۃ المہدی حصہ سوئم ص ۲۷)

''صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب روایت فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور سیر کے لئے جانب شرق موضع بسراواں کے راستے سے قادیان واپس آ رہے تھے کہ مرزا نظام الدین گھوڑے پر سوار بسراواں کو جا رہے تھے۔ حضور کو دُور سے دیکھ کر گھوڑے پر سے اُتر کر ایک طرف کھڑے ہوگئے اور حضور کے قریب آنے پر جھک کر سلام کیا۔''

(سیرۃ المہدی حصہ اول ص ۴۱)

حضرت اقدسؑ نے اپنے مکان سے ملحق ایک نہایت مختصر سی مسجد ۱۸۸۳ء میں بنوائی تھی جس میں بمشکل ۱۶/۱۵ آدمی کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکتے تھے۔ ہجوم خلائق دیکھ کر حضور کو خیال ہوا کہ مسجد مبارک کو وسیع کیا جائے۔ اس کے لئے حضورؑ نے شیخ یعقوب علی صاحبؓ۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے اور چند ایک اور احباب کو مرزا نظام الدین صاحب کے پاس بھیجا کہ مسجد سے ملحقہ زمین جس پر اس زمانہ میں مرزا نظام الدین صاحب کا خراس ہوتا تھا قیمتاً دے دیں مگر وہ تو بات سنتے ہی ناراض ہو گئے کہ غلام احمد خود کیوں نہیں آیا۔ دوسروں کو بھجوا دیا ہے۔

اس کے بعد کا واقعہ آپ مرزا دین محمد صاحب ولد مرزا نتھا بیگ ساکن لنگروال ضلع گورداسپور سے سنیں۔ مرزا دین محمد صاحب مرزا نظام الدین کے ماموں زاد بھائی تھے اور حضرت اقدس کے مرید تھے:۔

''مرزا نظام الدین سے میں نے سُنا تھا کہ مسجد مبارک جو بالکل چھوٹی سی تھی آپ کا اُسے بڑا کرنے کا ارادہ تھا اور اُس کے متصل جو جگہ تھی جس میں خراس لگا تھا وہ مرزا نظام الدین۔ امام الدین کی تھی۔ آپ نے مولوی محمد علی صاحب شیخ یعقوب علی صاحب اور دیگر لوگوں کے ذریعہ سے اُس کو زمین دینے کیلئے کہا کہ قیمت لیکر دیدیں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حضرت اقدس نے ایک چٹھی لکھ کر مرزا نظام الدین کو پھینکی جو نیچے دیوان خانہ میں بیٹھے تھے کہ مسجد کیلئے جگہ کی ضرورت ہے۔ آدمی بہت آتے ہیں آپ جگہ دیدیں تو مرزا نظام الدین نے اُس کا جواب دیا کہ میں اس لئے انکار کرتا رہا کہ آپ غیر آدمیوں کو میرے پاس بھیجتے رہے ہیں۔ اگر خود کہتے یا مجھے بُلا لیتے تو میرا کوئی انکار نہ تھا۔ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں آپ کو جس جگہ کی ضرورت ہے لے لیں۔ چنانچہ وہ جگہ دیدی گئی۔ حضور نے اُس کا عوضانہ دینے کو کہا جس پر مرزا نظام الدین نے انکار کیا اور جب حضور نے اصرار کیا تو اُس نے کہا کہ میں نقد تو نہیں لے سکتا۔ آپ میرا باغ گروی ہے وہ فک کرا دیں۔ چنانچہ باغ فک کرا دیا گیا۔''

(رجسٹر روایات صحابہ نمبر ا ص ۹۹)

حضرات! ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ کہاں وہ مرزا نظام الدین کے اُن کے نام سے خوف آتا تھا۔ اب وہی مسجد کی توسیع کیلئے زمین پیش کر رہے ہیں۔ آخر کار ۱۹۰۷ء میں حضرت میر ناصر نواب صاحب دہلوی اوورسیر کی زیر نگرانی نیچے کی منزل میں خزانہ صدر انجمن احمدیہ کا دفتر بن گیا اور اُوپر اُس کی چھت پر مسجد مبارک اپنی توسیع شدہ صورت میں بن گئی۔

انہی دنوں مرزا نظام الدین صاحب کا جواں سال لڑکا مرزا دل محمد قضاء الٰہی سے فوت ہو گیا۔ بڑے بھائی مرزا امام الدین جس کے بل بوتے پر ان کو زیادہ ناز تھا وہ بھی فوت ہو گئے۔ مرزا نظام الدین صاحب دل ہی میں شرمندہ تھے۔ آخر حضرت مولانا حکیم نورالدین صاحب خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کے عہد مبارک میں وہ دن آیا کہ مرزا نظام الدین نے حضرت کی ڈیوڑھی پر حاضری دی۔ باقی روایت حضرت حافظ محمد ابراہیم صاحبؓ کی زبانی سُنیئے۔

''حضرت خلیفہ اوّل کے زمانہ میں مرزا نظام الدین صاحب کے خاندان کے بہت سے افراد طاعون میں فوت ہو گئے تو مرزا نظام الدین حضرت خلیفہ اوّلؓ کے مکان پر آئے اور حضور کی چوکھٹ پر سر رکھ کر زار زار رونے لگے۔ جب حضرت مولوی صاحب نے سبب پوچھا تو مرزا صاحب نے روتے ہوئے جواب دیا کہ:۔

''حضرت مولوی صاحب! ہماری مصیبت کا بھی علاج ہے کہ نہیں؟ میں نے تو اب کوئی مخالفت نہیں کی۔''حضرت مولوی صاحب کچھ عرصہ خاموش رہے اور پھر فرمایا۔''مرزا صاحب! خدائی تقدیر کو کس طرح بدل سکتا ہوں؟'' پھر جو افراد بیمار تھے ان کے علاج معالجے کے لئے ہمدردانہ رنگ میں مشورہ دیا۔

خاکسار (مرزا بشیر احمد) عرض کرتا ہے کہ بعض دوسرے لحاظ سے بھی مرزا نظام الدین صاحب کمزور ہو گئے تھے۔ انہوں نے آخری وقت میں مخالفت کی شدت کو ترک کر دیا تھا۔[1] یہ طاعون ۱۹۱۰ء

[1]۔ مرزا نظام الدین صاحب کی سگی ہمشیرہ حرمت بی بی صاحبہ (اہلیہ مرزا غلام قادر صاحب جو حضرت اقدسؑ کے برادر اکبر تھے) نے بھی ۱۶/ مارچ ۱۹۱۶ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے وہ الہام پورا کر دیا جو ۱۹۰۰ء کا ہے۔ یعنی ''تائی آئی'' آپ موصیہ تھی'' ۵/ ۱ حصہ کی اور بہشتی مقبرہ میں قادیان میں مدفون ہیں۔ اس ضمن میں مولانا حسن رہتاسی کی رباعی ملاحظہ ہو:۔

تیرے وعدے کے مطابق تیرے مامور کے پاس
چل کے دنیا کے کناروں سے خدائی آئی
جس کے آنے کی خبر عہد نبوت میں ملی
تائی والے کے زمانے میں ہی ''تائی آئی''

میں پڑی تھی جس میں مرزا نظام الدین صاحب کے بہت سے اقرباء مبتلا ہو کر فوت ہو گئے تھے۔''

(سیرۃ المہدی حصہ سوم ص ۱۴۶)

الغرض خدائی مشیت کے مطابق اشد ترین مخالفوں کا یہ گھرانہ جب خالی ہو گیا تو صرف ایک لڑکا مرزا گل محمد پسر مرزا نظام الدین صاحب باقی رہ گیا۔

یہ لمبی چوڑی تمہید میں نے اس واسطے پیش کی ہے تا قارئین کرام کو تمام پس منظر دکھا دیا جائے۔ مرزا گل محمد صاحب بچپن میں تو دُبلے پتلے مگر غضب کے پھرتیلے ہوتے تھے لیکن جوں جوں جوان ہوتے گئے جوانِ رعنا نکلِ آئے۔ بعد میں جسم بھاری بھر کم ہوتا گیا۔

نہایت خوبصورت ناک نقشہ عمدہ متوازن اعضاء موزوں قد اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ ابتدائی تعلیم سکول میں پائی مگر چونکہ گھر پر نگرانی کرنے والا کوئی نہ تھا جس قدر سکول میں اُستاد سے پڑھ لیا وہی کافی ہوتا۔ اس طرح نویں جماعت تک پہنچے پھر یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا۔ باپ کی جائیداد کافی تھی اس کی آمد سے شاندار طریق سے زندگی بسر ہوتی رہی۔ ویسے حضرت خلیفہ ثانیؓ اور مرزا بشیر احمد صاحب اور مرزا عزیز احمد صاحب نگرانی کرتے تھے مگر جب بالغ ہو کر خود مختار ہوئے تو پھر ان حضرات کا مشورہ ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے کبھی لاہور نہیں دیکھا تھا تو مرزا بشیر احمد صاحب نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب جٹ کی زیر نگرانی کچھ دنوں کے لئے لاہور بھجوا دیا تا سیر کر آئیں۔

آخر سعادت ازلی اس یتیم اور بے آسرا بچہ کو حضرت مسیح الزمانؑ کے دامنِ عافیت میں لے آئی اور مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۱۷ء کو مرزا گل محمد صاحب حضرت خلیفہ ثانیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے حضرت اقدسؑ کی روحانی اولاد میں شامل ہو گئے۔ جسمانی رشتہ تو پہلے ہی تھا۔ کشتی نوح میں فارسی نظم میں حضور فرماتے ہیں۔

کہ آں سعید زِطاعون نجات خواہد یافت

کہ جُست و جُست پنا ہے بچار دیوارم

حضرت خلیفہ ثانی کی دوربین نظر نے مرزا گل محمد صاحب کو اپنے اور قریب لانے کے لئے اپنی سالی عزیزہ بیگم صاحبہ سے ان کا نکاح بھی کرا دیا۔ اور یہ نوجوان خلیفۃ المسیح کا ہم زلف بن گیا۔ جہیز کا سامان بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی لاہور سے تیار کرا کے لائے تھے مگر خدا کی مشیت کے ماتحت اس بی بی سے اولاد نہ ہوئی۔ ۱ مکرم قاضی اکمل صاحب لکھتے ہیں کہ انہوں نے مرزا گل محمد صاحب کو ۱۹۱۸ء میں بعض کتب سبقاً سبقاً پڑھائیں نیز ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب نومسلم کی کتب متعلقہ اسلام بھی پڑھائیں۔ پھر جب شوق بڑھا تو زبانی اسباق بھی دیئے۔ ہر سبق ایک ایک ہفتے کا ہوتا تھا۔ سلسلہ کی بعض کتب کے خلاصے زبانی سمجھائے۔ محمدی بیگم والی پیشگوئی چونکہ اُن کا گھریلو مسئلہ تھا اچھی طرح سے ذہن نشین کرا دیا۔ تاہم جب بھی کوئی مشکل آتی تو اکمل صاحب سے مشورہ کر لیتے۔ جلسہ سالانہ اور مخالفین کے جلسوں پر حفاظت اور پہرہ کے انتظامات ان کے سپرد ہوتے تھے۔

مرزا گل محمد صاحب کی دینی تربیت میں علاوہ اور بزرگان سلسلہ کے چوہدری نصر اللہ خان صاحب (والد چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب بھی کوشاں رہے) وہ اس طرح کہ مرزا گل محمد صاحب کے وسیع دیوان خانے کو نظارت بیت المال نے کرایہ پر لیکر دفتر بنا لیا ہوا تھا۔ چوہدری صاحب موصوف کی عادت تھی کہ سویرے ہی دفتر آ کر تلاوت کرتے۔ مرزا صاحب کا اُوپر سے گزر ہوتا تو شفقت سے بلا کر احوال پوچھتے۔ پھر حکیمانہ طرز پر فرماتے کہ مرزا صاحب ذرا یہ کتاب تو مجھے پڑھ کر سناؤ۔ مقصود یہ ہوتا کہ اس طرح ان کو کتب سلسلہ سے واقفیت ہو جائے گی۔ اور مشکل الفاظ پر عبور ہو جائے گا۔ اس طرح ان کی تعلیم قابل ہاتھوں سے ہوتی رہی۔

۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ نے احمدیہ ٹیریٹوریل فورس قائم کی۔ صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب اُس کے کپتان

تھے اور سردار نذر حسین۔ چوہدری فضل احمد صاحب اور مرزا گل محمد صاحب سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہوئے

(دیکھئے الفضل ۱۶۔ مارچ ۱۹۲۲ء)

میاں محمد اسمٰعیل صاحب قادیانی حال چنیوٹ نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ ہم لوگ انبالہ چھاؤنی میں ٹریننگ کے لئے گئے ہوئے تھے کہ وہاں پر ہادی علی خاں (برادر اکبر مولوی عبدالمالک خان صاحب ناظر اصلاح وارشاد ربوہ) نہانے کے لئے کنویں پر گئے۔ ان کی وہاں پر عیسائیوں کی کمپنی

لے جس طرح مرزا نظام الدین صاحب کی پہلی بیوی فضل النساء سے کوئی اولاد نہ ہوئی اور دوسری بیوی وزیر بیگم سے مرزا دل محمد۔ مرزا گل محمد اور حمیدہ بیگم عطا ہوئے اسی طرح مرزا گل محمد کو بھی خدا نے دوسری بیوی فیروزہ بیگم صاحبہ سے۔ مرزا نفیس احمد۔ مرزا لطیف احمد۔ شاہدہ بیگم اور مرزا رفیق احمد عطا فرمائے۔ جو اس وقت سب صاحب اولاد ہیں۔

کے ایک جوان سے تکرار ہوگئی۔ بات بڑھ گئی اور دونوں کمپنیوں کے نوجوان گتھم گتھا ہو گئے اور لطف یہ کہ کسی کو خبر نہیں کہ اصل نزاع کیا ہے۔ مرزا گل محمد صاحب کو خبر ہوئی تو بطور ایڈ جوٹنٹ وہاں گئے۔ جب اچھی طرح تحقیق کر لی کہ قصور عیسائیوں کا ہے تو حکم دیا کہ پکڑلوان کو اور خوب مارا۔ اتنے میں میجر نکولس کمانڈنگ افسر آیا اور بمشکل لڑائی بند ہوئی۔ بعد میں کورٹ مارشل ہوا تو دس عیسائی فوجیوں کو ۱۴۔۱۴ دن کے لئے کوارٹر گارڈ میں بند کیا گیا۔ مرزا صاحب نے اس وقت اپنی مغلئی جوانمردی دکھادی۔

ہر شخص کے ساتھ وہ نہایت منکسر المزاجی سے پیش آتے۔ اُس کی بات پوری توجہ سے سنتے اور ہمدردی دکھاتے اُن کے منہ سے نہ نکل ہی نہ سکتا تھا۔ قادیان کا ایک کشمیری آجکل ربوہ میں ہے اُس نے مجھے سنایا کہ ایک دن وہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مکان بنانے کے لئے کوئی جگہ عنایت فرمائیں۔ کہنے لگے میری فلاں جگہ سفید زمین پڑی ہے اس میں سے ۱۰ مرلہ پر مکان بنالو۔ اُس نے دس مرلہ سے کافی زیادہ جگہ احاطہ کر لی۔ اتفاق سے ایک دن ادھر سے گزر ہوا تو اسے بلایا اور کہا تم نے زیادتی کی ہے۔ وہ شرمندہ ہوا۔ مگر کہنے لگا کہ ہم آپ کی رعایا ہیں پھر کیا ہوا۔ اس پر ہنس پڑے اور کہنے لگے اچھا بھائی تمہاری مرضی۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ تحصیلدار بٹالہ اُس کا ایک انتقال منظور نہیں کرتا۔ کہنے لگے فلاں دن میں بٹالہ جارہا ہوں میرے ہمراہ میری موٹر میں چلنا۔ تحصیل کے اندر جا کر تحصیلدار کی میز پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ وہ حیران کہ میز کے اوپر کیوں بیٹھے کہنے لگے پہلے میرے اس دوست کا انتقال منظور کر کے اُس کی مصدقہ نقل اُسے دیدیں پھر اُتروں گا۔ جب نقل اُسے مل گئی تو ہاتھ جوڑ کر اُسے کہنے لگے کہ لو بھائی اب خوش ہو؟ اُس نے شکریہ ادا کیا اور چلنے لگا تو ایک روپیہ کرایہ کیلئے بھی گرہ سے دیا۔

میاں محمد رمضان دفتر پرائیویٹ سکرٹری کے موٹر ڈرائیور تھے۔ ایک دن اُن کو یکا یک فارغ کر دیا گیا۔ وہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ شاید اپنی موٹر کیلئے رکھ لیں کہنے لگے اب تو میں خود موٹر چلانے میں ماہر

ہو گیا ہوں ویسے تم میرے دیوان خانہ میں رہا کرو کھانا اندر سے آ جایا کرے گا۔ بستر مل جائے گا۔ کپڑوں کی اگر ضرورت ہے تو بنوا دیتا ہوں۔ مرزا صاحب میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے عزیزوں کے متکفل تھے۔ کئی غریب خاندان ان کے دستر خوان سے فیض پاتے تھے۔

ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب جب ۱۹۲۶ء میں انتقال فرما گئے تو ان کا سب سے چھوٹا بیٹا خلیفہ منیر الدین احمد بہت کم عمر تھا۔ اُسے تعلیم دلوائی اور جب وہ بڑا ہو گیا تو حضرت خلیفہ ثانی نے اُسے پاکستان ایئر فورس میں بھرتی کرا دیا۔ پھر مرزا گل محمد صاحب کی صاحبزادی شاہدہ بیگم صاحبہ سے شادی کرا دی۔

عزیز منیر الدین نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے امرتسر کے ریڈار پر حملہ کر کے اُسے بیکار کر دیا مگر خود وہیں شہید ہو گئے۔

ایک دفعہ مرزا صاحب اپنے دوستوں کے ہمراہ اپنی جاگیر راج پورہ پر شکار کیلئے جا رہے تھے اُدھر سے حسن رہتاسی صاحب آ گئے۔ وہ فی البدیہہ شاعر تھے آتے ہی شعر سُنا دیا۔

جا رہے ہیں کار میں بہر شکار
گل ہے ان میں ایک۔ باقی سب ہیں خار

مرزا صاحب سُن کر شگفتہ ہو گئے اور ۵/ روپے انعام دیا۔

مرزا گل محمد صاحب ہاکی کے بہترین کھلاڑی تھے۔ جوانی میں ٹینس بھی خوب کھیلا کرتے تھے اکثر میچ کے بعد تمام کھلاڑیوں کی تواضع بھی کیا کرتے تھے اور خوب کھلایا پلایا کرتے تھے۔

مرزا صاحب قادیان میونسپل کمیٹی کے وائس چیئرمین بھی تھے اور تمام ممبروں میں بڑے ہر دل عزیز تھے۔ کمیٹی کے کاموں میں خوب سُوجھ بُوجھ سے کام لیتے اور لمبی دفتری کارروائی سے گھبراتے تھے۔ زبانی فیصلہ کر کے عمل درآمد کرا دیتے تھے۔

احمدیہ نیشنل کور کے سالار تھے [1] جب جلسہ مصلح موعودؓ دہلی کے موقعہ پر شریروں نے جلسہ گاہ پر حملہ کر دیا تو مرزا صاحب کو بھی زخم آئے۔ قادیان آ کر مرہم پٹی کرا رہے تھے۔ قاضی اکمل صاحب اُوپر سے گزرے تو پوچھا مرزا یہ کیا؟ کہنے لگے یہ سب دہلی میں ہوا۔ میں نے محض بہ نیت ثواب و کفارہ گناہ خاموشی سے مار کھالی اور یہ دو تین زخم آئے۔ ورنہ میں اور میرے ساتھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔

اسی موقع پر جب حضرت خلیفۃ المسیح کی حفاظت کیلئے پہرہ دار جمع ہوئے تو ان میں مختصر سی تقریر کی اور کہا کہ میں تو ایک ناچیز و گنہ گار ہستی ہوں مگر وہ نہایت پاک وجود ہے۔ جس کیلئے ہماری جان تک بھی قربان ہو جائے تو سمجھیں گے کہ فلاح دارین پائی اور یہ کہتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے۔ (بیان اکمل صاحب۔ الفضل ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء ص ۶)

---

[1] تاریخ احمدیت جلد ہفتم ص ۵۳۹

مرزا گل محمد صاحب کی دوسری شادی محترمہ فیروزہ بیگم صاحبہ بنت مرزا اکرم بیگ صاحب آف پٹی سے ہوئی برات پٹی گئی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے نکاح پڑھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے قربان جایئے اس بی بی سے اللہ تعالیٰ نے اولاد عطا فرمائی۔ جب پہلا بیٹا پیدا ہوا تو بڑی خوشی منائی۔ میں نے خود ان کو کہتے ہوئے سُنا کہ ہمارے خاندان پر تو Ban لگا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میری عاجزی قبول فرمالی ہے۔ اور Ban توڑ دیا ہے۔

پھر ایک دن جوش سے کہنے لگے کہ "مجھے نہیں پتہ کہ مولوی شیر علی صاحبؓ۔ مولوی سرور شاہ صاحبؓ۔ شیخ یعقوب علیؓ صاحب سچے مرید ہیں کہ نہیں۔ مگر میں ضرور سچا مرید ہوں۔ گو میرے اندر بے شمار کمزوریاں ہیں مگر خدا تعالیٰ نے مجھے بچے عطا فرمائے ہیں تو تصدیق ہوگئی کہ اب Ban ہٹ گیا ہے۔"

انہی ایام میں ایک دن حسن رہتاسی صاحب نے سامنے آ کر یہ شعر پڑھا ؎

اپنی دُعا حسن ہے نہ تاحشر ہو کبھی
مرزا نظام دین کے گھر کا چراغ گُل

سُن کر بڑے مسرور ہوئے اور حسن صاحب کو چائے پلائی اور انعام دے کر رخصت کیا۔

وفات سے دو سال قبل مرزا صاحب کو تحریک کی گئی کہ مسجد مبارک قادیان کی دوسری توسیع کے لئے اگر وہ اپنے دیوان خانہ کا گیٹ اور چند دکانیں دیدیں تو بہت بہتر ہو۔ فوراً رضامند ہو گئے۔

جب بڑا گیٹ مسمار کرنے لگے تو طبیعت غم ناک ہوگئی اور بڑی حسرت سے کہنے لگے کہ یہ دروازہ میرے آباء کی نشانی تھا اب گرادیا جائے گا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے بخوشی یہ کام کرلیا۔ شاید میرا مولا اسی طرح میری عاقبت بالخیر کردے اور پھر آبدیدہ ہو کر ایک طرف کو چلے گئے۔

آخری ایام میں صحت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ قاضی اکمل صاحب نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ "یہ مغلی اب ختم ہو چکا ہے۔ اسے ختم ہو جانے دو۔"

آپ نے ۲۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو بوقت شام وفات پائی اِنَّالِلّٰهِ وَاِنَّاۤاِلَيْهِ رَاجِعُوْن

مرزا گل محمد صاحب کی وفات کی خبر سُن کر ہماری جماعت کے قطب الاقطاب حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحبؓ نے فرمایا۔

"یہ وہ شریف ترین انسان تھا جس نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔"

(الفضل ۲۵ ستمبر ۱۹۴۵ء ص ۱)

اس سے بڑھ کر سند کیا ہو سکتی ہے؟

محترم قاضی اکمل صاحب نے جن کو مرزا صاحب سے بہت پیار تھا فارسی اشعار میں ان کی تاریخ وفات کہی ؎

مجسم شرافت زہے نیک نام
محب و مخیر لبے خوش کلام

جُدا گشت ازما بعمر شِباب

زِعفران حق باشدش بہرہ تام

درخشید صبح صداقت بَرو

بروز قیامت بُودَ شاد کام

خدا باد حافظ بہ پسماندگان

طفیل محمدؐ۔ رسولِ انام

کشید آہ۲ اکملؔ۔ چُو تاریخ گُفت

فسُردہ گُلِ گلستانِ نِظام

۱۹۵۱۔ ۶ ۱۹۴۵ عیسوی

الغرض روحانی طور پرمُردہ خاندان میں خُدا تعالیٰ نے ایک گُل پیدا کر کے مسیح محمدیؑ کے انفاسِ مسیحائی سے اُسے حیاتِ ابدی بخشی۔ مرزا گُل محمد صاحب صحیح معنوں میں یُخرِجُ الحَيَّ من المَیِّتِ کے مصداق تھے۔

(ماہنامہ مصباح دسمبر ۱۹۷۸ء۔ جنوری ۱۹۷۹ء)

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا آخری سفرِ لاہور اور وصال

کے مختصر حالات

قرآن مجید نے تمام انسانوں کے لئے ایک قاعدہ کلیہ مقرر فرمایا ہے کہ

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت۔

یعنی جو انسان پیدا ہوگا وہ ایک دن فوت بھی ضرور ہوگا۔اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔دُنیا میں اگر کوئی سب سے زیادہ نافع الناس وجود پیدا ہوا ہے تو وہ فخرِ موجودات سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مبارک تھا۔جب اُن پر بھی وفات وارد ہوگئی تو پھر اس سے کوئی اور کیسے بچ سکتا ہے ۔

بدنیا گر کسے پائندہ بُودے

ابوالقاسم محمد زندہ بودے

(سعدی)

اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے دین حق کی خدمت کیلئے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کو مبعوث فرمایا آپ زندگی بھر اس کے لئے جدوجہد کرتے رہے مگر آخر وہ وقت آ گیا کہ حضرت مرزا صاحب کو خدا تعالیٰ نے خبر دی کہ وقتِ رحلت اب قریب ہے۔تب حضور نے رسالہ ''الوصیّت'' شائع کیا اور لکھا کہ:۔

''خدائے عزّ وجل نے متواتر وحی سے مجھے خبر دی ہے کہ میرا زمانۂ وفات نزدیک ہے اور اس بارے میں اُس کی وحی اس قدر تواتر سے ہوئی کہ میری ہستی کو بنیاد سے ہلا دیا اور اس زندگی کو میرے پر سرد کر دیا۔''

''پھر بعد اس کے خدا تعالیٰ نے میری وفات کی نسبت اردو زبان میں مندرجہ ذیل کلام کے ساتھ مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔

''بہت تھوڑے دن رَہ گئے ہیں۔اُس دن سب پر اداسی چھا جائے گی۔یہ ہوگا۔یہ ہوگا۔یہ ہوگا۔بعد اس کے تمہارا واقعہ ہوگا۔تمام حوادث اور عجائباتِ قدرت دکھلانے کے بعد تمہارا حادثہ آئے گا۔'' (الوصیت)

انہی دنوں چونکہ حضرت امّاں جان نور اللہ مرقدہا کی طبیعت قدرے ناساز تھی اور ان کی خواہش تھی کہ لاہور جا کر کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔اسی لئے حضور نے ارادۂ سفر فرمایا مگر ۲۶ اپریل ۱۹۰۸ء کو پھر القاء ہوا کہ

''مباش ایمن از بازیٔ رُوزگار۔''

ان تمام آسمانی خبروں سے حضورؑ کو یقین ہو چکا تھا کہ سفرِ آخرت اب قریب ہی ہے۔

آخر خدائی تقدیر حضور کو لاہور لے گئی۔۲۷ اپریل ۱۹۰۸ء کی صبح قادیان سے بٹالہ روانہ ہو گئے۔روانگی سے

قبل حضور نے وہ حجرہ خود بند کیا۔ جس میں حضور آخری عمر میں تصنیف کا کام کیا کرتے تھے۔ حضور نے یہ کمرہ بند کرتے ہوئے بغیر کسی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''اب ہم اس کو نہیں کھولیں گے۔''

بٹالہ جا کر پتہ چلا کہ ریلوے کے افسران نے گاڑی ریزرو نہیں کی۔ لہٰذا آپ نے سٹیشن بٹالہ سے ۶۰ گز کے فاصلہ پر ایک سرائے کے چوبارہ میں قیام فرمایا۔ ۲۸ کو بھی گاڑی نہ ملی تو حضورؑ حضرت اماں جان کو علی وال (نہر والا) جو نہر باری دوآب کا بڑا بھاری جنکشن ہے دکھانے لے گئے۔ ۲۹ کو گاڑی مل گئی اور حضور لاہور پہنچ گئے۔

حسبِ معمول حضرت میاں چراغ دین صاحب کے مکان پر ٹھہرے۔ خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم نے عرض کیا کہ آپ ہمارے نوتعمیر مکان پر تشریف لے چلیں تو وہ جگہ نسبتاً بہتر ہوگی۔ حضور نے فرمایا کہ ہم تو میاں چراغ دین صاحب کے مکان کو ہی اپنا مکان سمجھتے ہیں۔ آپ اُن سے اجازت لے لیں۔

خواجہ صاحب نے میاں صاحب موصوف سے کہا تو انہوں نے اجازت دے دی۔ چنانچہ حضور موجودہ احمدیہ بلڈنگس میں خواجہ صاحب مرحوم کے مکان پر منتقل ہو گئے۔ پھر وہاں سے ڈاکٹر سیّد محمد حسین شاہ صاحب مرحوم کے مکان میں رہائش پذیر ہوئے۔ دونوں مکانوں کے درمیان دس فٹ کی گلی ہے۔

حضور جونہی مکان سے باہر تشریف لاتے تو سلسلۂ وعظ و نصیحت شروع ہو جاتا اور پیاسے اس روحانی چشمہ کی طرف لپک پڑتے۔ سعید روحیں فیض پاتیں۔ چنانچہ اُن دنوں کثرت سے لوگوں نے بیعت کی۔

اُنہی دنوں لاہور میں ایک آسٹریلین Clement Ragg کلیمنٹ ریگ نامی حضرت مفتی محمد صادق صاحب کے ذریعہ حضرت اقدس سے ملنے کا خواہاں ہوا۔ وقت مقررہ پر وہ حاضر ہوا اور بہت سے سوال کئے مثلاً گناہ کیا چیز ہے۔ شیطان کسے کہتے ہیں۔ آئندہ زندگی کیسے ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ حضورؑ نے اُن کے تسلی بخش جواب دیئے جن کو سن کر وہ بہت متاثر ہوا اور شکریہ ادا کیا کہ میری تسلّی ہوگئی ہے۔

۱۸۔ مئی کو پھر انہوں نے ملاقات کی اور سائنسی سوالات کئے اور جب یہاں بھی تسلّی بخش جوابات ملے تو وجد میں آ کر کہنے لگا کہ ''میں تو خیال کرتا تھا کہ سائنس اور مذہب میں بڑا تضاد ہے جیسا کہ عام طور پر مانا گیا ہے مگر آپ نے تو اس تضاد کو اُٹھا دیا ہے۔''

آخر کار یہ صاحب ۱۹۱۵ء میں سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہو گئے تھے۔

۱۷۔ مئی کو شرفائے لاہور کے لئے ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا مگر ۱۶۔ مئی کی شب کو حضورؑ کی طبیعت ناساز ہوگئی اور اُمید نہ رہی کہ حضور خطاب فرماسکیں گے چنانچہ حضرت حکیم مولانا نورالدین صاحب کا لیکچر شروع کرا دیا گیا۔ مگر جلد ہی حضور بھی تشریف لے آئے۔

۱۱ بجے سے ایک بجے تک حضور نے وعظ و نصیحت فرمائی یہ تقریر ڈاکٹر محمد حسین صاحب کے مکان کے نچلے حصہ میں ہوئی تھی۔

۲۳۔ مئی کو حضورؑ نے رسالہ ''پیغام صلح'' لکھنا شروع کیا جس میں ہندو قوم سے چند شرائط پر صلح کی تجویز تھی۔ عصر کے قریب سناتن دھرم فرقہ کی کچھ عورتیں آئیں کہ ہم مہاراج کے درشن کے لئے آئی ہیں۔ حضور نے اندر آنے کی اجازت دیدی۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہمیں وعظ سنائیں۔ حضورؑ نے توحید پر زور دیا۔ شرک اور بُت پرستی سے بچنے کی تاکید فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ خدا کے دروازے کو پکڑیں اور کسی اور کے دروازے پر مت جائیں۔

وعظ سُن کر انہوں نے کہا کہ ہم بہت دور سے آئی ہیں۔ ہم چاہتی ہیں کہ ہم حضور کو پنکھا جھلیں۔ حضورؑ نے ان کو دُعا سکھائی اور دعا کرنے کا طریق بھی سمجھایا اس کے بعد وہ رخصت ہوئیں۔

اسی شام کو سیر کے لئے تشریف لے گئے کسی نے عرض کیا کہ حضور آج کچھ اُداس نظر آتے ہیں تو فرمایا:۔

''میری حالت اُس ماں کی طرح ہے جس کا بچہ ابھی چھوٹا ہے اور اپنے تئیں سنبھال نہیں سکتا اور وہ اُسے چھوڑ کر رخصت ہو رہی ہو۔''

درحقیقت کچھ عرصہ سے حضور کو متواتر کئی القاء اپنی وفات کے متعلق ہو رہے تھے۔ مثلاً ۲۔ مارچ ۱۹۰۷ء کو القاء ہوا۔ (مخاطب تھیں حضرت اماں جان):۔

''ہے تو بھاری مگر خدائی امتحان کو قبول کر''

۱۴۔ مارچ ۱۹۰۸ء کو القاء ہوا۔ اَعْجَبْتُمْ اَنْ تَمُوْتُوْا۔ اُن کی لاش کفن میں لپیٹ کر لائے۔ ۲۶/اپریل ۱۹۰۸ء کو القاء ہوا:۔

مباش ایمن از بازی روزگار اور پھر القاء ہوا:۔

مکن تکیہ بر عمر ناپائیدار

۹ مئی ۱۹۰۸ء کو القاء ہوا۔ اَلرَّحِیْلُ ثُمَّ الرَّحِیْل ۔ اَلْموتُ قَرِیب ۔ وغیرہ

حضرت اقدس چونکہ دماغی کام بہت کرتے تھے۔ اور سالہا سال سے اعصابی کمزوری بھی لاحق تھی۔ گو آپ خدا کے حکم کے تحت کام کرتے تھے مگر اس کا نتیجہ بھی تو خدائی قانون کے ماتحت ہی نکلتا ہے حضور کو دو طریق سے بیماری میں دورہ ہوا کرتا تھا کبھی اوپر کے دھڑ کا۔ اُس وقت دورانِ سر ہو جاتا تھا اور چکر آنے لگتے تھے۔ دل گھٹنے لگتا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے نبض کمزور ہو جاتی۔ ایسی حالت میں مُشک کا استعمال بڑا مفید ہوتا تھا۔ دوسری صورت میں نچلے دھڑ پر اثر ہوتا تو بکثرت پیشاب آتا اور اسہال شروع ہو جاتے۔ جس سے بے حد ضعف ہو جاتا۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کو یہی دو بیماریاں لاحق تھیں۔ وفات سے ۴ ماہ قبل حضورؑ نے ''چشمہ معرفت'' ایسی ضخیم کتاب لکھی اور لاہور آ کر ''پیغام صلح'' لکھی۔ ادھر عمر ستر، اسی (۸۰) سال کے درمیان تھی۔ لہٰذا انتہائی محنت اور عمر کے تقاضے سے طبیعت اچانک زیادہ ناساز ہوگئی۔ ۲۵ مئی ۱۹۰۸ کو جو بیماری کا دورہ پڑا وہی مرض الموت بن گیا۔ دوائیاں دی گئیں۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ رات کے ۱۱ بجے اجابت ہوئی۔ جس سے طبیعت بہت کمزور ہوگئی۔ اس وقت حضرت مولانا نورالدین

صاحب نے مشورہ کر کے مقوی دوا دی۔ خیال تھا کہ اب آرام سے نیند آ جائے گی مگر دو تین بجے پھر اجابت ہوئی جس سے نبض تقریباً ساکت ہوگئی۔ حضرت مولوی صاحب نے اس وقت خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب مرحوم کو بھی بلوالیا۔ حضور نے خود فرمایا کہ۔

تجویز کریں اور ساتھ ہی فرمایا کہ

''حقیقت میں تو دَوا آسمان پر ہے۔ آپ دَوا بھی کریں اور دُعا بھی۔''

مگر حالت نازک ہوتی چلی گئی۔ صبح لاہور میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سدرلینڈ کو بلوایا گیا جو بہت قابل ڈاکٹر تھا۔ مگر موت کا کوئی علاج نہ تھا۔ ڈاکٹر کے دریافت کرنے پر کہ آپ کو خاص طور پر کیا تکلیف ہے۔ کاغذ اور قلم دوات منگوائی گئی حضور نے بائیں ہاتھ پر سہارا لے کر کچھ اُٹھ کر لکھنا چاہا مگر بمشکل چند الفاظ لکھ سکے اور بوجہ شدید ضعف کے قلم کاغذ پر گھسٹتا چلا گیا۔ اور حضور لیٹ گئے۔

۹ بجے حالت تشویش ناک ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد نزع کی حالت طاری ہوگئی۔ لمبے لمبے سانس لیتے جو کچھ کچھ کر آتے تھے۔ حضرت امّاں جان سرہانے کے قریب زمین پر بیٹھی دُعا میں لگی ہوئی تھیں کبھی سجدے میں گر جاتیں۔ بار بار یہی کہتیں کہ اَے حی وقیوم خدا۔ اے مرے پیارے۔ اے مرے قادرِ مطلق مُردوں کو زندہ کرنے والے تُو ہماری مدد کر۔ اے واحد ولاشریک خدا میرے گناہ بخش۔ میں گنہ گار ہوں۔ میری زندگی بھی ان کو دیدے۔ بار بار یہی الفاظ زبان پر تھے۔ جب دیکھا کہ اب بالکل آخری وقت ہے تو آپ نے فرمایا۔ ''اے میرے پیارے خدا۔ یہ تو ہمیں چھوڑتے ہیں مگر تو ہمیں نہ چھوڑیو'' کئی بار یہی دُہرایا۔ ساڑھے دس بجے صبح دو ایک لمبے سانس آئے اور رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیْہِ رَاجِعُوْن

حضور کی پیدائش ۱۳ فروری ۱۸۳۵ء اور وفات ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء مطابق ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۲۶ء ہجری کو ہوئی۔

حضرت اقدس کی وفات پر نہ اہل خاندان نے اور نہ خدام میں سے کسی نے جزع فزع کی۔ حضرت امّاں جان نے حضور کی وفات کے بعد اپنے بچوں کو جمع کر کے صبر کی تلقین کی اور نصیحت فرمائی کہ ''بچو! گھر خالی دیکھ کر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے ابّا تمہارے لئے کچھ نہیں چھوڑ کر گئے۔ انہوں نے آسمان پر تمہارے لئے دُعاوں کا بڑا بھاری خزانہ چھوڑا ہے جو تمہیں وقت پر ملتا رہے گا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب (المصلح موعود) نے صبر کا بہترین نمونہ دکھایا۔ آپ نے حضور کے سرہانے کھڑے ہوکر عہد کیا کہ۔

''اگر سارے لوگ بھی آپ کو چھوڑ دیں گے اور میں اکیلا رہ جاؤں گا تو میں اکیلا ہی ساری دُنیا کا مقابلہ کروں گا اور کسی کی مخالفت اور دشمنی کی پرواہ نہ کروں گا۔''

(الفضل ۱۹ جنوری ۱۹۶۲ء)

دن کے اڑھائی بجے تک غسل اور کفن دینے سے فراغت ہوگئی ۔احمدی اور غیراز جماعت احباب آخری زیارت کے لئے آتے ۔وفات کے بعد بھی آپ کے چہرہ مبارک پر وہی نُور برس رہا تھا جو زندگی میں ہوا کرتا تھا۔۴ بجے کے قریب آپ کا جنازہ ریلوے اسٹیشن لاہور پر لایا گیا جہاں پہلے سے ریزرو گاڑیوں کا انتظام تھا۔چونکہ نعش مبارک قادیان لے جانی تھی اس لئے صندوق بنوا کر نعش اندر رکھ دی گئی اور کئی من برف ارد گرد رکھی گئی۔

احمدیہ جماعتوں کو تاریں دیدی گئیں کہ اگر ممکن ہو تو جنازہ کے لئے قادیان پہنچ جائیں۔

اہل قادیان کی یہ حالت تھی کہ کسی کو بھی حضور اقدس کی وفات کا یقین نہ آتا تھا بلکہ شُبہ تھا کہ کسی دشمن نے تار دیدیا ہے ۔کسی نے کہا کہ بٹالہ آدمی بھجوا کر معلوم کیا جائے جو لاہور سے بذریعہ تار اصل حال معلوم کرے ۔اسی دوران مسجد مبارک میں ایک مجمع ہوگیا۔عین اس وقت خاکسار (راقم مضمون ہذا) کے والد چوہدری نعمت اللہ صاحب گوہر جو صبح نو بجے تک احمدیہ بلڈنگز ہی میں تھے ۔لاہور سے دس بجے صبح کی گاڑی سے چل کر قادیان پہنچ گئے تھے انہوں نے حضور کی شدید علالت کا کھول کر ذکر کیا اور وہ الہامات جو حضور کو دو تین دن پیشتر ہوئے تھے ۔حاضرین کو سنائے ۔تب کہیں لوگوں کو یقین آیا کہ حضور فی الواقعہ انتقال فرما گئے ۔یہ معلوم کر کے قادیان اسی طرح غم کدہ بن گیا۔جس طرح صبح ساڑھے دس بجے احمدیہ بلڈنگز کی سرزمین بن گئی تھی ۔مغرب کی نماز میں مسجد مبارک کی چھت پر آہ و بکا اور گریہ وزاری سے پُر دُعائیں کی گئیں۔

چھ بجے شام کو گاڑی لاہور سے بٹالہ کے لئے روانہ ہوئی ۔گاڑی میں جنازہ کے ساتھ حضرت اماں جان حضرت مولانا نورالدین صاحب۔حضرت میر ناصر نواب صاحب حضرت نواب محمد علی خان صاحب اور بے شمار خدام تھے۔جناب عبدالمجید سالک صاحب کا بیان ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی امرتسر سے لاہور آئے اور جنازہ کے ہمراہ لاہور سے بٹالہ تک گئے تھے ۔امرتسر میں بہت سے احمدی احباب آ شریک ہوئے ۔گاڑی رات دس بجے بٹالہ سٹیشن پر پہنچی تو حضور کی نعش والا صندوق اتار کر رکھ لیا گیا۔یہ جگہ قادیان کی طرف پلیٹ فارم پر نلکہ کے قریب تھی۔

پھر اسٹیشن کے باہر ذرا دائیں ہاتھ کو دو آم کے درخت تھے ۔وہاں نعش کو لا کر رکھا گیا۔وہیں صندوق میں سے نکال کر نعش مبارک چارپائی پر رکھ کر شانہ بشانہ اُٹھا کر قادیان کی طرف روانہ ہوگئے ۔رات اندھیری تھی۔دیوانی وال سڑک کے کنارے ایک گاؤں ہے وہاں پر نماز فجر ادا کی گئی ۔نہر کے پُل کے قریب قادیان کے دوست بھی آ شامل ہوئے۔جنازہ ۸ بجے صبح ۲۷ مئی کو بہشتی مقبرہ سے ملحق باغ میں واقع پکے مکان میں رکھ دیا گیا۔

جس وقت حضور کا وصال ہوا تو صاحبزادہ مرزا سلطان احمد صاحب جالندھر میں افسر مال تھے ۔وفات سے قبل وہ دیہات میں دورہ پر تھے ۔دورہ ختم کر کے گھوڑے پر جالندھر واپس آ رہے تھے کہ رستے میں اُن کو القاء ہوا ''ماتم پُرسی'' گہری سوچ میں پڑ گئے پھر راستہ میں دوبارہ یہی القاء ہوا ۔سخت پریشان ہوئے خیال آیا کہ شاید اُن کی تائی

حُرمت بی بی صاحبہ (بھاوجہ حضرت مرزا صاحب) کا انتقال ہوگیا ہے۔تیسری مرتبہ پھر یہی القاء ہوا اور آپ سخت خوف زدہ ہوگئے اور گھوڑے سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گئے۔خیال آیا کہ خدا تعالیٰ کی جانب سے ماتم پُرسی پر تو لازمی ہے کہ کسی اعلیٰ دارفع ہستی کی موت سے وابستہ ہے۔یہ خیال آتے ہی یقین آ گیا کہ حضرت والد صاحب کا ہی وصال ہے یہ خیال آتے ہی سیدھے انگریز ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ کو گئے اور کہا کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا ہے مجھے رخصت دے دیں۔میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔

اُس نے کہا کہ آپ کو یہ اطلاع راستے میں ملی ہے یا کوئی آدمی آیا ہے۔آپ نے جواب دیا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔صرف خدائی تار ملا ہے۔اُس نے کہا آپ کو یونہی وہم ہوگیا ہے تسلی رکھیں۔یہ کوئی بات نہیں ہے مگر آپ نے اصرار کر کے رخصت لے لی۔اپنے بنگلہ پر آئے تو وفات کی تار بھی مل گئی۔وہ تار لے کر آپ دوبارہ صاحب کے پاس گئے کہ دیکھ لو یہ تار بھی آ گیا ہے۔وہ بڑا حیران ہوا کہ آپ لوگوں کو خدا پر کیسا یقین ہے۔آپ جالندھر سے امرتسر آئے تو جنازہ بھی امرتسر آ چکا تھا۔

قادیان آ کر جماعت کے مقتدر اصحاب نے مشورہ کر کے حضرت مولانا حکیم نورالدین صاحب سے درخواست کی کہ آپ جماعت میں سب سے زیادہ متقی اور اعلم ہیں ہماری بیعت قبول فرمائیں۔آپ نے وضو کر کے ایک بند کمرے میں دو رکعت نماز پڑھی اور کافی دیر کے بعد باہر نکلے۔بہشتی مقبرہ آ کر حضور علیہ السلام کا جنازہ پڑھایا۔

نمازِ عصر کے بعد تمام حاضرین نے آخری مرتبہ حضور کے نورانی چہرہ کی زیارت کی۔پہلے مردوں نے پھر مستورات نے کی۔حضرت اماں جان اسی وقت باغ والے مکان کے جنوب مغربی حصہ میں خواتین کے مجمع میں تشریف فرما تھیں۔۲۷ مئی ۱۹۰۸ء کو شام ۶ بجے نعش مبارک کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْن

(ماہنامہ مصباح مئی ۱۹۸۴ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　　　　نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حضرت شیخ غلام احمدؐ صاحب واعظؓ

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قوت قدسیہ سے ہزار ہا نفوس نے ابدی زندگی پائی اور آپ کے فیض سے ہر فرقے کے لوگ سلسلہ احمدیہ میں داخل ہوئے۔ جن کے نیک کام اور نیک نمونے کا ایک عالم گواہ ہے حضرت شیخ غلام احمد صاحبؓ واعظ مرحوم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔

شیخ صاحبؓ ہندوؤں کے کھتری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا نام سیٹھ گلاب مل اور والدہ کا سہاگ دیوی تھا۔ خود شیخ صاحب کا ہندوانہ نام ہیرا لال تھا۔ آپ کے دو اور بھائی دولت رام اور پوہلو رام بھی تھے اور دو ہمشیرگان تھیں۔

آپ قصبہ کھنہ ضلع لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد گلاب مل صاحب اپنے علاقہ کے مشہور ساہوکار تھے۔ گھر میں ہر قسم کی امارت کے سامان موجود تھے بہت بڑی جائیداد تھی۔ اپنی برادری کے سرپنچ تھے۔ نہایت درجہ غیور واقع ہوئے تھے۔ سخی طبیعت تھے۔ اگر ان کی کوئی آسامی اپنے حالات بتا کر قرض کی رقم ادا کرنے سے معذوری پیش کرتی تو اکثر رقم بالکل معاف کر دیتے تھے اور کبھی ماتھے پر بل نہ لاتے تھے۔

پُرانے ہندوؤں میں عام رواج تھا کہ بچے کی پیدائش پر کسی قابل جوتشی کو بلوا کر اس کے مستقبل کے حالات کا زائچہ تیار کراتے۔ پہلوٹی کا بچہ تھا، بڑے اہتمام سے اسکا زائچہ ایک قابل پنڈت سے تیار کرایا (افسوس کہ صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہیں ہو سکا) جب پنڈت صاحب نے زائچہ تیار کر کے اُس سے نتائج نکالے تو گہری فکر میں ڈوب گئے۔ سیٹھ گلاب مل صاحب نے پنڈت جی کو متفکر دیکھ کر پوچھا کیوں کیا بات ہے؟ اس نے اب صاف کہہ دیا کہ ”سیٹھ صاحب! یہ لڑکا تو ہاتھ سے گیا۔“ انہوں نے نہایت گھبراہٹ سے پوچھا کس طرح؟ پنڈت نے مختصراً بتایا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر فقیر ہو جائے گا۔ سیٹھ صاحب نے پنڈت جی کو پھر غور کر کے بتلانے کیلئے کہا مگر اُن کا ایک ہی جواب تھا۔ چنانچہ سیٹھ صاحب اُسی دن سے بجھے بجھے سے رہنے لگے مگر بچّے کی پرورش ہندوانہ طریق پر بڑے اہتمام سے کرتے رہے۔ جب بھی جوتشی کی بات یاد آتی تو پدرانہ شفقت جوش میں آجاتی اور دلچسپی اور بڑھ جاتی۔ تربیت کے نئے نئے پہلو سوچتے مگر مولا کریم کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جوں جوں عمر میں ترقی کرتے گئے طبیعت میں سادگی اور دینی رجحان بڑھتا گیا۔ ادھر لالہ صاحب اپنے لڑکے کی سادگی، انکساری اور دنیاوی کاموں سے اعراض دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتے اور سوچتے کہ اتنے بڑے خاندان میں ایسا لڑکا کہیں بدنامی کا باعث نہ بنے۔ شیخ صاحب اس عمر میں عام بچوں کی صحبت سے علیحدہ رہتے۔ کھیل کود میں بہت کم حصہ لیتے۔ عموماً تنہائی پسند تھی۔ سنجیدہ طبیعت کے ساتھ ساتھ صاف

ستھرا ماحول بہت پسند کرتے۔ زمین پر بیٹھنے سے بہت گھبراتے تھے۔ آپ نے صرف ابتدائی تعلیم حاصل کی ہندوانہ طریق عبادت سے کراہت تھی۔ اسی طرح دنیوی کاموں سے بھی حتی الوسع احتراز ہی کرتے۔ لالہ صاحب ہمیشہ ان کو کاروبار کے طریق سکھاتے۔ باہر جاتے تو ہمراہ لے جاتے اور کاروباری سلسلہ میں اکثر لدھیانہ بھجواتے رہتے مگر ان کا دل اس پیشہ میں کبھی نہ جما ویسے یہ جو بھی کام کرتے سمجھ بوجھ کر کرتے۔ ہر بات کی اونچ نیچ اور اسکے نفع نقصان کو جانچ لیتے۔

شیخ صاحب کی بارہ تیرہ برس کی عمر تھی۔ لدھیانہ گئے ہوئے تھے۔ راستے میں ایک مسجد پڑتی تھی اُس کے قریب ایک اجتماع میں ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے آپ بھی کھڑے ہو کر سننے لگے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا ''مسلمانوں کا خدا آج بھی زندہ ہے اور وہ زندہ خدا آج بھی مسلمانوں سے بولتا ہے'' مولوی صاحب ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ شیخ صاحب آگے بڑھ کر مولوی صاحب کے پاس پہنچ گئے اور بڑی جرأت مندانہ آواز سے پوچھا کہ ''مولوی صاحب! میں ہندو دھرم رکھتا ہوں اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو کیا پر ماتما مجھ سے بھی بات کرے گا؟'' مولوی صاحب نے نہایت شفقت سے جواب دیا'' ہاں بیٹا خدا تعالیٰ تم سے بھی کلام کریگا۔ اللہ تعالیٰ ہر سچے مسلمان سے ضرور بولتا ہے''۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی نرا مولوی نہیں تھا بلکہ کوئی خدا رسیدہ بزرگ تھا۔ اتنا سننے کے بعد شیخ صاحب تو اپنے راستے چلے گئے مگر دل میں ایک خلش ضرور پیدا ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے شوق نے دیوانہ بنا دیا۔ گھر آکر اپنے ایک تایازاد بھائی کو ہمراز بنایا اور ایک دن موقع پا کر گھر سے کچھ نقدی اور زیوات لے کر بھاگ نکلے۔ لدھیانے پہنچ کر ایک مولوی صاحب سے ملے اور کہا کہ ہم دونوں مسلمان ہونا چاہتے ہیں مگر اُس نے بچے سمجھ کر ٹال دیا۔ لیکن شیخ صاحب ایک عزم لیکر گھر سے نکلے تھے اور کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھے جو ان کو مسلمان بنا دے۔ مگر کوئی ایسا بندہ خدا نہ ملا اور اگر ملا بھی تو یہ سمجھ کر ٹال دیا کہ، ہندو بچے ہیں کہیں کوئی اور فتنہ ہی نہ پیدا ہو جائے۔

والدین تلاش میں سرگرداں تھے کیونکہ کافی مال لیکر بھاگے ہوئے تھے شیخ صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ ''ہم دونوں (خود اور تایازاد بھائی) ایک رات ایک دکان کے تھڑے پر غافل سو رہے تھے تقریباً فجر کا وقت تھا کہ گاؤں کے ایک آدمی نے پہچان لیا اور گھر لے گیا۔ گھر جو پہنچے تو والد صاحب نے خوب مارا اور گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رہنے کی تاکید کی۔ باہر نکلنے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ اندر سے دل مچلتا تھا کہ کسی صورت سے مسلمان ہو جاؤں اور خدا سے ہمکلامی نصیب ہو۔ ہر وقت اسی خیال میں مگن رہتے اور سوچتے کہ نہ معلوم مسلمانوں کا خدا مسلمانوں سے کس طرح بولتا ہوگا۔ اسی خیال سے چوری چوری نماز بھی پڑھتے۔ ایک دن باپ نے ان کو حالتِ نماز میں دیکھ لیا۔ پوچھا'' ہیرالال! یہ اندر اٹھک بیٹھک کیا کر رہا تھا؟'' کہنے لگے'' پتا جی! نماز پڑھ رہا تھا۔'' بس اتنا سننا تھا کہ باپ کو سخت غصہ آیا اور اُنہیں مارتے ہوئے کہا'' کیا تو ہمارے خاندان کی ناک کٹوائے گا؟ اپنے دھرم کو

چھوڑ کر دوسروں کا دھرم اختیار کرے گا؟'' اسی ناراضگی میں حکم دیدیا کہ ہیرالال! کا کھانا بند کردو۔لیکن ماں کی ممتا باپ سے چوری لخت جگر کو کھانا کھلا ہی دیتی۔کچھ عرصہ بعد باپ کو بھی یقین ہو گیا کہ جب یہ حالات ہیں تو اسکا فقیر ہو جانا کوئی بعید بات نہیں۔ادھر شیخ صاحب گرفتار قفس تھے۔بھاگنے کی سکیم بنائی اور سوچا کہ پہلے تو نقدی اور زیورات کی وجہ سے پکڑے گئے تھے اس دفعہ خالی ہاتھ نکلیں گے۔چنانچہ ایک دن موقع پا کر تن تنہا بھاگ نکلے اور لدھیانے جا کر دم لیا۔اس مرتبہ اتفاق سے ایک مردِ مومن مل گیا جس نے آپکو کلمہ پڑھا کر اسلام کے دامن میں پناہ دی۔آپ نے اُن کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔شیخ صاحب انہی بزرگ کے پاس رہنے لگے۔باپ نے پھر تلاش کرائی۔جلد پکڑے گئے اور گھر لائے گئے۔اس مرتبہ آپ نے بھی والد صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ ''میں مسلمان ہو چکا ہوں'' اور کلمہ بھی پڑھ کر سنایا۔باپ کو شدید صدمہ ہوا مگر کیا کر سکتے تھے۔مارنے کے بجائے سمجھانے بیٹھ گئے لیکن۔

یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

شیخ صاحب بھلا کب ماننے والے تھے۔کوئی جبراً تو مسلمان نہ ہوئے تھے اور نہ کوئی دنیاوی لالچ ہی تھا۔صرف دلی جذبہ کارفرما تھا۔باپ نے تمام برادری کو اکٹھا کیا اور شیخ صاحب سے مخاطب ہو کر بولے ''ہیرالال! یہ جتنی دولت ہے، جتنی جائیداد ہے، سب تیرے نام کئے دیتا ہوں۔برادری کی جونسی لڑکی سے تو کہے اُس سے شادی رچائے دیتا ہوں۔گاؤں کی نمبرداری تیرے سپرد کرا دیتا ہوں۔'' اور پھر بڑی عاجزی سے کہنے لگے۔''ہیرالال! ہماری ناک نہ کٹوا۔مسلمان نہ بن۔تجھے اس گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔کس بات کا دکھ ہے۔جس چیز کی خواہش ہو وہ بتاؤ ہم پوری کریں گے'' مگر واہ ری استقامت! خود سناتے تھے کہ میں نے کھڑے ہو کر تمام برادری کو مخاطب کر کے کہا ''پتا جی! آپ نے سب باتیں کہہ لیں اب میری بھی سن لیں۔یہ پیسہ، یہ جائیداد، یہ دھن دولت اسی دنیا میں رہ جائے گی۔عورت کی خوبصورتی ناپائیدار ہے۔گاؤں کی نمبرداری میرے کس کام کی؟ پیسہ چور لے جا سکتے ہیں، جائیداد تباہ ہو سکتی ہے۔میں تو مسلمان ہو چکا ہوں۔میں واپس آپ کے دھرم میں نہیں آنا چاہتا۔میں نے وہ دولت حاصل کر لی ہے جو میرے ساتھ قبر تک جائے گی'' اور بلند آواز سے کلمہ پڑھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور وہاں سے چلے جانے کی اجازت چاہی مگر وہاں اجازت دینے والا کون تھا، تمام برادری تو دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔آپ سب کو روتا چھوڑ کر لدھیانہ چلے آئے۔اللہ اکبر! ایمان کی یہ کیسی نعمت تھی جس نے ساری نعمتوں کو ٹھکرا دیا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
گر نہ بخشد خدائے بخشندہ

لدھیانہ پہنچ کر ایک مسجد میں ڈیرہ ڈالا۔اب اُنہیں سوائے نماز پڑھنے، تلاوت قرآن مجید اور دینی مسائل سیکھنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔اسی مسجد میں اذان بھی دینے لگ گئے۔اسی عرصہ میں والد کا پیغام ملا کہ لدھیانہ چھوڑ کر کسی

اور جگہ چلے جاؤ تمہارے یہاں رہنے سے ہماری بے عزتی ہوتی ہے کیونکہ لوگ عموماً تذکرہ کرتے رہتے تھے کہ سیٹھ گلاب مل کا بڑا بیٹا ہیرا لال باپ دادا کا دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو گیا ہے۔ اس میں تمام خاندان کی سبکی تھی۔ تعمیل ارشاد میں شیخ صاحب لدھیانے سے لاہور چلے آئے اور اہل حدیث فرقہ کی ایک مسجد میں رہائش اختیار کر لی اور پہلے سے زیادہ نماز اور قرآن مجید کی تعلیم میں دلچسپی لینے لگے۔

خود سناتے تھے کہ ایک دن شہر میں گھوم رہا تھا اتفاقاً ایک امام باڑے میں جا نکلا۔ شیعہ اصحاب ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں اور یہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز کے بعد لوگوں نے کہا کہ تم ہاتھ باندھ کر نماز کیوں پڑھتے ہو؟ آپ نے کہا کہ میں ہندو سے مسلمان ہوا ہوں فلاں مسجد میں ڈیرہ ہے، آج اتفاقیہ پھرتے پھراتے ادھر آ نکلا تھا۔ اُن لوگوں نے کہا کہ وہ تو اہل سنت کی مسجد ہے، اُن کا بھی کوئی دین ہے وہ تو سن سنا کر ایمان لائے ہیں، آپ اپنا سامان لینے چلے گئے اور دل میں یہی خیال تھا کہ واقعی اصلی مسلمان شیعہ ہی ہیں مگر جب مسجد سے سامان اٹھا کر چلنے لگے تو امام مسجد نے پوچھا میاں کہاں چلے؟ بولے ''پکے مسلمانوں کی مسجد میں'' پوچھا ''وہ کون ہیں'' تو جواب دیا کہ جہاں امام باڑہ ہے وہاں چلا ہوں۔ امام مسجد نے کہا ''ارے ایسا غضب نہ کرنا پکے اور راسخ مسلمان تو ہم ہیں، وہ لوگ تو خلفاء راشدین پر تبرہ بھیجتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی صحیح اتباع کرنے والے تو ہم ہیں۔'' اس پر شیخ صاحب خاموش ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ رات سخت شش و پنج میں بسر کی۔ نیند نہ آئی اور سوچتے رہے، یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ بھری برادری چھوڑ کر آیا ہوں، واپس جانے کا منہ نہیں رکھتا، نہ معلوم اب پکے مسلمان کونسے ہیں؟ خدا آخر کہاں ملیگا؟ میں کدھر کو جاؤں؟ غرضیکہ رات اسی بے چینی میں گزری۔ صبح کی نماز پڑھتے ہی قرآن مجید ہاتھ میں لیا اور دریائے راوی کا رخ کیا اور ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں کسی کی نظر نہ پہنچے۔ پھر نہایت رقت اور گریہ وزاری کے بعد اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے عرض کیا کہ ''اے پرماتما! میں صرف اس وجہ سے مسلمان ہوا تھا کہ تُو مسلمانوں سے بولتا ہے، بھری برادری کو چھوڑ کر آیا ہوں، ماں باپ سے جدائی اختیار کی ہے، باپ دادا کا مذہب چھوڑا، دھن دولت چھوڑی، واپس جانے کا مُنہ نہیں رہا۔ اے پرماتما! اگر تُو واقعی بولتا ہے تو کم از کم ایک مرتبہ تو مجھ سے بول پھر چاہے عمر بھر نہ بولنا۔ اور اگر تُو نے نہیں بولنا تو پھر پہلے تیری یہ پُستک دریابُرد کروں گا اور پھر خود اس میں غرق ہو جاؤں گا۔ یہاں سے واپس ہرگز نہیں جاؤنگا۔ اس پر غیب سے آواز آئی کہ **''تُو ہمارے اور ہمارے رسولؐ کیلئے مسلمان ہوا ہے نہ کہ ان مسلمانوں کیلئے مسلمان ہوا ہے''** شیخ صاحب بیان فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے آنسو پونچھے اور حیران ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کسی نے شاید میری آواز سن کر اپنی طرف سے آواز دیدی ہوتا کہ میری تسلی ہو جائے لیکن اچھی طرح اطمینان کر کے کہ دُور دُور تک کوئی شخص موجود نہیں پھر بارگاہ الٰہی میں دوبارہ ملتجی ہوا کہ ''اے وحدہ لاشریک ایک بار اور بول تا کہ میرے دل کی تسلی ہو جائے پھر چاہے عمر بھر نہ بولنا''۔ فرماتے تھے کہ پھر وہی آواز آئی۔ اُس وقت میرا مُنہ آسمان کی طرف اُٹھا ہوا تھا اور آواز وہی تھی۔ ''تُو ہمارے ا! ہمارے

رسولؐ کیلئے مسلمان ہوا ہے نہ کہ ان مسلمانوں کیلئے مسلمان ہوا ہے''۔ یہ آواز اس طرح آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جیسے بارش کے قطرے پڑتے ہیں۔ نہایت ہی مطمئن دل لیکر وہاں سے اُٹھے اور خدا تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے واپس مسجد میں آگئے اور دو نفل شکرانے کے ادا کئے۔ اس واقعہ سے کسی کو آگاہ نہ کیا۔ چند دن کے بعد شیخ صاحب کی ملاقات ایک بزرگ غلام محمدؒ نامی سے ہوئی انہوں نے شیخ صاحب کا نام بھی غلام محمدؒ رکھ دیا (ہندو سے مسلمان ہوتے وقت جو نام رکھا گیا تھا اُس کا علم نہیں ہوسکا) اُس درویش کے ہمراہ بہت عرصہ تک رہے۔ اس کی ہر طرح سے خدمت بجالاتے رہے، پاؤں دباتے، خود بتاتے تھے کہ ایک دفعہ سفر کے دوران میں سواری کے لئے اُن کو گدھا ملا۔ وہ بزرگ بھی گدھے پر سفر کر رہے تھے۔ شیخ صاحب کیا جانیں کہ اس جانور پر کس طرح سوار ہوتے ہیں دو تین مرتبہ گرے وہ بزرگ کہہ دیتے غلام محمدؒ سوار ہو جاؤ لیکن جب ایک دفعہ بہت زور سے گرے تو انہوں نے کہا کہ ''اچھا غلام محمدؒ اس کی رسی پکڑ لو اور پیدل چلو''۔ فرماتے تھے کہ جب یہ اجازت ملی تو میری جان میں جان آئی۔

ایک مرتبہ اُس بزرگ کی محفل جمی ہوئی تھی کہ شیخ صاحب نے نہایت ادب سے دریافت کیا۔ حضرت! آپ سے بھی بڑھکر کوئی بزرگ ہے؟ اور اللہ تعالیٰ مجھ سے کب ہمکلام ہوگا؟ اُس بزرگ نے فرمایا مجھ سے بھی بڑھ کر ایک بزرگ پیدا ہو چکا ہے جب آپ کی ملاقات اُن سے ہوگی تو پھر اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی کا شرف بھی حاصل ہوگا۔ (افسوس کہ بیعت کرنے کے حالات کسی سے بھی اس وقت تک معلوم نہیں ہوسکے)

آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ سُنا تو آپ قادیان پہنچے اور چند دن قیام کرنے کے بعد بیعت کا شرف حاصل کیا۔ حضور علیہ السلام نے بیعت کے بعد آپ کا نام تبدیل کر کے غلام احمدؒ رکھ دیا۔ بیعت کے بعد واقعی اللہ تعالیٰ شیخ صاحب سے ہم کلام ہوا اور ایسا ہمکلام ہوا کہ بس مزہ ہی آگیا۔ یوں باتیں ہوتی تھیں جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے کرتا ہے۔

بر کسے   چوں   مہربانی   می   کند

از   زمینی   آسمانی   می   کند

زندگی میں ہزار ہا مرتبہ مشکلات پیش آئیں۔ بارگاہ الٰہی میں عرض کیا اور کام ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اس بات کا زندہ ثبوت تھے کہ واقعی مسلمانوں کا خدا مسلمانوں سے ہمکلام ہوتا ہے۔

بیعت کے بعد آپ قادیان کے ہی ہو کر رہ گئے ماں باپ کی یاد دل سے محو نہ ہوئی تھی، جب بے چینی بڑھ گئی تو جی میں آیا کہ گھر کھنہ چلوں۔ مگر اب جائیں تو کس طریق سے؟ دوسرے رشتہ دار تو زبان ہلانے سے بے شمار بن جاتے ہیں مگر ماں باپ کہیں سے نہیں ملا کرتے۔ یوں چھوڑنے کو تو ماں باپ سے علیحدہ ہو گئے۔ دین کے معاملہ میں والدین کی مطلق پرواہ نہ تھی اور اسی کی خاطر اپنے والدین، عزیز و اقارب، دھن دولت اور امن وچین کو قربان کیا تھا مگر فطرتی اور جذباتی طور پر محبت تو بہر حال باقی رہتی ہے۔ آپ نے یہ ترکیب سوچی کہ فقیروں کا بھیس بدل

کر جائیں ۔کاسہ ہاتھ میں لیااور باپ کی دکان پر جا کر صدا لگائی ۔ باپ نے جھٹ پہچان لیا۔ شفقت سے اندر بُلا کر پاس بٹھایااور نرم لہجہ میں خوب خفا ہوئے ۔ کچھ رقم دینا چاہی مگر تھے کس باپ کے بیٹے ۔انکار کر دیا۔آپ تو اپنے والد کا دیدار کرنے گئے تھے اور یہ دیکھنے کہ مجھے اس حال میں پہچانتے بھی ہیں یا نہیں؟ بھائیوں نے بہت سمجھایا مگر یہ سیدھے واپس قادیان چلے آئے ۔ کچھ عرصہ بعد ماں سے ملنے کا شوق پھر غالب آیا وطن گئے ۔اس دفعہ فقیروں کا سالباس نہ پہنا۔گھر میں ماں دیکھ کر نہال ہوگئی ،دل باغ باغ ہوگیا۔گھر میں بے تکلف قیام کیا۔ماں مادرانہ جذبہ کے ماتحت نوالہ بنا کر خود کھلاتی رہی حالانکہ آپ جوان تھے ایک دن باپ نے یہ ماجرا دیکھ لیا تو ناراض ہوئے مگر ماں نے نہایت رقت سے جواب دیا'' کیا میں ہیرالال کی ماں نہیں ہوں؟ کیا یہ میرا پُتر ہیرالال نہیں ہے؟ یہ سنکر باپ کے بھی فرط محبت سے آنسو نکل آئے ۔

جب تک والدہ زندہ رہیں باپ سے چوری ہر ماہ پندرہ روپے آپکو ہمیشہ بھجواتی رہیں اکثر گرمیوں اور سردیوں میں کافی کپڑے ،بنوا کر بھجواتیں ۔آپ بھی گاہ بگاہ گھر جاتے ۔شادی کے بعد ایک مرتبہ بچوں کو بھی لیکر گئے ۔جب بھی گھر جاتے اپنی بہنوں اور اُن کے بچوں کے لئے تحائف لیکر جاتے ۔جب بچوں کو لیکر گئے تو ماں بے حد خوش ہوئی ۔کئی دن تک وہاں قیام رہا۔آپ نے فقیرانہ لباس پہن کر جوتشی کی بات کو بھی پورا کر دیا اور ویسے بھی عمر بھر اپنے آپ کو ہمیشہ عاجزی وانکساری سے فقیر ہی کہا۔تحریر میں بھی فقیر کا لفظ ہی استعمال کرتے ۔عمر بھر انتہائی سادگی سے زندگی بسر کی ۔اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہی آپ کو مالی وسعتیں دیں۔

آپ کی شادی محترمہ صفیہ بیگم صاحبہ دختر جناب قدرت اللہ خان صاحب شاہ جہان پوری سے ہوئی ۔خان صاحب موصوف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دربان تھے اور ذات کے پٹھان تھے ۔شاہ جہاں پور وطن تھا۔ پہلے پولیس میں انسپکٹر تھے ۔نہایت نیک انسان تھے حضرت مسیح موعودؑ کا دعویٰ سن کر قادیان آئے اور بیعت کر لی ۔ کچھ عرصہ بعد اجازت لیکر یہیں کے ہو رہے اور حضور کے دربان بن کر ساری عمر بسر کر دی حضور علیہ السلام نے ''الدار'' کے ایک حصہ میں اُن کو اور اُن کے بچوں کو رہائش کیلئے جگہ عنایت فرمائی ہوئی تھی۔

آپ کی اہلیہ محترمہ قمرالنساء نہایت باحیا خاتون تھیں ۔کبھی سر سے دوپٹہ نہ اتارا۔نماز ،روزے اور تلاوت قرآن مجید کی پابند تھیں ۔حضرت اقدسؑ کے گھر کے اندر خدمت کرتی تھیں۔

خان قدرت اللہ خان صاحبؓ کے چار فرزند آج بھی زندہ موجود ہیں ڈاکٹر عبدالمجید خان صاحب قلات شہر میں ڈاکٹر ہیں ۔ڈاکٹر حافظ عبدالجلیل صاحب اندرون موچی دروازہ لاہور میں عرصہ دراز سے دواخانہ کھولے ہوئے ہیں ۔احسن اللہ خان صاحب طالب علمی کے زمانہ میں تعلیم الاسلام ہائی سکول کی ہاکی ٹیم کے رکن تھے بعد میں سعودی عرب میں ملازمت کرتے رہے آجکل پاکستان میں تجارت کرتے ہیں۔

شیخ صاحب نے حضرت اقدسؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور میری شادی کا بندوبست فرمایا جائے حضورؑ

نے دریافت فرمایا کہ آپ کی نگاہ میں کوئی موزوں رشتہ ہے؟

آپ نے فوراً جواب دیا "حضور یہ قدرت اللہ خان صاحب کی لڑکی سے شادی کرا دیں۔ (حالانکہ محترمہ صفیہ بیگم صاحبہ کو اس سے پہلے دو جگہ سے طلاق ہو چکی تھی) حضورؓ نے خان صاحبؓ سے ذکر کیا تو وہ انکار کر گئے۔ دلیل یہ دی کہ نو مسلم کو بیٹی نہ دوں گا پتہ نہیں کون ہے۔

جب شیخ صاحبؓ کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے دعا شروع کر دی۔ جواباً آپ کو الہام ہوا۔ کہ "اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلاً" کافی ردّ و کد کے بعد آخر کار یہ رشتہ طے ہو گیا۔

(مصباح اگست ۱۹۶۱ء)

حضرت اُمّ المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک مبشر خواب

حضرت اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا کی تدفین سے واپس آ کر دل بڑا بوجھل معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے حسب عادت کتابوں سے دل بہلانا چاہا۔ اتفاق سے مجھے حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الاوّل کی وہ قلمی بیاض نظر آ گئی جس مین حضرت ممدوح نے کچھ اپنی یادداشتیں درج کی ہوئی ہیں اور کچھ تاریخ وار حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام کی مجلس میں حضور کے فرمودہ کلمات طیّبات مرقوم ہیں۔

یہ بیاض میرے پاس کس طرح آئی؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ بیاض اور اس کے ساتھ کی ایک اور بیاض دونو حضرت خلیفہ اوّلؓ نے کسی وقت خوش ہو کر جناب محترم مرزا محمود بیگ صاحب آف پٹی ضلع لاہور کو عنایت فرمائی تھیں۔ مرزا موصوف کے پاس عرصہ تک یہ بیاضیں پڑی رہیں ۱۹۲۳ء میں میرے والد چوہدری نعمت اللہ صاحب گوہر بی۔اے اور جناب مرزا صاحب موصوف گوجرہ ہائی سکول میں ملازم تھے (ویسے بھی ہم پڑوسی تھے) ایک دن مرزا صاحب نے خوش ہو کر دونوں بیاضیں والد صاحب کو دکھائیں اور فرمایا کہ ایک بیاض آپ لے لیں۔ میں آپ کو خوشی سے دیتا ہوں۔ والد صاحب نے ایک بیاض ان میں سے اُٹھالی جو عرصہ تک قادیان میں کسمپرسی کی حالت میں پڑی رہی۔

ایک دن میں نے اُسے غور سے جو مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو نہایت قیمتی باتوں سے پُر ہے۔ چنانچہ میں نے اُسے حفاظت سے رکھ لیا اور ۳؍ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جب ہمیں گھروں سے نکالا گیا تو میں نے صرف یہی چیز گھر سے اُٹھائی اور چل پڑا۔

اس بیاض میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعض غیر مطبوعہ الہامات بھی درج ہیں۔ غرضیکہ یہ نہایت ہی قیمتی اور نایاب تحفہ ہے جسے کئی بزرگان سلسلہ نے دیکھ کر حظ اُٹھایا ہے، مشورے بھی دیئے ہیں اور اس کو محفوظ کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں مگر عملی طور پر اگر اسے ایک قومی عجائب خانہ بنا کر مع دیگر تبرّکات کے اسے بھی وہاں رکھ دیا جائے تو عین مناسب ہوگا۔ ابھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام، حضرت خلیفہ اوّلؓ، حضرت نواب محمد علی خانؓ صاحب اور بے شمار دیگر بزرگان جماعت کے تبرکات اور یادگاریں اچھی طرح سے محفوظ ہیں۔ اگر ان میں سے تھوڑا تھوڑا بھی جمع کیا جائے تو یقیناً ایک اوسط درجے کے عجائب خانہ کو سجایا جا سکتا ہے۔ اگر جلد کوئی موثر قدم اس سلسلہ میں اٹھایا جائے تو سب سے پہلے راقم الحروف اس تحفے کو پیش کر دیگا۔

خیر یہاں تک تو جملہ معترضہ تھا اب اصل بات کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اسی بیاض میں ۱۸۹۳ء کے واقعات میں ایک جگہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ نے حضرت ام المومنین نوّر اللہ مرقدہا کا ایک نہایت ہی مبشّر خواب درج کیا ہے جو ہدیہء قارئین کرتا ہوں۔ پہلے اصل عبارت کا عکس دیا جاتا ہے اس کے بعد وہی عبارت صاف الفاظ میں درج

ہے تا کہ پڑھنے میں آسانی رہے:۔

''حضرت کے گھر میں خواب ہوا کہ ایک عورت ہے اور اس کے ساتھ بہت لڑکے اور لڑکیاں ہیں اسے جب پوچھا گیا کہ تو کون ہے تو اس نے کہا کہ میں عیسےٰ کی بیٹی ہوں مسلمان ہونے کے واسطے مرزا جی کے پاس آئی ہوں ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت عیسائی مسلمان ہوں گے۔''

یہ درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بیاض کے ساتھ والی دوسری بیاض گذشتہ ملکی فسادات میں بمقام پٹی ضلع لاہور ضائع ہوگئی ہے۔

(ماہنامہ مصباح مئی ۔جون ۱۹۵۲ء)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک مخلص خادم کا ذکرِ خیر

میاں چراغ دین قادیانی رضؓ

قادیان میں خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے حضرت مہدیؑ آخر زمان علیہ السلام کو مبعوث فرما کر بہتوں کی ہدایت کا موجب بنایا۔لیکن قادیان کے اکثر باشندے محروم ہی رہے سوائے گنتی کی چند سعید روحوں کے۔ بلکہ قادیان کے ہندوؤں نے تو صدہا نشان دیکھ کر بھی خاموش رہنا پسند کیا۔اور تو اور ملاوامل کو ہی دیکھ لیں آخر تک حضرت اقدس کے ساتھ نشست و برخاست رہی۔ اپنی ذات میں زبردست نشان دیکھا۔حضورؑ نے ۱۹۰۷ء میں ''قادیان کے آریہ اور ہم'' ایک رسالہ لکھ کر ان لوگوں پر حجت تمام کی مگر سب اپنے مذہب پر ہی قائم رہے۔

قادیان کے مسلمان باشندوں میں سے چار پانچ اشخاص کے سوا حضرتؑ کو کسی نے قبول نہ کیا۔ان سعادت مندوں میں سے ایک میاں چراغ دین بھی تھے۔ان کا گھر سید محمد علی شاہ صاحب رئیس قادیان کے گھر کے بالکل سامنے تھا۔یہ بچپن سے ہی حضرتؑ کے خادم رہے۔

مکرم میاں چراغ دین صاحب درمیانہ قد، سادہ طبع، نرم گفتار شرمیلے اور دیانت دار آدمی تھے۔ان کی بیعت ۱۹۰۵ء سے بہر حال پہلے کی ہے۔میاں چراغ دین صاحب کے ساتھ حضرت کے اندرونِ خانہ ایک لڑکی مہتاب بی بی کام کرتی تھی۔جب یہ دونوں جوان ہو گئے تو حضور نے ان دونوں کی شادی کرا دی اور وہ حسبِ دستور حضورؑ کی خدمت کرتے رہے۔ایک دن مہتاب بی بی نے خواب میں دیکھا کہ وہ اور ان کے شوہر میاں چراغ دین دونوں جنت میں بھی حضرت مسیح موعودؑ کی خدمت کرتے ہیں۔صبح اٹھ کر یہ خواب مہتاب بی بی نے حضرتؑ کو سنایا۔حضور نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ قادر ہے۔اس میں کیا مشکل ہے؟''

میاں چراغ دین کے حالات بڑے دلچسپ ہیں۔حضور علیہ السلام ایک دفعہ لدھیانہ تشریف لے گئے تھے۔بارش ہو کر تھمی تھی۔حضورؑ سیر کو چلے میاں چراغ دین اس وقت نوعمر اور بہت شوخ تھے۔چلتے چلتے گر پڑے۔منشی ظفر احمد نے کہا کہ ''اچھا ہوا یہ بڑا شریر ہے'' حضرت نے چپکے سے منشی صاحب کے کان میں فرمایا کہ ''بڑے بھی گر جاتے ہیں---!'' یہ سن کر منشی ظفر صاحب گھبرا گئے اور رونے لگ گئے مگر حضورؑ نے تسلی دی کہ ''آپ کو میں نے نہیں کہا۔آپ تو ہمارے ساتھ ہیں۔''

(روایات منشی ظفر احمد صاحب صفحہ ۱۳۵ روایت نمبر ۱۰۸)

ایک دفعہ دھیانہ میں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔منادی ہو رہی تھی میاں چراغدین نے آ کر کہا کہ پوریاں اور حلوہ خوب

کھایا کرواس سے ہیضہ نہیں ہوگا۔ اس نے زنانے میں آ کر یہ کہہ دیا۔ دراصل انہوں نے مذاق کیا تھا۔ حضرتِ اقدسؑ کچھ روپے لے کر باہر تشریف لائے اور مولوی عبدالکریم صاحبؓ سے فرمایا کہ ''دوستوں کو حلوہ پوری کھلایا جائے کیونکہ چراغ کہتا ہے کہ ایسی منادی ہو رہی ہے۔'' مولوی عبدالکریم صاحبؓ نے عرض کیا کہ ''چراغ تو شریر ہے یہ چیز تو ہیضے کے لئے مضر ہے چراغ نے تو ایسے ہی کہہ دیا ہے۔'' آپ نے فرمایا۔ ''ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے شاید کوئی نئی تحقیق ہوئی ہو۔'' پھر آپ اندر تشریف لے گئے بعد میں منشی ظفر احمد صاحب نے چراغ کو ڈانٹا تو وہ کہنے لگے کہ مجھے کیا خبر تھی کہ حضرت جی اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔''

(الحکم۔ ۲۸ مارچ ۱۹۳۴ء)

ایک دفعہ ایک عالم آدمی قادیان میں بارہ نمبرداروں کے ساتھ آیا۔ وہ صرف تحقیق کے لئے آیا تھا۔ ایک رات منشی ظفر احمد صاحب کو کہنے لگا کہ ''مرزا صاحب کی عربی تحریریں بہت پایہ کی ہوتی ہیں۔ ضرور انہوں نے کوئی عرب ملازم رکھے ہوئے ہوں گے جو لکھ کر دیتے ہوں گے۔''

منشی ظفر احمد صاحب نے کہا کہ ''ہاں دو علماء رات کو ہوتے ہیں ایک تو حافظ معین الدین صاحب اور دوسرے مولوی محمد چراغ صاحب'' حضرت اقدسؑ بھی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ حضور بہت ہنسے۔ اگلے دن وہی مولوی پھر آیا تو حضورؑ نے منشی صاحب سے فرمایا کہ ''انہیں وہ دونوں علماء دکھا تو دیں۔'' منشی صاحب نے چراغ دین اور معین الدین کو بلا کر مولوی صاحب کے سامنے کھڑے کر دیئے۔ چراغ ایک ان پڑھ باقندہ تھا اور معین الدین ایک نابینا فقیر جو حضرتؑ کے پاؤں دبایا کرتا تھا۔ اس پر مولوی صاحب کے شکوک دور ہو گئے اور بیعت کر لی۔

(روایت منشی ظفر احمد صاحب صفحہ ۵۱۔ ۱۰۸ سیرۃ المہدی حصہ اول روایت ۷۷)

ایک دفعہ دو عیسائی مشنری عورتیں بٹالہ سے قادیان آئیں۔ انہوں نے ہرچووال جانا تھا جو سات میل آگے ہے مگر سواری نہ ملتی تھی وہ حضورؑ کے مکان پر آ گئیں چراغ نے اندر جا کر حضرتؑ کو اطلاع دی۔ حضورؑ نے پوچھا۔ ''وہ کیا چاہتی ہیں؟'' چراغ نے جواب دیا کہ ''بحث کرنے آئی ہیں۔'' حضورؑ نے باہر کرسیاں بچھوا دیں۔ جب باہر تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ انہیں سواری کی ضرورت ہے حضورؑ نے کنہیا لال سے کہہ کر انتظام کروا دیا۔

واپس جا کر جب چراغ سے دریافت کیا کہ ''تمہیں کیسے پتہ لگا تھا کہ یہ عورتیں بحث کرنے آئی تھیں؟'' تو اس نے جواب دیا کہ ''آپ کے پاس اور آتا ہی کون ہے؟''

(سیرۃ المہدی جلد دوم صفحہ ۵۷)

ایک دفعہ حافظ حامد علی صاحب کو حضورؑ نے روپے دیئے کہ بازار سے گھی لے آؤ۔ انہوں نے گھی کا ٹین میاں چراغ کو اُٹھوا دیا۔ بارش ہو کر تھمی تھی۔ چراغ اس وقت موجودہ دفاتر صدر انجمن احمدیہ کے سامنے سے گذر رہے تھے کہ پاؤں پھسلا اور گھی ضائع ہو گیا۔ وہ روتے ہوئے حضورؑ کے پاس پہنچے حضورؑ نے انہیں تو کچھ نہ کہا، مگر حامد علی کو

فرمایا کہ ”یہ آپ کا کام تھا دیکھئے نقصان ہو گیا۔“
تب اور پیسے دیئے کہ گھی لے آئیں۔
بعد میں میاں چراغ کو مدرسہ احمدیہ میں چپراسی کی خدمت دی گئی کچھ تنخواہ مل جاتی تھی اور کچھ بورڈنگ کا کام کرنے کے عوض کھانا مل جاتا تھا۔ وہیں سے پینشن پائی۔
تقسیم ملک کے بعد ربوہ آگئے۔ یہاں آکر ان کی اہلیہ مہتاب بی بی ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو فوت ہو کر بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئیں۔
میاں چراغ کو بہت صدمہ ہوا۔ عمر کے تقاضا کی وجہ سے ٹانگ پر فالج ہو گیا۔ اپنی بیوی کا خواب یاد تھا۔ ایک دن لنگڑاتے ہوئے دفتر بہشتی مقبرہ جا کر کہا کہ میری بیوی کی قبر کے ساتھ والی زمین میرے لئے ریزرو کردی جائے وہاں کے کارکن میاں چراغ کو نہ جانتے تھے انہوں نے مایوس واپس بھجوا دیا۔ وہاں سے سیدھے حضرت میاں بشیر احمد صاحبؓ کے گھر پہنچے اور تمام واقعہ بیان کیا۔
حضرت میاں صاحبؓ نے دفتر بہشتی مقبرہ کو لکھا کہ میاں چراغ حضرت اقدسؑ کا بچپن سے قدیمی خادم ہے۔ اس کی بیوی کے خواب اور حضرت اقدسؑ کے ارشاد کا میاں صاحبؓ کو علم تھا۔ چنانچہ وہ جگہ میاں چراغ کے لئے ریزرو کردی گئی۔
یہ واقعہ مجھے میاں چراغ نے خود سنایا اور بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ آخر کار ۱۵ راگست ۱۹۶۱ء کو میاں چراغ نے وفات پائی اور اپنی بیوی کے پہلو میں دفن ہوئے۔
بہر حال میاں چراغ جو بنیادی طور پر ان پڑھ اور بظاہر کچھ بھی نہ تھے حضرت مسیح موعودؑ کی خدمت واطاعت اور حضورؑ کے فیضان سے بار یاب ہوئے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح نوازا اور ان کا انجام بخیر ہوا۔

”خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را“

(ماہنامہ خالد اپریل ۱۹۷۶ء)

حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل صاحبؓ

پنجاب کا ضلع گجرات ہمیشہ سے علم وفضل میں ممتاز رہا ہے۔اس میں صدہا ادیب۔شاعر۔عالم۔قاری۔فقیہہ ہو گزرے ہیں۔مگر یہ شرف صرف حضرت مولوی امام الدین صاحب کو ہی حاصل ہوا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر کے اوّلین میں شمار ہوں۔اُن کے کتنے ہی شاگرد اپنی اپنی جگہ پر خود استاد شمار ہوئے۔جیسے مولانا غلام رسول راجیکیؓ۔اور پروفیسر قاضی فضل حق وغیرہم۔

مولوی امام الدین صاحب ۴محرم ۱۲۶۸ ہجری میں بمقام گولیکی پیدا ہوئے۔تاریخی نام چراغ دین نکلا۔آپ کو ایک ہی شوق تھا کہ اُن سے کوئی علم حاصل کرے۔یہی شوق عرصہ تک ان کو قادیان کی متفرق کلاس میں لئے پھرا۔آپ کی اہلیہ صاحبہ کا نام مریم بیگم تھا۔آپ کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے قاضی محمد ظہور الدین اکمل اور چھوٹے محمد نور الدین اجمل۔

قاضی اکمل صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے والد سے حاصل کی مگر کثرت مطالعہ کے باعث تپدق ہو گیا جس سے جسم نہایت نحیف ہو گیا۔تعلیم ترک کر دی مگر شفاء کامل نہ ہوئی۔

مولوی امام الدین صاحب بیعت کے بعد قادیان گئے اور حضرت مسیح موعود السلام سے دُعا کے لئے بھی عرض کیا کہ بچے کو شفاء ہو جائے۔نیز حضورؑ کا پس خوردہ بھی لا کر ان کو کھلایا تو برسوں کا پرانا مریض اچھا ہو گیا۔اور کیوں نہ ہوتا ؎

جس پر نظر لطفِ مسیح دوسرا ہو
برسوں کا ہو بیمار تو اک دم میں شفاء ہو

(انیس)

تاہم بیماری اپنے اثرات ایسے چھوڑ گئی کہ ساری عمر سرکنڈے کی مانند ہی رہے۔

اس کے بعد قاضی صاحب ہجرت کر کے مستقل طور پر قادیان چلے گئے۔چونکہ خاکسار کے والد مولوی نعمت اللہ گوہر نے دسمبر ۱۹۰۶ء میں بیعت کی تھی اور قادیان میں ہی رہائش کر لی تھی اور شاعرانہ طبیعت اور مزاج کے رُو سے بھی اکمل صاحب سے بہت قریب تھے اُن کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے۔والد صاحب کے تعلق سے مجھ پر بھی بہت شفقت فرماتے تھے اور ۱۹۳۱ء میں تو خاکسار کو ان کے ماتحت دفتر ناظم اشاعت میں کام کرنے کا موقعہ ملا۔اس لئے قاضی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔

اُسی زمانہ میں قادیان میں لائبریری کا انتظام کچھ ایسا بہتر نہ تھا۔کتب تو تھیں مگر تازہ اخبارات نہیں آتے تھے۔اُدھر قاضی صاحب چونکہ رسالہ ریویو اُردو۔ریویو انگریزی۔سن رائز۔الفضل۔مصباح اور احمدیہ گزٹ کے منیجر تھے تبادلے میں اخبار اور رسائل بہت آتے تھے۔اس لئے اہل ذوق احباب قاضی صاحب کے دفتر میں جمع

ہو جاتے ۔ اخبارات کے ساتھ ساتھ تبادلہ خیالات بھی ہو جاتا تھا۔مختلف مسائل اور روزمرہ کے حالات پر تبصرہ ہوتا اورلوگ قاضی صاحب کے علم وفضل سے متمتع ہوتے ۔شعروشاعری کے تذکرے بھی رہتے ۔لطائف بھی خوب ہوتے قاضی صاحب کا کمال یہ تھا کہ ان سب باتوں کے باوجود دفتری نظام میں اک ذرہ خلل نہ ہوتا۔سکون سے تمام کام وقت کے اندر ہو جاتے ۔سوائے اس عاجز کے دیگر تمام کلرکوں کو علمی ،سیاسی ۔ادبی مسائل سے قطعاً سروکار نہ تھا خاکسار نے اس مجلس سے کماحقہٗ فائدہ اٹھایا۔

اس مجلس کے شرکاء عموماً میر محمد اسحٰق صاحب ۔مولوی جلال الدین شمسؔ صاحب ۔مولوی تاج دین صاحب ۔حافظ سلیم احمد صاحب ۔مولوی عبدالمنان عمرؔ صاحب ۔مولوی محمد یعقوب صاحب ۔ مولوی عبدالغفور صاحب ۔مولوی علی محمد صاحب اجمیریؔ ۔اورمولوی عبدالاحد صاحب ہزاروی ہوتے تھے۔ ایک طرح سے یہ شہر کا ادبی ۔سیاسی ۔ثقافتی سنٹر تھا۔کوئی علم وادب کا شوقین اس مجلس سے علیحدہ نہیں رہ سکتا تھا۔

قاضی صاحب حساب کتاب کے بڑے صاف تھے اور پوری احتیاط برتتے تھے باوجود کہ آپ کے ماتحت الفضل ۔مصباحؔ ۔سن رائیز (ہفتہ وار) ریویوانگریزی ۔ریویواُردو اوراحمدیہ گزٹ تھا۔تمام کام مشین کی طرح وقت پر سرانجام پاتے ۔مثلاً الفضل میں تین کلرک تھے ۔خواجہ عبدالرحمٰن صاحب کشمیری ۔منشی امیر محمد صاحب ساکن کھارہ۔اکاؤنٹنٹ اورمرزا عبدالعزیز چٹ کلرک ۔مصباح اورریویواُردو مرزا عبدالحمید کے پاس تھے اورمیرے پاس ریویوآف ریلیجنز انگلش اور ہفتہ وارسن رائز مع تمام انگریزی۔ خط وکتابت ۔پہلے دن مجھے قاضی صاحب نے چندمنٹ میں اس طرح کام سمجھادیا کہ پھر میں ریل کی طرح چلتا رہا۔(یعنی اس کام کو بخوبی سرانجام دیتا رہا)۔

قاضی صاحب کا گھر چونکہ دفتر سے ملحق تھا وہ عموماً دفتر سے چندمنٹ قبل پہلے آکر خود صفائی وغیرہ کا معائنہ کرتے ۔ ہمیشہ ایک بڑے تخت پر لیٹے رہتے ۔اُس تخت پر موٹے موٹے گدے ہوتے اور ایک بڑا سا گاؤ تکیہ تخت کے ایک سرے پر پڑا ہوتا تھا اُس کے سہارے قاضی صاحب لیٹے ہوئے تمام دفاتر کا کام بھی دیکھتے ۔لوگوں سے باتیں بھی کرتے ۔مشورے بھی دیتے ۔علمی مضامین خود لکھتے اور دوسروں کو اصلاح دیتے ۔ میں نے تو اکثر ان کو بیمار ہی دیکھا۔کبھی سردرد،کبھی کمر میں درد،کبھی اعضاء شکنی ۔ایک دن باہر آئے تو پیشانی پر کچھ دوائی لگی تھی۔ میرے دریافت کرنے پر کہنے لگے کہ رات بھر نیند نہیں آئی ۔اعصابی درد رہا۔اب دارچینی لگائی ہے شاید کچھ آرام آجائے ۔ اتنے میں ان کے دوست محمد امین خاں (مبلغ بخارا) آگئے ۔اُن کو دیکھ کر ہنسے اور کہا خانصاحب رات بھر نیند تو نہیں آئی مگر تمہارے متعلق ایک شعر ہو گیا ہے۔میری طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا

جو قادیان سے چل کر پہنچ گیا باکو[1]
یہی یہی ہے محمد امین خاں ڈاکو

[1] بحیرہ کیسپین کے کنارے باکو تیل اور مچھلی کی تجارت کے لئے مشہور بندرگاہ ہے۔محمد امین خان صاحب اسی طرف گئے تھے۔

اس پر سارے ہی بے اختیار ہنسنے لگے۔

قاضی صاحب کی عادات بہت سادہ تھیں ۔علاوہ دفتری فرائض کے مرزا عبدالحمید مرحوم کا یہ بھی کام تھا کہ گھر کا سودا سلف لا دینا۔ دوپہر کو عموماً دال پکتی تھی کیونکہ جب دال بگھاری جاتی تو خالص گھی کی خوشبو دفتر تک پہنچتی تھی ۔شام کو عموماً گوشت اور سبزی ۔لباس گرمیوں میں سلوار قمیض اور سر پر رومی ٹوپی ۔سردیوں میں صدری کے علاوہ گرم کوٹ اور پشمینے کی چادر جس سے پاؤں ڈھانپ کر لیٹے رہتے۔

قاضی صاحب وقت کے سختی سے پابند تھے ۔اس پر خود بھی عمل کرتے اور دوسروں سے بھی توقع رکھتے ۔کبھی یہ نہ ہوا کہ چار بج جائیں اور ہم دفتر کا کام کر رہے ہوں ۔اس زمانہ میں چار گھڑیاں پابندی وقت کے لئے بہت مشہور تھیں ۔ماسٹر عبدالرؤف صاحب بھیروی کی گھڑی ۔ بھائی غلام قادر صاحب سیالکوٹی اور ان کے برادر اصغر منشی محمد اسمٰعیل صاحب اور چوتھے قاضی صاحب کی گھڑی ۔اُس زمانہ میں ہندوستان کا معیاری ٹائم مدراس ٹائم کہلاتا تھا۔۴ بجے سے آدھ منٹ قبل ہر تار گھر میں مدراس سے ٹائم نشر ہوتا تھا۔عموماً گھڑی مجھے دے کر بھجواتے کہ مدراس ٹائم سے مطابق کرلاؤں۔

قاضی صاحب کا خط نہایت ہی پاکیزہ تھا بڑی سرعت سے لکھا کرتے تھے ۔خط کا اصول یہ ہے کہ اُس میں سرعت ہو۔ پھر وہ پڑھا جا سکے اور تیسرے حروف میں تناسب اور خوبصورتی ہو۔ قاضی صاحب کے خط میں یہ باتیں بدرجہ اتم موجود تھیں ۔مجھے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ تم میں اور مجھ میں ایک قدر مشترک ہے کہ تم بھی بہت تیز لکھتے اور خط بھی خوبصورت ہوتا ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ ایسا دُبلا پتلا نحیف جسم کا انسان جس کی کوئی نہ کوئی چُول ہمیشہ ڈھیلی رہتی تھی ۔باوجود اپنی تمام بیماریوں، نقاہتوں اور مصروفیتوں کے خوب زندہ دل تھا۔

علاوہ دفاتر کے ضیاء الاسلام پریس کی نگرانی بھی قاضی صاحب کے سپرد تھی ۔متعدد کاتب رسائل اور اخبار وغیرہ لکھتے ۔اُن کے پروف نکلوا کر پڑھتے ۔اُن کی اجرتوں کا حساب رکھنا۔ مشینوں کے پُرزوں سے خوف واقفیت تھی۔ پریس کی مشین خراب ہوجاتی تو خود سر پر جا کر کھڑے ہوجاتے اور جب تک مناسب درستی نہ ہو جاتی وہاں سے نہ ٹلتے۔

میں نے لمبے عرصہ تک دفتر میں کام کیا آخر میں صدر انجمن احمدیہ نے اعتراض کر دیا کہ یہ میٹرک پاس نہیں ہے لہٰذا اس کو فارغ کر دیا جائے اور دو ماہ کی تنخواہ بھی روک لی جو ۔/۶۰ روپے تھی ۔قاضی صاحب نے مجھ سے چارج لے لیا اور کہا تم فکر نہ کرو تمہیں تنخواہ گھر بیٹھے آئے گی۔

کچھ دنوں بعد مجھے راستے میں مل گئے اور ہدایت فرمائی کہ اب حضرت خلیفہ ثانیؓ کو لکھ دو۔ میں نے اُسی وقت دو چار سطور میں لکھ دیا کہ میری اُجرت مجھے نہیں ملی اور یہ خط دفتر ڈاک کے بکس میں ڈال کر خود مولوی احمد خاں نسیم صاحب کے ہمراہ قادیان سے قریبی نہر پر سیر کھانے چلا گیا ۔شام کے قریب واپس آیا تو آگے مرحوم قاضی عبدالرحمٰن

صاحب مل گئے اور ناراضگی سے کہنے لگے تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ تم نے مصیبت میں ڈال دیا ہے حضورؓ نے حکم دیا ہے کہ آج دفتر بند نہ ہوں جب تک اس کی اُجرت ادا نہ ہو جائے۔لو۔/۶۰ روپے اور رسید لکھ دو۔اگلے دن میں نے یہ بات قاضی صاحب سے جا کر کہہ دی۔بڑے خوش ہوئے۔

تقسیم ملک کے بعد قاضی صاحب اپنے چھوٹے بیٹے عبدالرحیم صاحب شبلی کے پاس نمبر ۷ اردو بازار عقب انارکلی میں عرصہ تک مقیم رہے۔پھر ربوہ آ گئے۔یہاں پر پرانے احباب اکثر قاضی صاحب کی خدمت میں جا کر بیٹھتے۔اُن کا جی لگا رہتا تھا۔کبھی دو تین ماہ کے بعد مرزا عبدالحمید کے ہمراہ بازار اور دفاتر کا چکر لگاتے۔صاحبزادہ مرزا عزیز احمد صاحب میں یہ خوبی دیکھی کہ وہ روزانہ قاضی صاحب کے پاس جاتے۔کچھ دیر باتیں کرتے جس سے اُن کو اطمینان قلب ہو جاتا تھا۔

قاضی صاحب کی یادگار دو لڑکے قاضی عبدالرحمٰن جنید بی۔اے اور عبدالرحیم صاحب شبلی ہیں۔اول الذکر اب تو فوت ہو چکے ہیں دوسرے زندہ ہیں۔پاکستان کے مشہور صحافی ہیں مگر جماعت احمدیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ویسے کبھی کبھی عزیزوں سے ملنے آیا کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کا کلام نغمہ اکمل کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

یہاں پر قاضی صاحب کی اہلیہ کا ذکر کرنا موزونیت سے خالی نہیں ہے۔ان کا نام سکینۃ النساء تھا جو قاضی صاحب کے ماموں کی بیٹی تھیں۔دیہاتی رواج کے مطابق چار ۴ سال کی عمر میں ان کی شادی ہو گئی تھی مگر رخصتانہ ۱۹۰۷ء میں ہوا۔ساس کے لئے چکی پیسنا، والد اور خسر سے تعلیم حاصل کرنا۔کنویں سے پانی بھر کر لانا۔کھیتوں سے ساگ پات لانا۔مویشیوں کے لئے چارہ لانا کام تھا۔اس کے ساتھ ساتھ لاہور کے زنانہ رسالہ تہذیب النسواں میں مضامین بھی شائع کرواتیں۔اس کے علاوہ عصمت دہلی اور البدر اور الحکم قادیان میں بھی کبھی کبھی لکھتی تھیں۔

قادیان آ کر عورتوں کو جمع کر کے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی۔ایک برائے نام سا سکول بھی جاری کیا۔حضرت خلیفۃ اولؓ نے فرمایا۔"تم سکول سنبھالو" عذر کیا کہ مجھے ریاضی نہیں آتی۔حضرت نے فرمایا کہ "آپ چارج لے لیں۔خُدا سب کام کر دے گا۔" محلوں میں جا کر مستورات کو وعظ و نصیحت و تلقین کرتی رہیں اور کم از کم ۴۰ برس تک علاوہ اپنے گھریلو مشاغل کے پوری تندہی سے کام کیا۔بہت خوشخط تھیں۔امۃ الحئی لائبریری کی بنیاد رکھی صاحبزادی مبارکہ بیگم صاحبہؓ کی ہم سبق تھیں اور صاحبزادی امۃ الحفیظ بیگم صاحبہ کو تو خود پڑھایا تھا۔حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب (خلیفۃ المسیح الثالث) کو بھی کچھ عرصہ تک پڑھایا۔

۱۹۲۲ء میں قادیان کے زنانہ وارڈ کیلئے تحریک کی جو بعد میں چار کوارٹروں کی شکل میں مکمل ہوا۔بہشتی مقبرہ ربوہ میں مدفون ہیں۔قریشی رشید اور ارشد ان کے بھائی تھے۔

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان فروری ۱۹۷۹ء)

حضرت چوہدری نعمت اللہ خان گوہر (۱۸۸۰ - ۱۹۵۵)

ولادت و تعلیم :۔ حضرت چوہدری نعمت اللہ گوہر صاحب ۱۸۸۰ عیسوی میں لدھیانہ کے دور افتادہ گاؤں ہٹھور میں ایک غریب راجپوت خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد صاحب کا نام حکیم تھے خان تھا۔

حضرت چوہدری نعمت اللہ صاحب نے ۱۸۹۶ء میں میٹرک کا امتحان جگراؤں ہائی سکول سے پاس کیا۔ جس پر ۱۵ روپے ماہوار وظیفہ بھی ملا۔ آپ نے مہندرہ کالج پٹیالہ میں داخلہ لے لیا لیکن کسی غلطی کی وجہ سے امتحان دینے پر پابندی لگا دی گئی۔

بیعت :۔ کالج کی تعلیم تو اب بند ہوگئی مگر ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم خلیفہ سید محمد حسن صاحب کے عزیزوں ریاست کے محکمہ بندوبست میں سپریٹنڈنٹ کے طور پر تقرری کروادی۔ وہاں کسی نے آپ کو مولوی ثناء اللہ صاحب کی کتاب ''الہامات مرزا'' مطالعہ کے لئے دی۔ پڑھ کر بہت حیران ہوئے کہ یہ مرزا صاحب کون ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تمام دنیا میں حضرت مہدی علیہ السلام کا انتظار ہو رہا تھا۔ آپ سنایا کرتے تھے کہ ان کے پردادا حکیم خدا بخش صاحب جب جگراؤں سے ہٹھور آتے تو پوچھا کرتے تھے کہ سناؤ کہیں حضرت مہدی علیہ السلام کی خبر بھی سنی؟؟

محکمہ بندبست میں ان دنوں حضرت منشی عبداللہ صاحب سنوری اور ان کے فرزند منشی رحمت اللہ صاحب پٹواری کے طور پر کام کرتے تھے۔ انہوں نے جب اپنے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو مرزا صاحب کے بارے میں تفتیش کرتے دیکھا تو ان کو بتایا کہ قادیان ضلع گورداسپور میں ایک بزرگ نے مہدی اور مسیح موعودؑ کا دعویٰ کیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے مامور کیا ہے۔ ساتھ ہی مطالعہ کے لئے حضرت اقدس کی کتابیں بھی دیں۔ اخبار الحکم ان کے پاس آتا تھا وہ بھی دیا کرتے۔ کیونکہ آپ کے ذہن میں ان کے دادا حکیم خدا بخش صاحب نے ڈالا ہوا تھا مہدی کا ظہور ہونے والا ہے۔ لہذا مطالعہ سے آپ کو یقین ہوگیا کہ مہدی قادیان میں مبعوث ہو چکے ہیں۔ چنانچہ آپ منشی عبداللہ صاحب سنوری سے مزید معلومات کے بعد اپنی اہلیہ صاحبہ کو ساتھ لے کر قادیان گئے اور بیعت کر لی۔ آپ کی شادی کے فوراً بعد آپ کی والدہ وفات پا گئی تھیں۔ آپ نے بیعت ۱۹۰۵ء میں کی۔ حضرت اقدس کی صحبت سے اتنا متاثر ہوئے کہ واپس ملازمت پر جانے کا خیال بھی نہ رہا۔ لہذا وہ نوکری چھوڑ کر گاؤں آ گئے۔

بھائیوں کی بیعت :۔ گاؤں واپس آ کر اپنے دونوں بھائیوں علی محمد اور عطاء محمد کو پیغام سنایا اگرچہ کم عمر تھے لیکن بڑے بھائی کی اطاعت میں بیعت کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ چنانچہ ان دونوں کی بیعت کا خط لکھ دیا گیا۔ جس کا

جواب ۱۵ دن کے اندر آ گیا۔اس کے بعد بہن اور بہنوئی اور دوسرے رشتہ داروں کو پیغام حق سنایا۔لیکن ان لوگوں نے قبول نہ کیا لیکن کوئی مخالفت بھی نہ کی۔ملازمت تو ختم ہو چکی تھی اور گھر کی ذمہ داریوں کا احساس بھی تھا۔زمین سے واجبی سی فصل آتی تھی جس سے گزارہ مشکل تھا اسی ادھیڑ بن میں ایک اشتہار دیکھا کہ چنیوٹ میں مڈل سکول کے لئے استاد چاہیئے۔آپ نے فوراً درخواست دے دی اور آپ کو منتخب کر لیا گیا۔یہاں پر آتے ہی ڈھونڈ کر جماعت احمدیہ سے رابطہ کیا اور باقاعدگی سے نمازیں وہاں ادا کرنے لگے۔شیخ مولا بخش صاحب،حاجی تاج محمود صاحب اور دیگر احمدیوں سے گہرے تعلقات ہو گئے۔مگر شہر کے متعصب لوگوں نے اس بات کو پسند نہ کیا اور مجبور کیا کہ مستعفی ہو جائیں۔یہاں سے قریب ہی چک جھمرہ کے پاس ایک چک میں شیعہ گھرانے کے دولڑکوں کو تعلیم دینے کے لئے چلے گئے۔لیکن طبیعت نہ لگی۔چنیوٹ میں مکالفت کی وجہ سے قادیان کے لئے تڑپ بڑھ گئی اور آخر کار اکتوبر ۱۹۰۷ء میں قادیان آ گئے۔ان کا گھر شیخ یعقوب علی عرفانی صاحب کے مکان کے قریب تھا۔آپ جب بمعہ اہلیہ صاحبہ ۱۹۰۵ء میں پہلی مرتبہ بغرض بیعت قادیان آئے تو انہی کے گھر مہمان ٹھہرے تھے۔اس لئے ان سے بڑے گہرے روابط ہوئے۔آپ نے ستمبر ۱۹۰۶ء کو اپنے چھوٹے بھائیوں علی محمد اور عطاء محمد کو جو بالترتیب ساتویں اور چھٹی جماعت میں تھے قادیان بھجوا دیا تھا۔علی محمد اور عطاء محمد دونوں بھائیوں کی والدہ کی وفات کے بعد باپ کیطرح ان کی پرورش کی اور خود مشکلات اور صعوبتیں برداشت کر کے علی محمد کو B.A.BT کی اعلیٰ تعلیم دلوائی اور ان کو کسی قسم کا احساس نہ ہونے دیا کہ والدین انتقال کر گئے ہیں۔اور علی محمد اپنے بڑے بھائی کے احسان کو زندگی بھر بھلا نہ پائے۔جب کبھی ابا جان کا ذکر ہوتا تو ان کی آنکھیں بھر آتیں اور کہتے کہ اگر بڑے بھائی (گوہر) کی محبت،عنایات،شفقت اور ایثار نہ ہوتا تو شاید میں اس مقام پر نہ پہنچتا جس پر اس رب جلیل کے فضل و کرم سے پہنچا ہوں۔اب تینوں بھائی قادیانی ہو گئے تھے۔

حضرت اقدس کی سفارش:۔ قادیان میں رہائش کے دوران حضرت اقدسؑ کے بعد آپ زیادہ تر حضرت مولوی حکیم نورالدین صاحب کی قربت میں رہتے تھے۔ایک دن انہوں نے فرمایا کہ تم تعلیم میں ترقی کیوں نہیں کرتے۔ابا جان نے امتحان پر پابندی کا سارا ماجرا بیان کر دیا اور رو پڑے۔حضرت مولوی حکیم نورالدین صاحب نے دلاسہ دیتے ہوئے ازراہ شفقت فرمایا کہ پھر حضرت اقدس سے کیوں نہیں عرض کرتے تا کہ وہ دعا فرمائیں اور آپ سے پابندی اٹھالی جائے۔

ابا جان نے کہا مجھے شرم آتی ہے۔آپ ہی مہربانی فرما کر حضرت اقدس کے حضور میری طرف سے عرض کر

دیں۔ جو آپ نے ازراہ شفقت کر دی۔

جب کچھ دن گزر گئے تو دادا جان کی بے چینی بڑھ گئی کہ حضورؑ نے کوئی توجہ نہیں فرمائی تو آپ نے ایک نظم جس کا عنوان تھا ’’صدائے فقیر‘‘ جو اخبار الحکم اور بدر میں چھپ چکی ہے۔ یہ نظم ۲۶ مارچ ۱۹۰۸ء کو حضرت اقدس کے سامنے بیت مبارک میں پڑھ کر سنائی۔ اس کے دوسرے شعر پر خوب لطیفہ ہوا۔ شعر تھا۔

کسی طبیب سے جب اپنا درد دل نہ تھما　　　تو آخرش تیرے دار الشفاء میں آئے ہیں

حضرت مولانا حکیم نورالدین صاحب نے سمجھا کہ یہ ان کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ آپ نے کھڑے ہو کر کہہ دیا ’’طبیب کو کیوں بیچ میں لپیٹ لیا۔ طبیب نے تو عرض کر دی ہوئی ہے‘‘ اس پر حضرت مسیح موعودؑ بھی مسکرا دیئے۔

جب حضرت اقدس اندرون خانہ تشریف لے جانے لگے تو آپ سامنے آ گئے۔ حضورؑ نے جناب مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ آپ گوہر صاحب کے لئے یونیورسٹی کو لکھیں کہ ان کو معاف کر دیا جائے۔ انہوں نے بھی یہ قصہ سنا ہوا تھا کہنے لگے حضور یہ بڑا مشکل امر ہے بلکہ ناممکن ہے کہ معافی ہو جائے۔ حضور نے فرمایا کہ ’’آپ لکھیں تو سہی جب خدا آسمان پر معاف کر سکتا ہے بندے زمین پر کیوں معاف نہیں کریں گے‘‘

چنانچہ مولوی محمد علی صاحب نے بیت مبارک کے اس کمرہ میں بیٹھ کر جس میں سرخ سیاہی والا نشان ظاہر ہوا تھا خط لکھا اور سفارش کی کہ ان پر سے پابندی ہٹالی جائے۔ نتیجۃً اگست ۱۹۰۸ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الاول کے عہد میں پنجاب یونیورسٹی سے پابندی اٹھانے کا مراسلہ آ گیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ نے دادا جان کے لئے بہت دعا کی تھی تو ان کو الہام ہوا کہ ’’ نعمت اللہ گوہر سے کہ دو کہ اگر بی۔ اے سے اخلاص ہے تو ایف۔ اے کا امتحان دے دے‘‘ اسی زمانہ میں آپ نے J.A.V ٹریننگ کالج لاہور سے پاس کر لیا تھا۔

امتحان ایف۔ اے:۔ ۱۹۱۶ء بطور ٹیچر مڈل مزنگ لاہور میں متعین ہوئے۔ یہاں ایک صاحب جن کا نام خیر دین برق ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کو پیغام حق پہنچاتے تھے کیونکہ وہ عیسائیت کی دلدل میں پھنس کر اپنا نام بھی K.D.Burk لکھنے لگے تھے۔ ان کا بیٹا Samuale Martin Burk دادا جان کا شاگرد تھا اور پاکستان بننے پر فارن سروس میں چلا گیا اور سفیر کے عہدہ سے ریٹائرمنٹ کے بعد لنڈن میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی ان کی میرے ساتھ خط وکتابت جاری رہی۔

حضرت گوہر صاحب نے یہاں ریاضی کا مضمون رکھ کر ایف۔ اے کا امتحان بغیر تیاری دینا شروع کر دیا

توبرق صاحب نے لکھ کت شرط لگادی تھی اس طرح تم اگر پاس ہو گئے تو میں مرزا صاحب کی بیعت کرلوں گا اور اگر پاس نہ ہوئے تو تمہاری داڑھی منڈوا دینی ہے۔ آپ کے لئے تو خلیفۃ المسیح الاوّل کی دعائیں تھیں اور الہام بھی تھا۔ چنانچہ آپ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئے۔ آپ نے برق صاحب کو کہا چلو اب قادیان تو انہوں نے نہایت عجیب فقرہ کہہ کر جان چھڑالی کہ ''یار من لیا تیرا مرزا سچا اے''

کیونکہ آپ اکثر دعوت الی اللہ کرتے رہتے تھے تو متعصب ہندوؤں نے ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر نوکری ختم کردی۔ یہاں سے آپ کو اسلامیہ مڈل سکول پونچھ ریاست کشمیر میں ہیڈ ماسٹری مل گئی۔ ۱۲۰ روپے تنخواہ مقرر ہوئی وہاں آپ ۱۹۱۸ء۔ ۱۹۱۹ء تک رہے۔ وہاں بھی دعوت الی اللہ کی وجہ سے نوکری سے نکلنا پڑا پونچھ سے احمدیہ سکول گھٹیالیاں آئے مگر یہ سکول مالی مشکلات کی وجہ سے نہیں چلتا تھا۔ وہاں سے آپ احمدیہ سکول بہلول پور چک ۱۲۷ رکھ برانچ آ گئے۔ وہاں سال بھر کے قریب رہے مگر یہ سکول بھی مالی مشکلات کی وجہ سے نہ چل سکا۔ وہاں سے آپ کو اسلامیہ ہائی سکول لائل پور میں جگہ مل گئی لیکن یہاں بھی سٹاف کو دعوت الی اللہ کرنے کی وجہ سے نوکری سے جواب مل گیا۔

بی۔اے کا امتحان:۔ جلد ہی ایم بی ہائی سکول گوجرہ میں جگہ مل گئی جہاں ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۲۶ء تک خوب کام بھی کیا اور دعوت الی اللہ بھی کی جس کے نتیجہ میں کئی افراد نے احمدیت قبول کی۔ گوجرہ میں آپ کو خیال آیا بی اے کا امتحان دیں۔ سکول سے بغیر رخصت لئے تیاری شروع کردی۔ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر حشمت خان ایم۔اے نے زور دے کر کہا دو ہندو استاد ان کو اپنے انگریزی کے مضمون لکھ کر اصلاح لیتے ہیں آپ بھی مجھے اپنے مضامین دکھالیا کریں۔ تو ابا جان نے جواب دیا کہ حشمت صاحب میں جب لکھنے بیٹھوں گا تو فرشتے میری مدد کریں گے۔ میرے متعلق تو ہمارے بزرگوں کو الہاماً بتایا گیا ہے کہ تم بے۔اے ہو جاؤ گے۔ وہ کہنے لگے میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ دادا جان نے کہا آپ کو رزلٹ سے معلوم ہو جائے گا۔

چنانچہ ابا جان نے لاہور جا کر امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ ساتھ ہی Senior Anglo Vernecular(Sav) جو بی ٹی کے برابر ہوتا ہے دے دیا اس میں بھی پاس ہو گئے۔ یعنی B.A SAV ہو گئے۔ اس طرح آپ نے حضرت مسیح موعودؑ اور خلیفۃ المسیح الاوّل کی دعاؤں سے کامیابی حاصل کی۔

مارچ ۱۹۲۶ء میں شیخ نور الٰہی صاحب انسپکٹر سکولز معائنہ کے لئے آئے۔ معائنہ کے بعد ابا جان کو ساتھ لے کر ڈاک بنگلے میں چلے گئے۔ وہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے کلاس فیلو تھے اور سلسلہ احمدیہ سے

خوب واقف تھے۔ کہنے لگے تمہارے میاں صاحب (خلیفۃ المسیح الثانی) نے یہ کفر و اسلام کی بحث چھیڑ دی مناسب نہ تھی۔ بس جناب دادا جان نے بحث شروع کر دی جو کہ رات گئے تک جاری رہی انسپکٹر صاحب جاتے ہوئے Log Book میں ابا جان کے بارے میں لکھ گئے۔

"Nimatullah Gaihar is more fit to be a missionary than a school Teacher"

جب یہ ریمارکس سید مہدی شاہ صاحب رئیس اعظم گوجرہ اور سپرنٹنڈنٹ میونسپل کمیٹی نے پڑھے تو ابا جان کو بلا کر دکھائے اور کہا شیخ صاحب آپکے بارے میں کیا لکھ گئے ہیں لہذا آپ کہیں نوکری کا بندوبست کر لیں۔

وہاں سے آپ ڈیرہ اسماعیل خان اسلامیہ ہائی سکول میں بطور سیکنڈ ماسٹر متعین ہو گئے۔ وہاں سے بھی تبدیل کر کے گجرات اسلامیہ ہائی سکول بھجوا دیئے گئے یہاں سے بھی تقریباً ایک سال کے بعد فارغ کر دیئے گئے۔ چنانچہ آپ قادیان آ گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد نواب جونا گڑھ کے پرائیویٹ سیکرٹری کو اپنے بچوں کے لئے ٹیوٹر کی ضرورت تھی چنانچہ وہاں چلے گئے۔ تنخواہ کے علاوہ کھانا اور رہائش مفت تھی۔ ایک سال وہاں رہے سومنات مندر دیکھا۔ وہ جنگل بھی دیکھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں حضرت کرشنؑ سوئے ہوئے تھے کہ کسی نے ہرن سمجھ کر دور سے زہر آلود تیر مارا جس کے اثر سے آپکا رنگ سانولا ہو گیا واپسی پر جودھ پور میں نواب چوہدری محمد دین صاحب وزیر کے پاس ٹھہرے اور خوب سیر کی۔ دہلی سے ہوتے واپس قادیان آ گئے۔

تصنیف تحفہ ہندو یورپ:۔ انہی دنوں ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں میں مڈل سکول کی ہیڈ ماسٹری مل گئی وہاں رہکر آپنے معرکۃ الارا کتاب "**تحفہ ہندو یورپ**" لکھی۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کو شائع ہوئی۔ بڑے بڑے صحافیوں نے ریویو لکھے۔ سید سلمان ندوی نے ریویو لکھا مگر تعصب کی وجہ سے بے جا اعتراض بھی کیئے۔ جس کے جواب میں **اخبار الفضل** میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر اقبال نے لکھا کہ ہمارے نیم بیدار ملک میں اس کتاب کو سمجھنے والے لوگ کم ہیں۔ آپ اس کا ترجمہ انگریزی میں کر کے لنڈن بھجوا دیں۔ چنانچہ ترجمہ لنڈن بھجوایا گیا۔ **Luzac& Co** نے اس کا معاوضہ 300 پاؤنڈ ادا کرنا چاہا مگر دادا جان نے 500 پاؤنڈ کا مطالبہ کیا۔ اس دوران ملکی فسادات شروع ہو گئے اور کرفیو لگ گیا اور قادیان والوں کو کیمپ جانے کا حکم ملا۔ وہ مسودہ گھر میں ہی رہ گیا۔ اگلے دن ابا جان کے ایک شاگرد ڈاکٹر گوربخش سنگھ نے آپکو ساتھ لے جا کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

پھیر دی نگہ یاس نے جھاڑ و دل میں

ہوشیار پور سے آپ کا تبادلہ نور پور ضلع کانگڑہ کے ہائی سکول میں ہو گیا۔ دسویں جماعت کو انگریزی پڑھایا

کرتے تھے۔وہاں ہیڈ ماسٹر ہندوؤں کے ایک جدید فرقہ رادھا سوامی (جس کا ہیڈ کوارٹر دیال باغ آگرہ تھا) کا ممبر تھا اس کو پیغام حق پہنچانے کے نتیجہ میں آپکا تبادلہ نواب صاحب ممدوٹ (ضلع فیروز پور) کے مڈل سکول میں بطور ہیڈ ماسٹر ہوگیا۔نواب قدر دان تھے۔ان کے ساتھ بہت گہرے روابط ہو گئے۔متعصب نہ تھے۔لہذا ان کی وساطت سے دعوت الی اللہ کے مواقع ملتے رہے۔

یہاں آپ کو اللہ تعالی نے دوسرا بیٹا وسیم احمد ۱۹۳۱-۱۱-۲۳ کو عطا کیا۔وسیم احمد گریجوایشن کر کے ریلوے میں سپورٹس مین کی بنیاد پر ملازمت کرتے رہے۔ریلوے کی طرف سے ''اے'' کلاس ہاکی کھیلی اور خوب نام کمایا۔تمام بڑے اخبارات میں ان کی سٹیک ورک کے بارے میں کالم چھپتے رہے۔۱۹۵۸ء میں پاکستان ہاکی فیڈریشن کی ٹیم کی نمائندگی کرتے ہوئے تمام پاکستان کا دورہ کیا۔جس کی بنیاد پر ۱۹۶۰ کی پاکستانی ٹیم برائے اولمپک (۳۳) تینتیس کھلاڑیوں کے کیمپ کے لئے چنے گئے۔لیکن سینئیر کھلاڑیوں کی وجہ سے فائنل ٹیم میں سیلیکٹ نہ ہو سکے۔ورنہ یہ پہلے احمدی ہاکی اولمپین گولڈ میڈلسٹ ہوتے اس سال ریلوے کے سووینئیر میگزین میں آپکی تصویر میں لکھا۔

Un Lucky Waseem. Who could not be selected in Pakistan Hockey Team for Olympic

اتفاق سے آج کل پاکستان ہاکی ٹیم کے کیپٹن وسیم احمد پہلے احمدی اولمپین ہیں۔(ابھی حالہیمیں وہ ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔مدیر) ۱۹۶۰ء کے اولمپک میں پاکستان کے لئے اس ٹیم نے گولڈ میڈل انڈیا کو ایک گول سے شکست دے کر جیتا تھا۔اس کے بعد آپ نے M.Ed کر کے کالج میں ملازمت شروع کر دی اب ریٹائرڈ پروفیسر کی حیثیت سے کراچی میں مقیم ہیں۔

۱۹۳۵ء میں ابا جان ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔پراویڈنٹ کی قلیل رقم ملی جس سے ایک مکان دارالبرکات قادیان میں بنا کر رہائش اختیار کرلی۔ملازمت کے دوران تمام آمدنی معمولی رقم گھر کے لئے رکھ کر چندہ ادا کرتے یا دعوت الی اللہ میں خرچ کرتے۔آپ اشتہارات اور پمفلٹ کے ذریعہ بھی پیغام حق لوگوں تک پہنچاتے رہے۔

۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم دوم شروع ہوئی تو آپ بطور Civillian Teacher فوج میں بھرتی ہو گئے۔انگریز افسروں کو اردو پڑھانا ہوتا تھا۔۳۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ۔راشن اور وردی مفت ملتی تھی۔جالندھر اور فیروز پور چھاؤنیوں میں رہے۔۱۹۴۵ء میں جنگ بند ہوئی تو واپس قادیان آگئے۔

ہجرت:۔تقسیم ملکی کے وقت بھرا ہوا گھر چھوڑ کر رات کے ایک بجے اندھیرے میں نکلنا پڑا اور تمام کتب خانہ بھی چھوڑا

جو عمر بھر کی کمائی تھی۔ معمولی کتابوں سے لے کر صحاح ستہ تک مکمل تھیں۔ قرآن مجید کے تمام انگریزی تراجم، نایاب بائبل کے مختلف ایڈیشن وغیرہ وہیں رہ گئے۔ کچھ عرصہ کھاریاں کے ہائی سکول میں ملازمت کی۔ گجرات میں سسرال والوں نے ریلوے اسٹیشن کے قریب نہایت عمدہ وسیع مکان الاٹ کرا دیا۔ مگر وہاں دل نہ لگا اور لاہور آ کر سنت نگر میں دیو سماج ہوسٹل کے ایک تنگ و تاریک کمرہ میں رہے اس واسطے کہ وہاں سے پنجاب لائبریری کوئی دو فرلانگ پر تھی۔ سارا دن وہاں گزارتے اور اپنی علمی ادبی پیاس بجھاتے رہے۔

آخر ۱۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو چند روز بیمار رہ کر انتقال کیا۔ مہاشہ فضل حسین صاحب اور ملک عبداللطیف ستکوہی صاحب تاجر کاغذ نے بہت امداد دی اور سانده کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

جس دن ابا جان فوت ہوئے میں نے خواب دیکھا کہ تین آدمی ہیں درمیان میں دادا جان ہیں اور دونوں طرف دو آدمی ہیں جن کو والد صاحب سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے دوست ہیں۔ مگر وہ اندھیرے میں تھے۔ ابا جان نے شاندار سفید پگڑی باندھی ہوئی ہے اور ان پر تیز روشنی پڑ رہی ہے۔ آواز آتی ہے کہ ''یہ لوگ Graduate ہو گئے ہیں'' آپ حیران ہوتے ہیں کہ یہ کیا آواز ہے۔ دوبارہ بڑی رعب دار آواز آئی ہے کہ یہ لوگ Graduate ہو گئے ہیں۔ بڑا زور دے کر کہا گیا۔ آپ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ وقت تہجد کا تھا۔ والد صاحب نے تہجد پڑھی اور دعا کی کہ خیریت ہو۔

صبح دفتر گئے تو آگے تار آئی ہوئی تھی کہ ابا جان فوت ہو گئے ہیں لاہور جانے کے لئے جب گھر سے نکلا تو ماسٹر شیر علی صاحب ملے۔ پوچھنے لگے کہاں جا رہے ہو تو آپ نے بتایا کہ والد صاحب وفات پا گئے ہیں۔ وہ کہنے لگے ان کی خواب کے متعلق کوئی خواب نہیں آیا۔ آپ نے خواب سنایا۔ اور Graduate کے معنی سمجھائے کہ ڈگری ہولڈر یا سند یافتہ تو ماسٹر شیر علی صاحب کہنے لگے پنجابی میں اس کو کہتے ہیں ''پگ گئے'' یعنی کامیاب ہو گئے۔

غرضیکہ ابا جان نے بیعت کرنے کے بعد اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا دعوت الی اللہ کو بنایا۔ ساری ملازمت کے دوران آنریری 'داعی' کے طور پر کام کیا۔ اپنی تمام آمدنی اسی کام میں خرچ کی اور خود نہایت سادہ زندگی گزاری۔ پسماندگان کے لئے کوئی دنیاوی سامان نہیں چھوڑا۔ آپکی قربانی کے نتیجہ میں آپ کی اولاد کو سب سے بڑی نعمت ''احمدیت'' عطا ہوئی۔ اس کے علاوہ تمام دنیاوی آسائشوں سے مالا مال ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے اور ہمیشہ احمدیت سے منسلک رکھے آمین۔

آپ کی پہلی شادی موضع چک نزد ہٹھور رحمت بی بی صاحبہ سے ہوئی۔ ہماری دادی جان نے حضرت مسیح موعودؑ کی بیعت ۱۹۰۵ء میں کی تھی۔ آپ عبادت گزار اور دعا گو تھیں۔ آپکو خواب بہت آتے تھے۔ اور وہ بہت جلد

پورے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ان کے بطن سے حسب ذیل بچے ہیں۔ان کی وفات ۲۸ دسمبر ۱۹۱۸ء کو ہوئی۔

اولاد:۔(۱) عبدالرحمان شاکر ولادت ۱۹۰۷ء وفات ۱۹۹۷۔۹۔۲۴ (۲) امتہ اللہ بیگم صاحبہ ولادت ۱۹۰۹ء
(۳) امتہ الحفیظ صاحبہ ولادت ۱۹۱۱ء (۴) عبدالرحیم صاحب (تقریباً ایک ماہ کے بعد فوت ہوگئے)
(۵) ناصرالدین صاحب وفات ۱۹۱۸۔۱۱۔۵ قادیان (۶) باقر صاحب ۱۹۱۸ء (پیدائش کے ساتھ ہی فوت ہوگئے)

آپ کی دوسری شادی فیروزہ بیگم بنت ملک محمد رمضان ککے زئی سکنہ گجرات سے ہوئی۔یہ بھی بہت عبادت گزار تھیں اور دعا گو تھیں۔ان سے دو بچے پیدا ہوئے جو حسب ذیل ہیں۔

(۷) بیٹا پیدا ہوا جو سات ماہ کے بعد فوت ہوگیا۔

(۸) وسیم احمد ۱۹۳۱۔۱۱۔۲۳ ایم۔اے لیکچرار گورنمنٹ کالج حافظ آباد سے ریٹائر ہو کر کراچی میں مقیم ہیں۔

میاں مولا بخش صاحبؓ

میاں مولا بخش صاحب رضی اللہ عنہ (والد حافظ محمد رمضان صاحب مولوی فاضل مربی سلسلہ احمدیہ) قادیان سے جانبِ شمال موضع پسنانوالی کے رہنے والے تھے۔آپ کے والد کا نام محمدؐ تھا جو اسی گاؤں کے اچھے لکھے پڑھے صاحب تقویٰ وطہارت بزرگ تھے۔علاقہ بھر میں انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ان کے تین بیٹے تھے۔ محمد عبداللہ منشی فاضل۔خیر دین۔اور مولا بخش۔

میاں مولا بخش صاحب اپنے بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ ۱۸۸۵ء سے قبل حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ملاقات کیلئے کئی دفعہ قادیان آئے۔

آپ خود احمدیت کی طرف یوں راغب ہوئے کہ آپ نے حضرت مسیح موعودؑ کی پاکیزہ زندگی کی جھلک تو بچپن سے ہی دیکھی ہوئی تھی۔انہی دنوں قصبہ سٹھیالی کے قریب سے نہر اپر باری دوآب کی ایک شاخ گزرتی تھی اور حضرت میر ناصر نواب صاحبؓ دہلوی اسی نہر پر اوورسیئر تھے۔مولا بخش صاحب ملازمت کیلئے حضرت میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس طرح دونوں میں روابط بڑھنے لگے اور ایک دفعہ تو حضرت میر صاحبؓ کے عیال لمبا عرصہ تک مرزا غلام قادر صاحب کے ہاں قادیان میں مقیم رہے تھے۔میر صاحب کے اس تعلق سے احمدیت کی طرف راغب ہوئے اور۔آخر کار ۱۸۹۴ء میں مولا بخش صاحب نے بیعت کر لی۔اسی زمانہ میں اُن کے دو بڑے بھائی برٹش سفارت خانہ کابل میں ملازم ہو کر افغانستان چلے گئے۔بعد میں کسی موقع پر ان کو بھی کابل بلوالیا مگر جب افغان اس سرحد پار کرنے لگے تو بوجہ پروانہ راہداری نہ ہونے کے روک دیئے گئے۔وہاں بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی اور سخت حیران کہ علاقہ غیر میں اب کیا بنے گا؟

اتنے میں انگریزی چوکی کا ایک کلرک آیا اور پنجابی میں کہنے لگا۔آؤ میاں جی گھر چلیں۔یہ حیران کہ یہ کون ہے؟ وہ کہنے لگا کہ میں آپ کے والد صاحب کا ایک شاگرد ہوں میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔آپ کو اس بے سروسامانی میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔آرام سے میرے گھر میں رات بسر کریں صبح اللہ مالک ہے۔

اگلے دن اتفاق سے سفارت خانہ کابل کے ایک مسلمان ڈاکٹر کابل جا رہے تھے ان کو ایک ملازم کی ضرورت تھی۔اس کلرک نے مولا بخش صاحب کی سفارش کر دی۔ادھر جب ڈاکٹر صاحب کو علم ہوا کہ ان کے دو بھائی برٹش سفارت خانہ میں پہلے ہی ملازم ہیں تو اُن کو خوشی سے ہمراہ لے گئے۔

''خدا خود میر سامان است ارباب توکل را''

کابل جا کر بھائیوں سے ملے۔انہی ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے کھانا مقرر ہو گیا جو تنخواہ ملتی وہ خالص بچت ہوتی اس طرح کافی روپیہ پس انداز کر لیا۔

قیامِ کابل میں ایک دن شاہی باغ کے دروازے پر کھڑے تھے کہ امیر عبدالرحمٰن خان شاہ افغانستان کی سواری آ گئی۔ اس نے ایک اجنبی دروازے پر دیکھ کر پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے بتایا کہ فلاں ڈاکٹر صاحب کے ہاں ملازم ہوں۔ پنجاب کا رہنے والا ہوں بادشاہ نے کہا کہ ہمارے باغ میں خوب میوہ کھایا کرو انہوں نے ذرا اور جرأت سے کام لے کر عرض کیا.... ''حکم بدہ'' کہ آپ حکم دے دیں۔ بادشاہ نے افسر باغ سے کہہ دیا کہ ان کو اجازت ہے۔ مفت پھل دیدیا کرو جب جاتے سیر ہو کر آتے اور مزے ہو گئے۔ آپ چھ برس کابل میں رہے۔ کچھ تو گھریلو تعلیم کا اثر تھا کہ اس زمانہ میں فارسی عام زبان تھی اور کابل میں رہ کر بحر کھل گیا۔ فارسی میں بڑی روانی سے باتیں کیا کرتے تھے'' گلستان'' اور'' بوستان'' کے اشعار نوکِ زبان تھے اور بڑی مہذب گفتگو کیا کرتے تھے۔

کابل سے واپسی پر اپنے گاؤں میں چمڑے کی تجارت شروع کر دی۔ اس عرصہ میں کبھی کبھی قادیان ضرور آتے رہے۔ ۱۹۱۸ء میں آخر میر صاحب کی کشش اُنہیں مستقل طور پر قادیان میں لے آئی اور حضرت میر صاحب کے مکان سے بالکل ملحق پھاگل پور ہاؤس کی دکانوں میں رہائش اختیار کر لی۔ چند سال قبل بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ چار لڑکے تھے۔ فضل حق، اللہ داد، محمد رمضان، اور علاؤالدین۔ دو بڑے لڑکے باپ کے ہمراہ کام کرتے تھے۔ محمد رمضان اڑھائی برس کی عمر میں نابینا ہو گئے اور علاؤالدین بالکل بچہ تھا۔ نہایت سادگی سے زندگی بسر ہوتی تھی۔ خدا تعالیٰ نے طبیعتوں میں کچھ ایسی مناسبت پیدا کی تھی کہ حضرت میر صاحب ان کے بغیر نہ رہتے تھے اور یہ بھی ہمزاد کی طرح ساتھ لگے رہتے تھے۔

بٹالہ سے تین میل کے فاصلہ پر قادیان کی سڑک سے نصف میل ہٹ کر قصبہ مسانیاں ایک پیر صاحب کی گدی ہے جن کی اُس علاقہ میں خوب مانتا تھی۔ ایک دفعہ حضرت میر ناصر نواب صاحبؓ اور میاں مولا بخش بٹالہ سے ریل میں سوار ہو کر امرتسر جا رہے تھے۔ اتفاق سے وہ پیر صاحب بھی اسی ڈبے میں سوار ہو گئے۔ اس حالت میں کہ ان کے ہاتھ پر ایک باز تھا دو چار مرید حقہ لئے ہوئے اور کوٹ کی جیب سے شراب کی ایک بوتل جھانک رہی تھی۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو پیر صاحب نے مولا بخش صاحب سے پوچھا۔ کہ'' یہ کون بزرگ ہیں؟''

انہوں نے کہا۔'' حضرت مرزا صاحبؑ کے خسر ہیں۔'' پیر صاحب نے خواہش کی کہ اُن سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ مولا بخش صاحب نے میر صاحب سے اجازت لے کر پیر صاحب کو قریب آنے کے لئے کہا۔

انہوں نے میر صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت آپ نے مرزا صاحب میں کیا خوبی دیکھی تھی جو اپنی بیٹی کا رشتہ دینا منظور کر لیا؟''

میر صاحب نے فرمایا کہ............'' میں نے کیا بُرا کیا؟ کیا تمہارے جیسے سیّدوں کو رشتہ دیتا؟ کیا تمہارے نانا کے ہاتھ پر باز ہوا کرتا تھا؟ کیا وہ حقہ پیا کرتے تھے اور نوکر حقہ لے کر ہمراہ چلتے تھے؟ اور کیا اُن کی جیب میں بوتل ہوا کرتی تھی؟

پیر صاحب نے بھلا ایسا جواب کب سُنا تھا؟ سناٹے میں آگئے ۔ آخر کیا بولتے ؟ حالت دیکھنے والی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھتے رہے وہ تو شکر ہے کہ جلد ہی جینتی پورہ سٹیشن آگیا اور وہ اُتر کر دوسرے کسی خانے میں چلے گئے۔

ایک دفعہ حضرت میر صاحب نے مولا بخش کو بلوایا اور کہا کہ تیار ہو جاؤ۔ ابھی امرتسر جانا ہے۔ وہ ہر وقت تیار رہتے تھے ۔صرف اشارے کے منتظر تھے ۔رات امرتسر میں کسی احمدی کے گھر مقیم ہوئے۔ صبح سویرے ہی میر صاحب نے بکر منڈی جا کر ایک سو بکرے جو قربانی کے لائق تھے خریدے اور مولا بخش کو زادِراہ دے کر بٹالہ روانہ کر دیا۔ وہ رات منشی عبدالکریم صاحب صحابیؓ کی سرائے میں گزار کر اگلے دن قادیان پہنچ گئے ۔عید قربان نزدیک تھی تمام جانور فروخت کرائے ۔نفع میں سے یکصد روپیہ مولا بخش کا حصّہ بنا۔

قادیان میں مدرسہ احمدیہ کے گیٹ کے عین سامنے بھائی شیر محمدؓ کی دکان سے متصل محمد بخش شیر فروش کی دکان تھی ۔اس نے ایک بکرا میر صاحب سے خریدا اور اگلے دن واپس کرنے آگیا کہ یہ جانور تو کانا ہے۔ میر صاحب بڑے زندہ دل تھے فرمانے لگے کہ محمد بخش تم بھی تو کانے ہو۔ وہ سمجھ گیا وہی جانور قصابوں کے ہاتھ فروخت کر کے نفع کما لیا اور نیا جانور لے کر قربانی ادا کی۔

ایک دن اتفاق سے صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ میر صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے ۔تو مولا بخش نے عرض کیا کہ میر صاحب! میاں صاحب سے سفارش فرمائیں تا مجھے دس مرلہ زمین مکان کے لئے عنایت فرمائیں ۔میر صاحبؓ نے وہی نفع والا سو روپیہ میاں صاحب کو دے دیا اور سفارش بھی کر دی۔ میاں صاحب فرمانے لگے کہ بیس روپے اور درکار ہیں میر صاحبؓ نے بزرگانہ رعب ڈالتے ہوئے فرمایا کہ وہ بیس روپے اپنی جیب سے ڈال دو۔ اس طرح محلہ دارالرحمت میں بڑی موقعہ کی زمین مل گئی ۔جس پر مختصر سا مکان تعمیر کر لیا۔

میاں مولا بخش کے بڑے بھائی مولوی عبداللہ صاحب شکر گڑھ میں فارسی کے استاد تھے اور راقم الحروف کے والد مولوی نعمت اللہ خان گوہر وہیں سیکنڈ ماسٹر تھے ۔احمدیت کے متعلق خوب گرما گرم بحث رہا کرتی تھی مگر مولوی عبداللہ صاحب نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔ ایک دن اتفاق سے وہ قادیان آئے تو والد صاحب نے ان کو دعوتِ طعام دی اور پھر پیغام حق سنایا مگر وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے واپس چلے گئے۔

چونکہ میاں مولا بخش صاحب ہمیشہ حضرت صاحب کے زیر سایہ رہے ۔ایک دن عرض کیا کہ اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے سوائے ایک کے باقی تمام لڑکے تو اپنے کاموں میں ماہر ہو گئے ہیں مگر محمد رمضان کا کیا بنے گا؟ حضرت میر صاحبؓ نے فرمایا کہ اس کو مدرسہ احمدیہ میں لے جاؤ اور داخل کرا دو۔ دوسرے دن جب ہیڈ ماسٹر شیخ عبدالرحمن صاحب مصری سے جا کر ملے تو انھوں نے معذوری ظاہر کی ایک نابینا طالب علم کا انتظام مشکل ہے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ کل میرے ساتھ چلنا۔ میر صاحب گئے اور شیخ مصری صاحب اب کی بار انکار نہ کر سکے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ یہ کلاس میں بیٹھ کر صرف سنتا رہا کرے گا۔ اور انشاء اللہ کچھ نہ کچھ حاصل کر لے گا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ایسی

برکت بخشی کہ ظاہری بصارت کی کمی خداداد دماغی قابلیت سے پوری ہوگئی ۔ نہ صرف قرآن مجید حفظ کرلیا بلکہ امتحان پنجاب یونیورسٹی مولوی فاضل میں چوتھے نمبر پر پاس ہوئے ۔ مولوی محمد سعید انصاری حال مبلغ انڈونیشیا حافظ صاحب کے رائٹر تھے ۔

کافی عرصہ تک متفرق کلاس کے استاد رہے پھر باقاعدہ مبلغین سلسلہ عالیہ احمدیہ میں شامل کرلئے گئے ۔ ان کے پڑھنے کا طریق حافظ روشن علی صاحبؓ اور حافظ صوفی غلام محمد صاحب بی اے کا امتزاج تھا۔ آواز خوب پاٹ دار تھی اور عام فہم زبان میں وعظ کیا کرتے تھے اور وعظ کے درمیان موزوں اشعار اور لطائف سنا کر سماں باندھ دیا کرتے تھے ۔ حافظ محمد رمضان صاحب کا بڑا بیٹا احمد زمان تنویر آج کل ایوان محمود کے سامنے فوٹو گرافی کرتا ہے ۔ ایک لڑکا دوبئی میں کام کرتا ہے ۔ چھوٹا بڑے بھائی کے ساتھ کام کرتا ہے ۔

میاں مولا بخش صاحب کی آنکھوں میں ہر وقت ایک پانی سار ہا کرتا تھا جو کثرت سے ذکر الٰہی کا ثبوت تھا ۔ ان کی عادت تھی کہ بہت سویرے بیدار ہوتے ۔ تہجد کے لئے بلند آواز سے ذکرِ الٰہی کرتے ہوئے مسجد کو جاتے ۔ لوگ ان کی آواز سے جاگ اٹھتے اور ذکر الٰہی میں لگ جاتے تھے ۔

الغرض بہت خوبیوں کے مالک تھے ۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ۔ آپ نے ۱۹۳۸ء میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ قادیان میں دفن ہوئے ۔

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان جون ۱۹۷۶ء)

فلاسفر صاحب

ویسے تو ہماری جماعت میں بے شمار ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے انفاسِ مسیحائی سے روحانی مردوں میں سے زندہ ہونے والے ایک فلاسفر صاحب بھی تھے۔ آپ کا اصل نام اللہ دین تھا۔ والد کا نام چوہڑ خان۔ قوم راجپوت ساکن شینہ بھٹیاں جو قادیان سے جانب شمال ۷، ۸ میل پر تھا۔

۱۹۰۰ء کے قریب کہیں پھرتے پھراتے قادیان آئے۔ اپنی جہالت میں حضرت اقدسؑ کو گالیاں دیں۔ حضرت میر ناصر نواب (نانا جان) اور حضرت بھائی عبدالرحیم نو مسلمؓ (سابق جگت سنگھ) نے انھیں (اس بڑ کے درخت کے نیچے جو ڈاکٹر احسان علی مرحوم والے چوک میں ہوتا تھا) خوب مارا۔ لاتوں اور ہاتھوں سے مرمت کی اور چھوڑ دیا۔ اللہ دین نے فوراً حضرتِ اقدسؑ کے دروازے پر جا کر زنجیر کھٹکا دی حضورؑ خود ہی اندر سے تشریف لائے اور پوچھا۔ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے دو مریدوں نے مجھے بہت مارا ہے اور کچھ نشان بھی دکھائے۔ حضورؑ نے فرمایا۔ اچھا ہم ان سے دریافت کریں گے۔

گرمیوں کے دن تھے شام کو مغرب کی نماز کے بعد حضورؑ مسجد مبارک کی چھت پر شہ نشین پر تشریف فرما تھے احباب گرد بیٹھے تھے یکا یک حضورؑ نے فرمایا۔ ''میر صاحب یہاں ہیں؟''

وہ جھٹ کھڑے ہو گئے۔

حضورؑ نے خفگی سے فرمایا۔ ''اللہ دین کو آپ نے کیوں مارا؟''

میر صاحب نے عرض کیا کہ ''وہ حضورؑ کی شان میں بکواس کر رہا تھا۔ مجھے غصہ آیا۔ میں نے مارا''

یہی بیان بھائی جی نے دیا۔

حضرتؑ نے فرمایا۔ '' گالیاں مجھے دی تھیں نہ آپ کو۔ پھر آپ کو کیوں غصہ آیا؟''

میر صاحب کہنے لگے۔ ''اچھا ہمارے آقا کو ناحق گالیاں دی جائیں اور ہمیں غصہ نہ آئے؟ اور جب حضورؑ کے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو غیر مذاہب والے گالیاں دیتے ہیں تو اس وقت آپ ناراض ہوتے ہیں کہ نہیں؟''

حضورؑ نے فرمایا۔ ''اگر آپ لوگ اپنے نفسانی جوشوں کو دبا نہیں سکتے اور نہ صبر کر سکتے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں''

اس پر دونوں اصحاب نے معافی طلب کی۔ مگر حضورؑ نے فرمایا کہ ''پہلے اُسے راضی کریں پھر معافی ہو گی۔''

اگلے دن بھائی عبدالرحیم صاحب اللہ دین کو تلاش کر کے اُسی بڑ کے نیچے لائے۔ میر صاحب بھی آ گئے۔ دونوں نے اُن سے معافی مانگی۔ چھ آنے کے پیسے بھی اس کو دیئے۔ دودھ بھی پلایا اور کہا کہ ''اب حضرت صاحب

سے جا کر کہہ دو کہ میں نے معاف کر دیا ہے۔'' یہ جا کر حضورؑ سے کہہ آئے تب معافی مکمل ہوئی۔

یہ تمام واقعہ بھائی جی نے ہمیں کلاس میں سنایا تھا۔ مجھے اب بھی بھائی جی کھڑے نظر آ رہے ہیں۔

میاں اللہ دین صاحب کے قبولِ احمدیت کا واقعہ صرف اتنا ہے کہ جلسہ کے ایام تھے۔ انھوں نے کسی احمدی کا بستر چرایا اور چل پڑے پیچھے سے لوگوں نے آ کر پکڑ لیا پھر جو مار پڑی وہی ہدایت کا موجب ہوگئی۔ انھوں نے توبۃ النصوح کر لی۔ حضرت اقدسؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کر لی۔ اعتراف گناہ کے بعد پاک ہو گئے اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے لگے۔

فیض تھا روح القدس کا گفتگوئے پاک میں
نیک ہو جاتے تھے آ کر صحبت بد کے شریک

ابتداء میں اپنے ایک ہمراز کے ہمراہ مل کر کفن چوری کیا کرتے تھے۔ ادھر مردہ دفن کر کے گئے اور یہ دونوں رات کو جا کر قبر کھود کر کفن چرا لاتے تھے اُسے دھو کر صاف کرتے اور لنڈا بازار میں فروخت کر دیتے تھے۔ (دیکھئے سیرۃ المہدیؑ حصہ سوم صفحہ ۲۶۴) اُن کے ساتھی قاضی یار محمد صاحب ان کا نام تھا۔ انھوں نے بھی حقیقی توبہ کر کے یہ گناہ ترک کر دیا اور حضرت مسیح موعودؑ کے خادموں میں سے ہوگئے۔

پھر حضورؑ کی دعاؤں کے طفیل اورنٹیل کالج سے امتحان منشی فاضل اور وکالت پاس کی۔ نور پور ضلع کانگڑہ میں رہائش تھی۔ اصل وطن ہوشیار پور تھا۔ وہاں ہی ان سے عرصہ تک ملتا رہا ہوں۔ والد صاحب وہاں ہائی سکول میں انگلش ٹیچر تھے اور ہم قاضی صاحب کے مکان میں ہی رہتے تھے۔ ان کی ذات میں خدا نے ایک ایسا معجزہ رکھا تھا کہ عقل حیران ہے۔ وہ یہ کہ جن دنوں حضرت اقدسؑ گورداسپور میں بمقدمہ کرم دین کذاب مقیم تھے تو ایک دن نمازِ فجر کی اذان ہو چکی تھی کہ حضورؑ تشریف لائے اور قاضی یار محمد صاحب سے کہا کہ:۔

''آپ ابھی قادیان جائیں اور وہاں سے فلاں کتاب لے آئیں۔ آج مقدمہ میں پیش کرنی ہے۔''

یہ اُسی وقت اُٹھے اور جا کر کتاب قادیان سے لا کر خواجہ کمال الدین صاحب کے حوالہ کر دی۔ اس وقت نمازِ فجر ہو چکی تھی اور حضرت ابھی مصلے پر بیٹھے تسبیح میں مشغول تھے۔ قاضی صاحب پچھلی صف میں آ کر بیٹھ گئے۔ حضورؑ نے جو مڑ کر دیکھا تو فرمایا کہ:۔

''آپ ابھی تک گئے نہیں؟ کتاب کی سخت ضرورت ہے۔''

قاضی یار محمد نے عرض کیا۔ ''حضورؑ! میں تو کتاب لا کر خواجہ صاحب کو دے بھی آیا ہوں۔''

حضورؑ خوش ہو گئے۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ گورداسپور سے قادیان براستہ نہر ۱۸+۱۸=۳۶ میل ہے اور اگر گاؤں کے رستہ بھی جائیں تو کم از کم ۲۴ میل بنتا ہے۔ اس قدر فاصلہ فجر کی اذان اور نماز ختم ہونے تک کس طرح آئے اور گئے۔

آخر کتاب تلاش کرنے میں بھی کچھ وقت لگا ہوگا۔اس کا جواب یہ ہے کہ حضرتؑ کو خدا نے الہاماً فرمایا تھا کہ:۔

''انت الشیخ المیسح الّذی لا یضاع وقتهٗ''

(ترجمہ) تو وہ بزرگ مسیح ہے جس کا وقت ضائع نہیں ہوگا۔

اسی کے ماتحت مسیح محمدیؑ کا وقت بچانے کے لئے خدا تعالیٰ کے (۱) فرشتے ان کو اٹھا کر قادیان لے گئے اور کتاب لے کر واپس بھی چھوڑ گئے یا (۲) خدا تعالیٰ نے اپنے خاص تصرف سے زمین سکیڑ دی اور یا (۳) قاضی صاحب میں اس قدر طاقت اور بجلی اور سرعت بھر دی کہ وہ گورداسپور سے قادیان گئے اور کام انجام دے کر واپس بھی اس قدر قلیل عرصہ میں آگئے اور ایسی خدمات تقریباً دو ماہ تک انجام دیں۔

خاکسار نے قاضی صاحب سے دریافت کیا تھا۔کہ یہ کیا معاملہ تھا۔کہنے لگے ''مجھے خود خبر نہیں کہ کیا ہوتا تھا میں تو خدمت کے جذبہ سے بھرا ہوتا تھا۔'' میں نے پوچھا اس کے بعد کوئی تھکن وغیرہ محسوس ہوئی تھی؟ تو کہا کہ ''بالکل خفیف سی''

محترم مولوی محمد دین صاحب صدر، صدر انجمن احمدیہ ربوہ نے مجھے بتایا کہ قاضی صاحب تیز چلنے کے عادی تھے کہ وہ مغرب کے وقت لاہور سے چلتے۔تو ستّر میل فاصلہ طے کر کے فجر کی نماز قادیان میں پڑھا کرتے تھے قاضی صاحب نہایت ہلکے پھلکے، پستہ قد کے آدمی تھے۔انہوں نے خلافت اولیٰ وثانیہ کی بیعت نہ کی تھی۔۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی غلامی میں آکر فلاسفر صاحب نے اپنے اندر زبردست تبدیلی پیدا کی اور قرآن مجید۔احادیث، کتب فقہ وغیرہ میں کافی دسترس حاصل کر لی تھی۔علاوہ ازیں انہوں نے صرف ونحو میں بھی اپنی محنت سے خوب ترقی کی۔اچھے اچھے مولویوں کو تو صرف کے چکر میں لا کر لاجواب کر دیتے تھے۔لباس نہایت صاف ستھرا۔اُجلا مگر سادہ رکھتے تھے۔اگر ان میں ناپاکی کا شبہ ہوتا تو اس کپڑے کو دھوتے۔وضو کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک بڑی بالٹی پاس رکھ لیتے۔کم از کم آدھے گھنٹے میں وضو ختم ہوتا تھا۔ایک ایک عضو کو کئی کئی بار دھوتے تو ان کی تسلی ہوتی تھی۔توبہ کے بعد نمازوں میں شدید انہماک ہو گیا تھا اور تہجد کبھی چھوڑتے نہ تھے ایک شخص نے پوچھا کہ ''اس قدر تہجد گزار کیسے بن گئے؟ تو کہا کہ ''خدا نے مجھ پر کس قدر فضل عظیم کیا ہے۔اب میں جتنے بھی سجدہ ہائے شکرانہ کروں کم ہیں۔ایک بازاری عورت دو روپے کے عوض ساری رات گاتی ہے تو میں اس قدر احسان کے بدلے میں ساری رات خدا کے حضور نہ کھڑا رہوں؟''

فلاسفر صاحب کی طبیعت میں ایک خرابی بھی تھی کہ اُن کی زبان تیز گفتاری سے رُکتی نہ تھی اور بعض اوقات الفاظ بھی تہذیب سے گرے ہوئے اور غیر محتاط ہوتے کہ طبیعت خراب ہو جاتی۔ویسے بات مدلّل۔مسکت اور لاجواب کرنے والی ہوتی۔

''کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بُری طرح''(مومن)

ابتداء میں آپ دیگر اصحاب صفہ کے ہمراہ مہمان خانہ میں ہی رہائش رکھتے تھے۔ وہیں پر ایک احمدی حاجی رہتے تھے۔ جن کا سماوار تھا۔ اور اس میں کوئلوں کی گیس نکلتی رہتی تھی جو فلاسفر صاحب کو خاص طور پر ناگوار لگتی۔ ایک دفعہ موقع پا کر انہوں نے ان کا سماوار زمین میں دبا دیا۔ وہ ادھر اُدھر تلاش کرتے پھرتے تھے آخر معاملہ حضرت اقدس تک پہنچا۔ لوگوں کا شبہ فلاسفر صاحب پر تھا۔ جب سختی سے باز پرس کی گئی تو فلاسفر صاحب نے زمین میں گاڑا ہوا سماوار نکال کر دے دیا۔

(روایت حاجی عبدالکریم مرحوم رجسٹر روایات صحابہ ؓ ۱ ص ۴۴)

ایک صاحب نے فلاسفر صاحب سے کہا کہ ''آپ تبلیغ کیلئے باہر کی جماعتوں میں کیوں نہیں جاتے''؟ تو جواب دیا کہ ''اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور جانتے ہو کہ پرانے انجن ریلوے اسٹیشن کی حدود میں ہی شنٹ کرتے رہتے ہیں''۔

ایک دفعہ آپ اور بابو فقیر علی صاحب تبلیغ کیلئے کسی گاؤں میں گئے۔ وہاں کے شریروں نے ان دونوں کو دھوکے سے ایک مکان میں لے جا کر بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فلاسفر صاحب نے روشن دان میں سے نکل کر باہر آ کر بابو صاحب کو بھی نکال لیا۔

قادیان میں ایک صاحب عبداللہ پروفیسر ہوتے تھے۔ یہی جادو۔ شعبدے بازی کے پروفیسر۔ اچھے نیک آدمی تھے مگر مزاج کے بہت تیز۔ وہ کچھ متفرق اشتہار نیلام کر رہے تھے۔ ایک چیز کی قیمت بولی۔ کسی نے بڑھا کر قیمت بتائی۔ وہ کہہ بیٹھے۔ ''مَن یزید؟'' کون اس سے بڑھتا ہے؟ فلاسفر صاحب نے آگے سے کہہ دیا ''اَنْتَ یزیْد!''

پروفیسر صاحب پہلے ہی شعلہ مزاج تھے فوراً ہی لال بھبھوکا بن گئے۔ کافی زبان درازی کے بعد مشکل سے یہ زبانی پھلجھڑیاں بند ہوئیں۔

ایک دفعہ فلاسفر صاحب بلند آواز سے کہہ رہے تھے کہ ''مومن بھی اندھا، منافق بھی اندھا، کافر بھی اندھا'' اس کے بعد نہ جانے ان الفاظ کی کیا تشریح کرنی تھی کہ اتنے میں مکرم مولوی نور احمد صاحب نے کہا۔

''فلاسفر صاحب! درست ہے آپ کی بات مومن خدا کی محبت میں اندھا، منافق ریشہ دوانیوں میں اندھا اور کافر خدا اور رسول کے انکار میں اندھا''

فلاسفر صاحب یہ تشریح سن کر خاموش ہو گئے اور وہاں سے چلتے بنے۔

ایک دفعہ ایک عیسائی پادری سے گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ بھلا ایک احمدی کیساتھ کیا مقابلہ کرتا۔ خیر اسی میں جانی کہ فلاسفر صاحب کو کچھ کھلایا پلایا جائے چنانچہ ان کی خوب مدارات کی پھر جو بات چلی۔ تو فلاسفر صاحب اور بھی تیز تھے۔ وہ کہنے لگا۔ ''یار میں نے تمہیں کھلایا پلایا بھی ہے اور تم ٹھنڈے ہی نہیں پڑتے''۔ یہ کہنے لگے ''تم نے خود ہی

تو مجھے انڈے وغیرہ کھلا کر گرم کر دیا ہے۔''

ان کے بہت سے لطائف ہیں مگر ان کی زبان ذرا غیر مہذ بانہ ہے اسلئے وہ قابل اشاعت نہیں۔ایک دفعہ آپ امرتسر جا کر احمدیوں کی مسجد میں ٹھہرے۔قریب ہی محترم خواجہ عبید اللہ صاحب ایس۔ڈی او۔صاحب کا مکان تھا۔انہوں نے فلاسفر صاحب کو شام کے کھانے کی دعوت دی کہنے لگے کہ''آپ کے گھر چل کر نہیں جاؤں گا۔کھانا مسجد میں لے آئیں!''وہ کہنے لگے''اسی گلی میں چند قدم پر مکان ہے۔'' کہنے لگے''آپ میرا نام جانتے ہیں''؟ خواجہ صاحب نے کہا۔ہاں! آپ فلاسفر صاحب ہیں! یہ کہنے لگے۔نہیں فلاسفر نہیں۔فَلاَ سَفَرْ ہے یعنی سفر نہیں کرنا۔یہاں لے آؤ!۔

میری تحریک پر فلاسفر صاحب نے وصیت کی۔جس کا نمبر ۹۰۰۱ ہے اس میں اپنی جائیداد ایک مختصر سا مکان قیمتی ۱۵۰۰ روپیہ بتایا تھا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو قادیان میں قیامت خیز موسلا دھار بارش سر شام ہی شروع ہو گئی تھی جو صبح ۴ بجے کے قریب جا کر تھمی۔اسی رات اپنے مکان میں فوت ہو گئے۔چونکہ بارش سے سیلاب آیا ہوا تھا اوپر سے کرفیو لگا ہوا تھا۔کون قبرستان لے جاتا۔احباب کو خبر ہوئی تو پرانے زنانہ جلسہ گاہ میں دفن کر دیا۔بہر حال حضرت اقدسؑ کی غلامی سے ان کا انجام اچھا ہوا۔

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان اکتوبر ۱۹۷۵ء)

حضرت ماسٹر ماموں خان صاحب رضی اللہ عنہ لدھیانوی

شہر لدھیانہ سے ۲۲ میل پر قصبہ سمرالہ ہے جو تحصیل بھی ہے۔ سمرالہ سے آگے ۶ میل پر مشہور تاریخی قصبہ ماچھی واڑہ ہے جو اکبر کے زمانہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں جب سکھوں کے دسویں گورو گوبند سنگھ اور اس کے مریدوں نے علاقہ بھر کے امنِ عامہ کو اپنی تخریبی سرگرمیوں سے تہ و بالا کر دیا تو شاہی فوج نے اس کا تعاقب کیا اور ماچھی واڑہ میں آن پکڑا تو اس نے یہاں کے ۲ بھائیوں غنی خان اور نبی خان افغان کے گھر میں پناہ لی۔ انہوں نے فوج والوں کو کہہ دیا کہ یہ گوبند سنگھ نہیں بلکہ ہمارے اوچ شریف کے پیر صاحب ہیں۔ دوسرے دن اُس کو مسلمان پیروں جیسا لباس پہنا کر پالکی میں بٹھا کر محفوظ علاقہ میں چھوڑ آئے۔ افسوس کہ گورو کے چیلوں نے ہمیشہ ہی مسلمانوں پر ظلم کیا۔ حتیٰ کہ ''سکھا شاہی'' محاورہ بن گیا ہے۔

اسی مردم خیز قصبہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پانچ صحابہ بھی ہوئے ہیں:۔

۱۔ سیّد عبد الہادی شاہ صاحب اوورسیئر (سولن ضلع شملہ) وفات ۰۸۔ ۱۹۰۷ء (چھوٹے بھائی تھے)

۲۔ سید محمد شاہ صاحب پرشین ٹیچر ماچھی واڑہ وفات ۱۹۲۲ء (بڑے بھائی)

۳۔ حکیم محمد عبد اللہ صاحب

۴۔ حافظ امام دین صاحب نابینا (امام مسجد) وفات ۱۹۰۷ء)

۵۔ ماسٹر ماموں خان صاحب ڈرل ماسٹر۔

اول الذکر تو ۳۱۳ اصحاب میں سے ہیں اور ان کا نمبر ۱۵۷ ہے۔

سید محمد شاہ صاحب نے بیعت اپنے چھوٹے بھائی کے ۴۔۳ سال بعد کی۔ اُن کی بڑی لڑکی جنت بی بی اپنے چچا کے لڑکے سے بیاہی ہوئی تھی۔ بڑی نیک بخت اور احمدیت پر پختہ تھی۔

حکیم محمد عبد اللہ صاحب بہت پائے کے حکیم اور نہایت نیک آدمی تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے حکیم عبد الرحمٰن صاحب ربوہ میں ہیں اور محلّہ غلہ منڈی میں رہتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر عبد الستار صاحب وٹرنری سرجن تھے، اب وفات پا چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے منظور احمد صاحب عرصہ تک ربوہ میں سٹیشن ماسٹر رہے ہیں۔

حافظ امام دین صاحب ماچھی واڑہ سے ۲ میل پر ایک گاؤں کے رہنے والے تھے مگر تمام عمر ماچھی واڑہ میں گزاری۔ شہر کی نصف آبادی کو قرآن مجید پڑھایا۔ آپ کے احمدی ہونے پر بعض شریروں نے ارادہ کیا کہ رات کو مسجد کے حجرے میں تیل ڈال کر آگ لگا دی جائے تا زندہ ہی جل جائیں مگر خدا نے ان کو اُنکے بدارادہ سے محفوظ رکھا اور جب حافظ صاحب نے وفات پائی تو اُن میں سے ایک اُن کے مقبرے کے تعویذ کے لئے ۔ ، اُٹھا اُٹھا

کرلایا۔ جوشریروں کا سرغنہ تھا اُسے یہ سزا ملی کہ اس کی ایک ہی لڑکی تھی جو فاحشہ تھی، وہ قتل ہوگئی۔ اور تمام شہر میں سخت بدنامی ہوئی۔ اسی شخص کالوشاہ کے بیٹے نے خودکشی کرلی اور پوتے نے بھی خودکشی سے ہی دنیا کو نجات دی۔

ماسٹر ماموں خان صاحبؓ کے والد کا نام کالوخان تھا اور قوم راجپوت تھی۔ آپ نے ۱۹۰۲ء میں خواب دیکھا کہ چاند ان کی جھولی میں آگرا ہے۔ انہوں نے سید محمد شاہ صاحب سے تعبیر پوچھی۔ اُنہوں نے کہا کہ تم کسی بہت بڑے بزرگ کی بیعت کروگے۔ اُن دنوں ماسٹر صاحب ۱۵ دن تک ماچھی واڑہ میں اور ۱۵ دن تک سمرالہ سکول میں کام کرتے تھے۔ سمرالہ اور ماچھی واڑہ کے درمیان نہر سرہند بہتی ہے جو بجائے خود ایک بڑا دریا ہے۔

ماچھی واڑہ کے قریب ایک گاؤں کوہاڑ ہے وہاں پر ایک فقیر رہتا تھا، وہ کسی سے کلام نہ کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ عمر بھر میں وہ صرف دو دفعہ بولا ہے ایک دن کہا کہ امام مہدی کا ظہور ہونے ہی والا ہے اور ایک دفعہ کہا کہ اب امام مہدی ظاہر ہو چکا ہے۔ ماسٹر ماموں خان صاحب بھی امام مہدی کے متلاشی تھے۔ سیّد محمد شاہ صاحب سے بوجہ سکول میں ملازمت کے ہر وقت گفتگو رہتی تھی۔ اُنہوں نے ماسٹر صاحب کو حضرت اقدسؑ کے دعویٰ سے مطلع کیا۔ مگر کسی وجہ سے ماسٹر صاحب سکول کی ملازمت ترک کر کے بہاول پور پولیس میں نوکر ہوگئے تھے، وہیں سے بذریعہ خط بیعت کی۔ بیعت کے خط کا جواب حضرت مولوی عبدالکریم صاحبؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ ہے۔ دستی بیعت ۱۹۰۶ء میں کی تھی۔

وہیں پر ایک دفعہ ماسٹر صاحبؓ نے ایک مشہور ڈاکو کو تنِ تنہا گرفتار کر لیا۔ افسران بہت خوش ہوئے اور ان کا نام ترقی کے لئے اُوپر بھجوایا گیا۔ اُدھر قادیان کے اخبارات میں ہائی سکول قادیان کے لئے ایک ڈرل ماسٹر کی ضرورت کا اشتہار شائع ہوا۔ ماسٹر صاحب نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔ حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ ہیڈ ماسٹر تھے انہوں نے لکھا کہ آپ کس قدر تنخواہ قبول کریں گے؟ ماسٹر صاحبؓ نے جواباً لکھا کہ مجھے صرف دو روٹیاں کافی ہیں۔ مولوی صاحبؓ نے لکھا کہ وضاحت سے لکھیں کہ آپ کا مطلب کیا ہے؟ انہوں نے پھر لکھا کہ صرف دو روٹیاں درکار ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ اقل ترین گزارے پر قادیان کی رہائش کو ترجیح دیں گے۔ جب یہ معاملہ حضرت علیہ السلام کے حضور پیش ہوا تو حضورؑ نے فرمایا کہ ''روحانی آدمی معلوم ہوتے ہیں ان کو بلوالیا جائے''۔

(روایت ماسٹر ماموں جان صاحبؓ)

ماسٹر صاحبؓ کا حلیہ یہ تھا کہ اُس زمانہ کے رواج کے مطابق سر پر خاصی بڑی پگڑی، آنکھیں ذرا چندھیائی ہوئی سی، رنگت قدرے سیاہی مائل، داڑھی خاصی بڑی، قد ۵ فٹ تھا۔

ہر ملنے والے کو سلام کرنے میں پہل کرتے۔ بہت خوش اخلاق۔ مسافر نواز۔ ہمدرد۔ بچوں کو نصیحت کرتے۔ محنت مشقت سے کبھی عار نہ کی۔ ذکرِ الٰہی اور تہجد کے عادی۔ تبلیغ سلسلہ کے بڑے مشتاق تھے۔ اپنے مافی الضمیر کو بڑی وضاحت سے مگر سادہ زبان میں بیان کرتے تھے۔ قادیان کے نواحی دیہات میں جا کر تبلیغ کرتے تھے۔ خصوصاً

شمالی جانب موضع ٹھیکری والہ میں تو بالالتزام تبلیغ کے لئے جایا کرتے تھے۔ اُن کی تبلیغ سے مختلف دیہات میں سینکڑوں لوگوں نے بیعت کی مگر ماسٹر صاحبؓ نے کبھی اس بات پر فخر نہ کیا۔ وہ تو اسے فریضہ خیال کرتے تھے۔

طبیعت کی سادگی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ ریفریشر کورس کے لئے لاہور گئے۔ وہاں کُل تین آدمی آئے تھے۔ تینوں پاس ہوگئے۔ ماسٹر صاحبؓ نے واپس آکر بیان کیا کہ وہ پاس ہوگئے ہیں اور وہ تینوں میں سے تھرڈ آئے ہیں۔

پہلی شادی اپنے وطن میں کی۔ اہلیہ کا نام جنت بی بی تھا۔ راقم الحروف نے انہیں دیکھا تھا۔ بہت نیک، مسکین طبع، پارسا، دعا گو خاتون تھیں۔

قادیان میں ان کو تپدق ہوگیا۔ حضرت مولانا حکیم نورالدین صاحبؓ معالج تھے مگر مرض بڑھتا گیا۔ تنگ آکر ایک دن ماسٹر صاحبؓ نے حضرت مسیح موعودؑ سے دعا کی درخواست کی اور کہا کہ آپ خدا کے مسیح ہیں اس کے لئے دعا فرمائیں ورنہ میں تو مایوس ہو چکا ہوں۔

حضورؑ نے فرمایا کہ مومن تو مایوس نہیں ہوا کرتے۔ آپ بھی دعا کرتے رہیں میں بھی دعا کروں گا۔ خدا کی شان کہ کچھ عرصہ بعد صحت ہونی شروع ہوگئی اور بالآخر مرض بالکل جاتا رہا۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ نے ان کو ایک لڑکا دیا جس کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ مگر کئی سال بعد مرض پھر عود کر آیا اور وہ فوت ہوگئیں۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے ماسٹر صاحب کی دوسری شادی لدھیانہ کی ایک پٹھان عورت محمودہ بیگم صاحبہ سے کرادی۔ یہ خاتون اپنے ہمراہ دو بچے بھی لائیں جو آج بھی ماسٹر صاحبؓ کی دوسری اولاد کے ساتھ جیمس آباد سندھ میں ہیں۔

باوجود تنگی کے ماسٹر صاحب کے مُنہ سے کبھی شکوہ نہیں سنا۔ جنگ عظیم اول کے اختتام کے قریب آٹا روپے کا اڑھائی سیر ملتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایک کثیر العیال خاندان کا ایک دن بمشکل پورا ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحبؓ کے ذمہ میاں صدرالدین صاحب صحابی سابق درویش کا ۱۵۰/۔ روپے قرض ہوگیا۔ ایک دن پھر آٹا لینے چلے گئے اور بڑی عاجزی سے کہنے لگے کہ میاں صدرالدین! مَیں پھر آٹا لینے آگیا ہوں گو میرے ذمہ پہلے ہی آپ کا کافی بقایا ہے۔ اتنا ہی سُن کر اُس مردِ خدا نے کہا ''یار ماموں خان! بچوں کو بھوکا نہ رکھنا تم جتنا چاہو آٹا لے جایا کرو۔ قرض ادا ہو ہی جائے گا''۔ چونکہ ماسٹر صاحب کی نیت بھی قرض ادا کرنے کی تھی ایک دفعہ ایک ایسی رقم مل گئی جس کا کبھی خواب وخیال بھی نہ تھا اور قرضہ یکمشت ادا کر آئے۔

ایک دفعہ ان کے ایک عزیز دوست پر کچھ سختی کے ایام آگئے۔ اُدھر اُن کو ایک جگہ جانا تھا۔ زادِ راہ بھی نہ تھا اور جوتا بالکل ناکارہ سا تھا۔ ماسٹر صاحبؓ کو علم ہوا تو کچھ روپے اور اپنا جوتا دے آئے جو اُن کے ناپ کے برابر تھا۔ یہ دونوں اشیاء گو چند دن بعد نہایت شکریہ سے واپس کردی گئیں مگر ماسٹر صاحب کی ہمت دیکھئے۔ تھوڑے دنوں بعد اسی دوست نے جبکہ اس کا ابتلاء ختم ہوگیا تھا ماسٹر صاحب کو ایک رقم پیش کی۔ گو ماسٹر صاحب نے شکر کے ساتھ

انکار کیا مگر انہوں نے دیکر ہی دم لیا۔

جنگِ عظیم اول کے دوران ہی وارفیورو بائی صورت میں پھیل گیا۔ قادیان میں بھی اس بخار نے بڑی تباہی مچائی۔ بہت لوگ فوت ہوئے۔ میرا چھوٹا بھائی ناصر بعمر چار سال بھی فوت ہو گیا۔ ہم ان دنوں دار الفضل میں رہا کرتے تھے جہاں صرف ۴،۵ گھر آباد تھے۔ ہم فکر مند تھے کہ قبر کھودنے کے لئے کس کو کہا جائے۔ اتنے میں ماسٹر ماموں خان صاحب آئے اور کہنے لگے کہ وہ قبر تیار کر آئے ہیں۔

ماسٹر صاحب، صاحبِ رؤیائے صادقہ وکشوف تھے۔ تمام واقعات تو نہیں لکھے جاسکتے صرف ایک لکھ دیتا ہوں کہ جب تقسیم ملک کے بعد ماسٹر صاحب جیمس آباد سندھ میں مقیم تھے آنکھیں جو پہلے ہی خراب رہتی تھیں زیادہ خراب ہو گئیں۔ آپریشن بھی کامیاب نہ ہوا اور بینائی بالکل زائل ہو گئی۔ ایک دن انہوں نے کشف میں دیکھا کہ ماسٹر حسن محمد صاحب ساکن کلوسوہل نزد قادیان ماسٹر صاحبؓ سے ملاقات کے لئے آئے ہیں ماسٹر صاحب نے بچوں کو آواز دی کہ دیکھو ماسٹر صاحب آئے ہیں ان کو بٹھاؤ۔ بچوں نے کہا کہ یہاں تو کوئی نہیں آیا ہوا۔ خدا کی قدرت تھوڑی دیر بعد فی الواقعہ ماسٹر حسن محمد صاحب تشریف لے آئے۔ اس بات کی تصدیق ہم نے ماسٹر حسن محمد صاحب سے کرائی ہے۔

شہر ماچھی واڑہ میں حضرت مسیح موعودؑ کا ایک اور نشان بھی ظاہر ہوا جس کی تفصیل یہ ہے کہ لیکھرام کے قتل (۶ مارچ ۱۸۹۷ء) کے بعد اپریل میں حضورؑ نے آریوں کو مخاطب کر کے اشتہار دیا کہ اگر کوئی بہادر کلیجہ والا آریہ ہے تو وہ قسم کھا کر اعلان کر دے کہ لیکھرام کا قتل مرزا غلام احمد کے ایماء اور حکم سے اور سازش سے ہوا ہے۔ اے خدا اگر یہ بیان غلط ہو تو ایک سال کے اندر مجھ پر ایسا دردناک عذاب آئے کہ دنیا سمجھ لے کہ یہ کسی انسانی تدبیر کا نتیجہ نہیں۔ اس کے بعد اگر وہ میری بددعا سے بچ گیا تو میں مجرم اور اُس سزا کے قابل ٹھہروں گا جو ایک قاتل کو ہوتی ہے۔ اور تو کوئی مقابل نہ آیا مگر ماچھی واڑہ کا گنگا بشن سود جو پولیس میں ملازم تھا اُس نے اشتہار دیا کہ وہ قسم کھانے کو تیار ہے۔ اور یہ بھی لکھا کہ وہ لیکھرام کا قائم مقام ہے لیکن شرط یہ ہوگی کہ اگر پیشگوئی پوری نہ ہو تو پیشگوئی کرنے والے کو پھانسی دی جائے۔ دوسرے وہ پہلے دس ہزار روپے جمع کرائے جو پیشگوئی پوری نہ ہونے کی صورت میں گنگا بشن کو ملے۔ تیسرے یہ کہ جب وہ قسم کھانے کے لئے قادیان آئے تو اُسے قتل نہ کر دیا جائے مرزا صاحب اس کی گارنٹی دیں۔ حضور نے ۱۵ اپریل ۱۸۹۷ء کے اشتہار میں اس کی سب شرائط منظور فرمالیں۔

اب جب گنگا بشن سود کو موت سامنے نظر آنے لگی تو اُس نے ایک شرط اور بڑھا دی کہ جب مرزا صاحب جھوٹے ثابت ہوں تو پھانسی کے بعد ان کی لاش مجھے دی جائے تاکہ میں اُسے جلا کر دریا برد کروں۔ حضور علیہ السلام نے یہ شرط بھی مان لی مگر یہ بھی فرمایا کہ گنگا بشن ان الفاظ میں قسم اُٹھائے کہ:۔

''بالضرور لیکھرام غلام احمد کی سازش اور شرکت سے قتل کیا گیا ہے اور پورے یقین سے جانتا ہوں کہ یہ

پیشگوئی خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں تھی بلکہ ایک انسانی منصوبہ تھا جو پیشگوئی کے بہانے سے عمل میں آیا۔ اگر میرا یہ بیان صحیح نہیں ہے تو اے خدائے قادر مطلق اس شخص کا سچ ظاہر کرنے کے لئے اپنا یہ نشان دکھلا کر ایک سال کے اندر مجھے ایسی موت دے کہ جو انسان کے منصوبہ سے نہ ہو اور میں ایک سال کے اندر مر گیا تو دنیا یاد رکھے کہ میرا مرنا اس بات پر گواہی ہوگی کہ واقعی طور پر یہ خدا کا الہام تھا انسانی سازش نہیں تھی اور نیز یہ کہ واقعی طور پر سچا دین اسلام ہے اور دوسرے تمام مذاہب جیسے آریہ مذہب، سناتن دھرم اور عیسائی وغیرہ تمام بگڑے ہوئے عقیدے ہیں۔''

یہ بھی حضورؑ نے فرمایا کہ اگر گنگا بشن ایک سال کے اندر مر جائے تو اس کی لاش ہم کو ملے اور وہ اس کی ضمانت کے طور پر دس ہزار روپے بنک میں جمع کرائے کیونکہ اگر اس کے ورثاء مجھے اس کی لاش نہ دیں تو دس ہزار روپے مجھے مل جائیں۔

گنگا بشن نے اعلان کر دیا کہ چونکہ اُس کے پاس اس قدر روپیہ نہیں ہے اسلئے معاملہ ختم سمجھا جائے۔ مگر حضورؑ نے ۲۷۔اپریل کو پھر اشتہار دیا کہ آریہ سماج کو فکر چاہیئے۔ اگر گنگا بشن کے پاس دس ہزار روپیہ نہیں تو آریہ سماج جمع کرا دے۔ جو لیکھرام کے قاتل کے لئے گراں رقوم بطور انعام رکھتے ہیں یہ نفع کا سودا کیوں نہیں کرتے۔ میرا جھوٹ ثابت کرنے پر تمہارا جمع شدہ دس ہزار روپیہ اور میری لاش اور میرا جمع کرایا ہوا دس ہزار روپیہ مل جائے گا۔ گھبراتے کیوں ہو؟ مگر جھوٹ کے پاؤں کہاں۔ کچھ دنوں میں سب آریہ دبک کر بیٹھ گئے۔

اب خدا کی قدرت کا تماشا دیکھئے کہ سیّد عبدالہادی شاہ صاحبؓ نے حضور علیہ السلام کو ایک خط لکھا اور لکھا کہ میں خیریت سے ہوں وغیرہ۔ اتفاق سے اُسی دن گنگا بشن نے بھی اپنے معاملہ کے متعلق حضرت اقدسؑ کو خط لکھا جس کے آخر میں اُس نے از راہِ شرارت یہ لکھ دیا کہ آپ کا مرید عبدالہادی سخت بیمار اور لاچار ہے۔

دونوں خطوط ایک ہی وقت میں ماچھی واڑہ سے ڈاک میں ڈالے گئے۔ ایک ہی وقت میں قادیان پہنچے۔ حضورؑ نے ڈاک میں پہلے سیّد عبدالہادی صاحبؓ کا خط ملاحظہ فرمایا کہ ''اس اندھے کو اپنے قصبہ میں رہ کر یہ بھی نظر نہ آیا کہ ہمارے دوست تو خیریت سے ہیں۔''

بس یہ فقرہ گنگا بشن کو لے ڈوبا۔ اس کے جلد بعد ہی اس کی آنکھوں کا نور جاتا رہا۔ بظاہر اُس کی آنکھیں بالکل درست تھیں، نہ کوئی بیماری ہوئی نہ درد ہوا مگر بینائی جاتی رہی۔ جتنے طبیبوں نے اُسے دیکھا یہی کہا کہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ حتّٰی کہ لدھیانہ کے مشہور مشنری ڈاکٹر سمتھ صاحب نے بھی اُسے کہہ دیا کہ تم مکر کرتے ہو مگر وہ پکار پکار کر کہتا تھا اور مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

خدا کے پیارے کو چھیڑنے کا مزہ آ گیا۔ ابھی گنگا بشن کے لئے ایک اور سزا باقی تھی۔ وہ اس طرح کہ جلد بعد اُسے فالج ہو گیا۔ چلنے پھرنے سے قطعی معذور ہو گیا۔ حتّٰی کہ ہسپتال میں دوسروں کے کندھے پر سوار ہو کر جایا کرتا تھا۔ ماسٹر ماموں خان صاحبؓ نے اپنی روایات میں لکھا ہے کہ ''گنگا بشن کو میں نے اُڑاتے دیکھا ہے۔'' اس پنجابی

لفظ کے معنی ہیں کہ وہ مہیب آوازیں نکالا کرتا تھا۔ اور ایک سال کے اندر اندر وہ بڑی تکلیف اور حسرت سے مرا۔

یہ وہ شخص تھا جو اپنے آپ کو لیکھرام کا قائم مقام کہتا تھا۔ دونوں میں مماثلتیں بھی خوب ہیں دونوں شاتم رسول مقبول صلعم تھے۔ دونوں آریہ سماج کے ممبر تھے۔ دونوں پولیس میں ملازم تھے دونوں پر غیر معمولی عذاب وارد ہوا۔

حضرت ماسٹر ماموں خان صاحبؓ نے ۲۱۔ اپریل ۱۹۶۱ء بعمر ۹۰ سال جیمس آباد سندھ میں وفات پائی اور ۲۲۔ اپریل بعد نماز مغرب بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئے۔ بہت خوب آدمی تھے۔

اللّٰھمّ اغفرلہٗ واجعل جنۃ الماویٰ مسکن لہٗ۔

حکیم مرہمِ عیسیٰ

داغ دہلوی کا مشہور شعر ہے۔

داغ کا نام سن کے فرمایا
آدمی کا یہ نام ہوتا ہے!

اگر داغ کسی آدمی کا نام ہو سکتا ہے تو یقین فرمائیں کہ ”مرہم عیسیٰ“ بھی ایک آدمی کا ہی نام ہے۔ والدین نے تو محمد حسین نام رکھا تھا۔ مگر ”مرہم عیسیٰ“ نام نے اس قدر شہرت پائی کہ لوگ اصلی نام تقریباً بھول ہی گئے تھے۔

آپ حضرت میاں چراغ دین صاحب (وارث میاں سلطان محمد صاحب ٹھیکیدار جنہوں نے لاہور ریلوے سٹیشن تعمیر کرایا تھا اور کئی لاکھ روپے کے بل گورنمنٹ کو معاف کر دیئے تھے) کے فرزند اکبر تھے۔ میاں چراغ دین کے آبائی مکان لاہور میں لنگے منڈی یعنی اندرون شہر تھے۔ مگر نئے مکانات بیرون دہلی دروازہ بنانے پر مستقل طور پر یہاں رہائش اختیار کر لی۔ چنانچہ مبارک منزل میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ یہاں فروکش ہوتے رہے۔ عرصہ تک نچلی منزل میں باجماعت نمازیں ادا کرتے رہے۔ درس القرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ حضور علیہ السلام نے اپنے آخری سفر کے ایام میں یہاں ہی قیام فرمایا تھا۔ بعد میں خواجہ کمال الدین صاحب نے میاں چراغ دین صاحب سے اجازت طلب کی اور حضور بمع خاندان احمدیہ بلڈنگس تشریف لے گئے تھے۔

حکیم محمد حسین صاحب المعروف بہ مرہم عیسیٰ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ حضرت حافظ رحیم اللہ صاحب رضی اللہ عنہ سے مسجد لنگے منڈی میں قرآن مجید پڑھا اور اس وقت کی مروجہ تعلیم عربی فارسی کے بعد طب کی تکمیل مفتی ضیاء الدین صاحب لاہوری سے کی اور انہی کے مشورہ سے پنجاب یونیورسٹی کے سہ سالہ کورس میں اول آکر ”زبدۃ الحکماء“ کی سند لی اور خود مطب کرنے لگے۔ ۱۸۹۲ء میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ نیز قادیان جا کر لقمان الملک حضرت حاجی حکیم نور الدین صاحبؓ سے بھی طب پڑھی حضرت مسیح موعود چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے متعلق دلائل جمع کرنے کی طرف خاص توجہ فرما رہے تھے۔ اسی کے زیر اثر حکیم محمد حسین صاحب کو خیال آیا کہ معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ کون سی دوا تھی جس کے ذریعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گہرے زخم مندمل ہوئے۔ یہ بہت مشکل کام تھا تاہم پرانی کتب طب یونانی سے محنتِ شاقہ کے بعد اور ساتھ ہی پنجاب پبلک لائبریری لاہور سے انگریزی کتب کی مدد سے اس مرہم کے اجزاء دریافت کر کے ہی دم لیا اب مشکل یہ آن پڑی کہ ان ادویہ میں سے بعض ہندوستان میں مطلق دستیاب نہ تھیں۔ مگر ولائت میں Messers Burroughs Wellcome coydondor. سے مل گئیں۔ زر کثیر خرچ کر کے مرہم بنائی اور اشتہار دے دیا۔ ساتھ ہی ایک کتابچہ میں ”مرہم عیسیٰ“ کی مکمل تاریخ دے دی اور تمام شہر لاہور میں بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کرا دیئے اور اطراف

میں بھی پھیلا دیئے ۔ اشتہار کے اوپر نہایت جلی قلم سے ''مرہم عیسیٰ'' مرہم رسل ۔ مرہم حواریوں'' لکھا تھا۔ اور نیچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وہ شبیہہ جو عام طور پر گرجوں میں پائی جاتی تھی یعنی صلیب پر لٹکے ہوئے اور ہاتھ پاؤں میں لمبے لمبے کیل گڑے ہوئے یہ اشتہار لاہور کے اس وقت کے چوٹی کے خوشنویس تھو صاحب نے لکھا اور رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے مشہور عالم پریس میں طبع ہوئے ۔ جو گورنمنٹ کالج کے عقب میں اب بھی موجود ہے۔

اسی اشتہار پر عیسائی صاحبان نے بہت احتجاج کیا کہ مرہم عیسیٰ نام غیر مناسب ہے اور مطالبہ کیا کہ اسے ضبط کر کے مشتہر پر مقدمہ چلایا جائے کیونکہ عیسائیوں کی سخت دل آزاری ہوئی ہے۔

چنانچہ پولیس نے حکیم صاحب کو گرفتار کر لیا تو ضمانت پر رہا ہو گئے ۔ حکیم صاحب فوراً قادیان گئے اور حضرت مسیح موعود السلام سے سارا ماجرا عرض کیا۔ حضورؑ بڑے خوش تھے ۔ کہ چلو اس طرح تبلیغ کا ایک اور موقعہ ہاتھ آیا ہے اب عیسائیوں پر حجت ہو جائے گی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب سے بچ کر یہ دوا استعمال کر کے صحت یاب ہو گئے تھے۔

حکیم محمد حسین صاحب نے جناب خواجہ کمال الدین صاحبؒ لاہور کے ایک بنگالی کالی پرسن کو اپنا وکیل بنایا۔ دوسرے دن ڈپٹی کمشنر کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے حکم دیا کہ حکیم صاحب سارے شہر میں چسپاں کردہ اشتہارات جلد ترا تروائیں ۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ یہ کام میرے موکل سے تو ممکن نہیں ہاں اگر آپ پولیس کو حکم دیں تو وہ ضرور کرے گی وہ پہلے ہی غصہ میں بیٹھا تھا۔ اور بھی سیخ پا ہو گیا اور حکیم صاحب کے خلاف فوراً فیصلہ لکھوا دیا۔ جس کی اپیل خواجہ صاحب نے عدالت سیشن میں کر دی۔

سیشن جج بھی انگریز تھا۔ اس نے ایک بات بھی نہ سنی اور حکیم صاحب کے خلاف فیصلہ لکھ دیا۔ اس کی اپیل چیف کورٹ لاہور میں دائر کی گئی۔

ادھر حکیم صاحب دم بدم تمام حالات کی اطلاع حضرت اقدس کو قادیان میں بھجوار ہے تھے ۔ ہائی کورٹ میں تاریخ مقرر ہوئی تو حکیم صاحب پھر قادیان گئے اور دعائے خاص کیلئے عرض کیا۔ حضور علیہ السلام نے بہت تسلی دی اور فرمایا کہ:۔

''مجھے تو خدا نے پہلے ہی الہاماً بتا دیا ہے کہ حسینؔ کو ٹیپوؤں کے شر سے بچایا گیا ہے۔''

(تذکرہ طبع ثانی صفحہ ۶۷۷)

جب عدالت عالیہ میں مقدمہ پیش ہوا تو بڑے بڑے پادری صاحبان تشریف لائے اوپر سے کثیر تعداد میں مسلمان بھی پہنچ گئے ۔ انگریز جج مسل کا مطالعہ کر کے غصے میں بھرا آگ بھبھوکا ہو رہا تھا۔ پوچھا کہ ''یہ اشتہار کس شخص نے لکھے ہیں؟'' حکیم صاحب کھڑے ہو گئے ۔ مگر جج نے انھیں نہ دیکھا۔ اس نے دوبارہ کہا کہ ''یہ اشتہار کس شخص نے لکھا ہے؟'' حکیم صاحب پھر کھڑے ہو گئے ۔ مگر جج نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا تو وکیل کالی پرسن نے عدالت کو مخاطب کر کے کہا کہ:۔

''یہ کیسی عدالت ہے کہ میرا موکل تین دفعہ سامنے کھڑا ہوا ہے اور جج صاحب کو نظر ہی نہ آیا۔''

اب مقدمہ کی کاروائی شروع ہوئی تو جناب خواجہ صاحب نے پرانی طبی کتب پیش کر کے استدلال کیا کہ "مرہم عیسیٰ" نام کوئی آج کا نہیں ہے سینکڑوں برس سے کتابوں میں موجود ہے اور عام طور پر مروج ہے اور ساتھ ہی حضرت اقدسؑ کی اس تحریر کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر سنایا جو حضورؑ نے حکیم صاحب کو خاص اس موقعہ کے لئے لکھ کر دی تھی اور تاکید کی تھی کہ جج کو ضرور سنائی جائے حضورؑ نے فرمایا تھا کہ:۔

"انجیل سے ثابت ہے کہ واقعہ" صلیب کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو اپنے زخم دکھائے۔ان حواریوں میں سے ایک طبیب بھی تھا۔(یعنی لوقا جس کو پیارا طبیب بھی کہتے ہیں) اور یہ بھی مسلّم ہے کہ حضرت عیسیٰ کی زندگی میں (جو بقول عیسائیوں کے ۳۳ برس ہے) سوائے واقعہ صلیب کے کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس کے لئے مرہم تیار کی گئی ہو تو ثابت ہوا کہ وہ یہی مرہم ہے۔جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زخموں کو مندمل کیا تھا۔" اس پر پادری صاحبان ششدر رہ گئے۔جج نے یہ بھی کہا کہ اگر اس مرہم کا نام کوئی اور رکھ دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ:۔

"آج عیسائی حضرات "مرہم عیسیٰ" پر اعتراض کرتے ہیں۔کل ہندو" گاؤ زبان" اور" گاؤ دنتی" پر اعتراض کریں گے۔نیز عیسائی صاحبان "عودِ صلیب" اور "پنجہ مریم" پر بھی اعتراض کریں گے"۔

جج اس دلیل سے بہت متاثر ہوا۔آخر حکم دیا کہ اس مرہم کا نام تو یہی رہے گا۔مگر اشتہار میں جو تصویر حضرت عیسیٰؑ کی بنائی ہے وہ حذف کر دی جائے اور کچھ عبارت میں بھی ترمیم کر دی جائے۔

گویا کہ حکیم محمد حسین صاحب کو نمایاں فتح ہوئی۔حکیم صاحب نے نئے اشتہار طبع کرائے پہلے سے زیادہ تعداد میں چسپاں کرائے اور خوب تقسیم کئے۔حتّٰی کہ ان کا نام ہی "حکیم مرہم عیسیٰ" مشہور ہو گیا۔

"حکیم صاحب قرآن مجید کے عاشق تھے۔گہرا علمی شغف رکھتے تھے۔اور حضرت اقدسؑ کی کتب پر خوب عبور تھا۔تاہم ۱۹۱۴ء میں خلافت ثانیہ کے وقت جماعت لاہور کے ہم نوا ہو گئے۔مگر ایک بات تھی کہ ان کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی ذات سے انس تھا جو حکیم صاحب کو آخر کار کھینچ کر لے ہی آیا۔اور بیعت خلافت کر لی۔خدا نے دستِ شفا بخشا تھا۔مرہم سے مالی نفع بھی خوب ہوا۔ویسے بھی آپ کثیر العیال تھے صحت بھی خوب پائی تھی۔

۲۸۔اکتوبر ۱۹۵۵ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ ربوہ میں اندرونی چاردیواری کے جانب مشرق دفن ہوئے۔مسیح موعود علیہ السلام نے ۳۱۳ صحابہؓ کی فہرست میں نمبر ۲۷۱ پر ان کا نام درج کیا ہے۔

اس مقدمہ میں حکیم صاحب نے علاوہ اخراجات کثیر کے بڑی کوفت اٹھائی مگر حضور علیہ السلام کے اعلان کی خوب تائید کی جبھی تو حضرتؑ نے درثمین میں لکھا ہے

مرہم عیسیٰ نے دی تھی محض عیسیٰ کو شفا
میری مرہم سے شفا پائے گا ہر ملک و دیار

(ماہنامہ خالد ستمبر ۱۹۷۵ء)

گورداس حلوائی

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ۲۰ فروری ۱۹۰۷ء کو رسالہ ''قادیان کے آریہ اور ہم'' تحریر فرمایا جس میں قادیان کے ان ہندوؤں کو مخاطب کیا ہے جو صدہا نشانات دیکھ چکے تھے اور پھر بھی حضرت کے نہ صرف مکذب رہے بلکہ ہر طریق سے اذیت دیتے رہے ایسے لوگوں میں سرفہرست مہاجن لالہ بڈھا مل تھے جنہوں نے ۱۹۰۰ء میں سرکار میں رپورٹ کردی تھی کہ مسجد اقصیٰ میں منارۃ المسیح نہیں بننا چاہیئے کیونکہ اس سے ہمارے گھروں کی بے پردگی ہوگی جب ڈپٹی کمشنر گورداسپور نے تحصیل دار بٹالہ کو جو خود ہندو تھا موقعہ دیکھ کر رپورٹ کرنے کے لئے قادیان بھیجا تو اس کے روبرو باتیں کرتے ہوئے حضرتؑ نے فرمایا ''یہ بڈھا مل بیٹھا ہے آپ اس سے پوچھ لیں کہ بچپن سے لے کر آج تک کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ اسے فائدہ پہنچانے کا موقعہ ملا ہو اور میں نے فائدہ پہنچانے میں کمی کی ہو اور پھر اس سے پوچھیں کہ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ مجھے تکلیف دینے کا اس کو موقع ملا ہو اور اس نے مجھے تکلیف دینے میں کسر چھوڑی ہو۔ تو بڈھا مل کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا اور سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا تھا۔''

(مجدّد اعظم جلد اوّل ۶۹۱)

آخر کار حضرت نے ۱۹۰۳ء میں منارۃ المسیح کی بنیاد رکھی۔ قادیان میں بعض ہندو گھرانے بستے تھے جن سے حضرت کے بڑے اچھے تعلقات تھے ان میں سے لالہ ملاوامل صاحب۔ لالہ شرم پت صاحب۔ سیٹھ کنہیا لعل صاحب پنڈت رام لعل بڑے اچھے لوگ تھے یہ سب حضرت اقدس کی عزّت کرتے تھے اور ان کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوا کرتے تھے ۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک گورداس مل حلوائی بھی تھا جو اپنے آپ کو احمدی بھی کہا کرتا تھا کیونکہ وہ حضرتؑ صاحب کا بہت ادب کیا کرتا تھا۔

گورداس مل ساڑھے چھ فٹ کا لمبا۔ بڑا ہی خوبصورت نوجوان تھا۔ ناک نقشہ بھی بہت اچھا تھا۔ اس کی ماں بھی بہت بلند قامت اور صحت در عورت تھی۔ اکثر وہ حضرت اقدس کے گھروں میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہوا کرتی تھی۔ یہ شخص فوجی پینشنر بھی تھا۔ ایک دفعہ قادیان میں بھرتی کرنے والا ایک انگریز افسر حضرت میاں شریف احمد صاحبؓ کا مہمان ہوا تو گورداس حلوائی بھی فوجی وردی پہن کر اس سے ملا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اس کے سینے پر تین تمغے لگے ہوئے تھے جن میں سے ایک ۱۹۰۵ء کی تبت کی مہم کا تھا۔ گورداس مل ہمیشہ احمدی بزرگوں کو جھک کر سلام کیا کرتا اور ادب سے بات کرتا تھا۔ کبھی کسی مخالف سوسائٹی میں شریک نہ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ گورداس مل عید کے دن عمدہ قلاقند بنا کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا تھا۔ حضور کے سامنے جاتے ہی کہا ''حضرت جی۔ گورداس احمدی حلوائی آ گیا ہے'' حضور نے اس پر خوشنودی کا اظہار

فرمایا۔اس کا تحفہ قبول کیا اور انعام دے کر روانہ کیا تھا یہ واقعہ اس نے خود بازار میں سنایا تھا۔

حضرت میاں بشیر احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دفتر تعلیم کے وظائف سے -/۷ روپے ماہوار اس کی والدہ کے لئے مقرر کئے ہوئے تھے اور مجھے ہدایت تھی کہ اس عورت کا وظیفہ جلد سے جلد اس کے گھر جا کر خود ادا کیا کروں۔ایک دفعہ بیچاری بڑی مشکل سے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ کر میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی۔اغلباً گورداس کی فوتیدگی پر اس کی پینشن کا کچھ معاملہ تھا میاں صاحب نے اسے تسلّی دی تھی کہ جو تکلیف ہوا کرے ان سے کہہ دیا کرے۔

میرے چچا محترم علی محمد صاحب بی اے بی ٹی نے مجھے بتایا کہ جب وہ ۱۹۰۷ء میں قادیان میں ساتویں جماعت میں آکر داخل ہوئے تھے تو رمضان میں سحری کے وقت گورداس مل دہی کے کونڈے لے کر آجاتا تھا اور آواز لگایا کرتا تھا۔''دہی کے لچھے'' دہی بہت اچھا ہوتا تھا۔لوگ بڑے شوق سے خرید اکرتے تھے۔

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان مارچ ۱۹۷۶ء)

یادیں میاں خُدا بخش صاحب

دنیا تو سبھی کماتے ہیں اور سب سے بہتر حلال کی کمائی ہوتی ہے اور یہ کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ایسے لوگوں میں سے ایک میاں خدا بخش بھی تھے۔قادیان کے قریبی گاؤں تغل والہ کے رہنے والے تھے۔سعادت ازل سے حمیت نصیب ہوئی اور قادیان میں محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کیا کرتے تھے۔سوائے اس کے کہ کام پر ہوں ان کا اکثر وقت مساجد میں ذکرِ الٰہی میں بسر ہوتا تھا۔بیوی کوئی نہ تھی۔اس لئے ''فارغ البال'' تھے۔نمازِ عشاء کے بعد کثرت سے نوافل ادا کرتے تھے۔پھر وہیں سو جاتے اور تہجد کے وقت پھر نفل ادا کرتے۔فجر کی نماز کے بعد وہیں تلاوت میں مصروف ہو جاتے تھے اور اشراق کی نماز کبھی قضا نہ کرتے۔بہت کم گو انسان تھے۔میں نے ان کو اور حضرت مولوی شیر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نماز اشراق پڑھتے دیکھا ہے۔مشکل سے ہی ختم ہوا کرتی تھی۔

۱۹۲۸ء میں جب قادیاں میں ریل آئی تو انہوں نے رزقِ حلال حاصل کرنے کے لئے قلیوں میں نام درج کر کے لائسنس لے لیا۔قلیوں کے لئے ایک یونیفارم مقرر ہوتی ہے یعنی سُرخ قمیص۔ایک دن وہ قمیص پہنے بازار سے گزر رہے تھے ایک ظریف نے پوچھا۔''یہ سُرخ قمیص کہاں سے لی ہے؟'' یہ خاموش رہے مگر اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔جب ادھر سے گزرتے وہ یہی سوال کر دیتا۔جب دق کیا تو یہ بولے کہ'' جاؤ دفع ہو جاؤ!'' ان لوگوں کو مشغلہ ہاتھ آ گیا۔کسی نے کہہ دیا۔قمیص پہن کر یوں معلوم ہوتے ہو جیسے پکا ہوا لال کریلہ۔دوسرے نے کہا کریلہ پھر نیم چڑھا۔تیسرے نے کہہ دیا۔یار کریلہ کہاں ہے یہ تو بھنڈی ہے۔چوتھے نے کہا اس کو استاد بھنڈی کہا کرو۔

کافی عرصہ تک بیچارے خدا بخش نے صبر کیا مگر بازار کے شرارتی لونڈے کہاں باز رہتے۔''استاد بھنڈی۔لال کریلہ'' ہر طرف سے نعرے لگتے۔

رفتہ رفتہ یہ بات سکول کے بچوں میں بھی پھیل گئی اب سب چھیڑنے لگے۔یہ بھی آخر انسان تھے گھبرا کر کسی کو ہاتھ مار دیتے کسی کو گالی دیتے۔وہ اور تنگ کرتے۔کوئی کپڑا کھینچ لیتا۔

جس روز کوئی بچہ نہ چھیڑتا تو خود بخود کہنے لگتے'' آج پتہ نہیں کہاں مر گئے سارے!'' پھر کوئی بچہ دیکھ لیتا تو وہی نعرہ لگا کر بھاگ جاتا اور یہ سلسلہ جاری رہتا۔

خود میرے بچوں نے ان کو ایک دن گھیر لیا۔تو میرے پاس دفتر میں شکایت کی۔میرے منع کرنے کے بعد انہوں نے کبھی نہ چھیڑا۔اب ان کا اصل نام بہت کم لوگوں کو یاد تھا۔استاد کے نام سے سبھی جانتے تھے۔میاں خدا بخش صاحب محنتِ شاقہ کے عادی تھے ایک دفعہ ایک خاصی بھاری الماری اٹھائی تھی کسی نے پوچھا ''اٹھا لو گے؟'' کہنے لگے اگر دو آدمی ایک دفعہ میرے سر پر رکھ دیں تو پھر انشاء اللہ لے ہی جاؤں گا۔یعنی مشقت اور محنت سے عار نہ تھا۔

تقسیم ملک کے بعد یہ درویش بن کر قادیان میں دریار پر دھونی رمائے بیٹھے رہے۔ نہایت نیک شریف ۔ بھلے مانس ۔ محنتی اور قانع آدمی تھے ۔ وفات پر ان کا تقریباً اڑھائی ہزار روپیہ ثابت ہوا جو حج بیت اللہ کی نیت سے رکھا ہوا تھا مگر قضاو قدر کو منظور نہ تھا کچھ دن بیمار رہ کر فوت ہو گئے اور بہشتی مقبرہ قادیان میں آرام کر رہے ہیں۔

انہی دنوں قادیان میں بہشتی مقبرہ کے ارد گرد حفاظتی دیوار بنوانے کا مسئلہ درپیش تھا لہٰذا امیر صاحب قادیان نے فیصلہ کیا کہ میاں خدا بخش صاحب کی رقم سے یہ دیوار بنوائی جائے جو اُن کی طرف سے صدقہ جاریہ شمار ہوگا۔

ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمایا کہ نادار مگر محنتی آدمی نے کسبِ حلال سے جو روپیہ کمایا خدا نے اس کا مصرف کیسا عمدہ رکھا۔ ؎

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان مارچ ۱۹۷۶ء)

حضرت شہزادہ عبدالمجید صاحب لدھیانویؓ

حضرت شہزادہ صاحب کودیکھ کرذہن میں یہی آتا تھا کہ یہ شخص اس دنیا کا باشندہ نہیں بلکہ کوئی فرشتہ انسانی شکل میں ہے۔آپ کا چہرہ نہایت نُورانی۔سفید رنگ۔بلند پیشانی۔آواز باریک اور دھیمی۔نہایت خوبصورت ڈاڑھی۔لباس سادہ مگراُجلااور سر پرلنگی باندھا کرتے تھے۔

ماسٹر ماموں خاں صاحب ڈرل ماسٹر کی اہلیہ چونکہ خود کابل کے شاہی خاندان سے تھیں لہٰذا شہزادہ صاحب اکثراُن کے گھر آیا کرتے تھے خصوصاً کپڑے صاف کرانے کے لئے تو یہ دونوں آپس میں فارسی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔چونکہ میرے والد مولوی نعمت اللہ صاحب گوہر بھی لدھیانہ کے علاقہ کے تھے۔لہٰذا شہزادہ صاحب سے گہرے مراسم تھے اور طبائع میں خوب ربط تھا۔دونوں پہروں گفتگو کیا کرتے تھے۔مجھے یاد ہے کہ حضرت شہزادہ صاحب کی وفات کی خبرسن کر والد صاحب نے فارسی میں اُن کا مرثیہ کہا جو بڑا دردناک تھا۔مجھے اس وقت صرف پہلا مصرع یاد آرہا ہے۔

یاد ایامیکہ با اُو گفتگو ہا داشتم

دسمبر ۱۹۱۶ء میں مفتی محمد صادق صاحب نے اپنا عظیم کتب خانہ صدرانجمن احمدیہ کو دے دیا اور صادق لائبریری نام ہوتا تھا۔شہزادہ صاحب اُس کے پہلے لائبریرین مقرر ہوئے۔بعد میں اس کے ساتھ حضرت خلیفہ اولؓ اور صدر انجمن احمدیہ کے شعبہ ریویو آف ریلیجنز کی کتب بھی شامل کردی گئیں۔آپ نے جون ۱۹۲۴ء تک لائبریری میں کام کیا۔

جب حضرت خلیفۃ المسیح ثانیؓ ویمبلے کانفرنس میں شمولیت کے لئے ۱۹۲۴ء میں لنڈن جانے لگے تو شہزادہ صاحب نے بھی درخواست پیش کردی کہ انہیں اپنے خرچ پر ایران جانیکی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔مگر حضرت صاحب نے نامنظور کردی۔وجہ یہ تھی کہ حضور اتنی بزرگ ہستی کو اس بڑھاپے کے عالم میں وطن سے باہر بھجوانا نہیں چاہتے تھے۔

ادھر شہزادہ صاحب نے اپنی صحت کی طرف زیادہ توجہ دینی شروع کردی۔کچھ عرصہ بعد پھر اجازت طلب کی اورعرض کی کہ اب تو میری صحت بہت بہتر ہوگئی ہے۔حضور مسکراپڑے گومنع کرتے رہے مگر شہزادہ صاحب کے بے حد اصرار پر آخر اجازت دے دی۔دراصل خُدا تعالےٰ کی مشیّت آپ کو ایران لے جارہی تھی۔

۱۲۔جولائی ۱۹۲۴ء کو شہزادہ صاحب مع مولوی ظہور حسین صاحب فاضل اور خان محمد امین خاں پشاوری علی الترتیب ایران۔روس اور ترکستان کے لئے قادیان سے روانہ ہوئے۔رخصت کے وقت عجیب نظارہ تھا۔سب کی آنکھیں نم تھیں۔یہ قافلہ ۱۶۔اکتوبر کو ایران کے شمال مشرقی شہر مشہد پہنچا۔وہاں سے تینوں علیحدہ علیحدہ ہوگئے

اور شہزادہ صاحب ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو تہران پہنچے۔

شہزادہ صاحب نہایت اخلاص سے اپنے خرچ پر ایران گئے تھے مگر یہاں پہنچ کر روپیہ جلد ختم ہو گیا۔ وطن سے امداد دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ مرکز سے کبھی درخواست نہ کی کہ مجھے اخراجات کی ضرورت ہے۔ غرض نہایت تنگدستی سے گزراوقات کرتے رہے مگر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتے رہے۔ پیغام حق پہنچانے میں کمی نہ کی۔

آپ ایک معمولی چٹائی پر نہایت ہی مختصر بستر میں ایران کی برف بار فضا میں گزارہ کرتے رہے۔ بعض دفعہ حضور کی خدمت میں خط لکھنے کے لئے ڈاک کے ٹکٹ بھی نہ ہوتے تھے مگر اس حالت میں بھی کسی سے سوال نہ کیا۔ بعض اوقات پہننے کے کپڑے بھی فروخت کئے مگر جو عہد خُداتعالیٰ سے کیا تھا اُسے پوری طرح نبھایا اور مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ کے مصداق بنے۔ اس قدر بے نفس خدمت کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

قادیان میں شہزادہ صاحب کی رہائش لائبریری کے دو کمروں میں ہی ہوتی تھی جو مدرسہ احمدیہ کے جانب شمال چھوٹے دروازے کے ساتھ ہیں۔ (ایک کی سطح ذرا نیچی ہے) کھانا آپ لنگر خانہ سے قیمتاً لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں جا کر لا دیا کرتا تھا۔

مجھے کتابوں کے مطالعہ کا شوق آپ نے ہی لگایا تھا۔ خود کتاب نکال کر دیتے اور جب میں واپس دیتا تو دریافت فرماتے کیا پڑھا ہے؟ ایک دفعہ غلام قادر صاحب فصیح سیالکوٹی کی کتاب تاریخ اسلام بھی دی تھی کہ اسے بغور پڑھو اور جہاں کچھ سمجھ نہ آئے مجھ سے دریافت کر لینا۔

آپ کی عادت تھی کہ عصر کے بعد ایک پیسے کے چنے بھنواتے تھے۔ جو (۱۹۱۸ء) میں پاؤ بھر کے قریب آجاتے تھے۔ میں لاتا تو اُن کو میز پر ڈال لیتے۔ خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی شریک کرتے۔ مجھے مٹھی بھر علیحدہ دیتے ایک دن آپ باتوں میں مصروف تھے۔ مجھے میرا حصہ نہ ملا۔ میں بھی کھڑا رہا۔ مجھے دیکھ کر خیال آیا تو مُسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''اوہو میاں عبدالرحمٰن مجھے تمہارا خیال ہی نہیں آیا۔'' اُس دن معمول سے کچھ زیادہ ہی چنے ملے اور میں لیکر بھاگ گیا۔

آپ نے تقریباً ساڑھے تین سال تک تہران میں تبلیغ کی مگر اجنبی سرزمین۔ وسائل کی شدید کمی بڑھاپے کی عمر۔ آمد ناپید آخر ۲۲۔ فروری ۱۹۲۸ء (مطابق یکم رمضان ۱۳۴۶ ہجری) چند دن بخار میں مبتلا رہ کر انتقال فرمایا۔ آخری وقت میں ایک احمدی محمد خانصاحب گجراتی (جو تہران میں مقیم تھے) تیمارداری کرتے رہے۔ تہران کے جنوبی جانب ایک قبرستان میں دفن کر دیا گیا مگر ۱۹۵۳ء میں اُس قبرستان کو ہموار کر کے اب وہاں ایک محلّہ آباد کر دیا گیا ہے۔

جس طرح قسطنطنیہ کی خوش قسمتی ہے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میزبان حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار وہاں ہے اسی طرح تہران میں حضرت مہدی علیہ السلام کے اس بینظیر صحابیؓ کا مزار ہے۔

آپ کے بعد میر مہدی حسین صاحب اور بابو فقیر علی صاحب اپنے اپنے اخراجات پر ایران تبلیغ کے لئے گئے۔ مگر زیادہ دیر نہ رہ سکے۔ بعد میں شیخ عبدالواحد صاحب اور مولوی عبدالخالق صاحب اور مولوی صدرالدین صاحب تحریک جدید کی طرف سے وہاں گئے اور خوب کام کیا۔

شہزادہ صاحب کا ایک فارسی قصیدہ بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی تصنیف ''ایام الصلح'' میں درج فرمایا ہے۔ تاریخ احمدیت جلد پنجم میں مسجد اقصیٰ میں جو ایک اجتماعی فوٹو ہے اُس میں سفید لباس میں شہزادہ صاحب شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی کے ساتھ کھڑے ہیں۔

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان ستمبر ۱۹۷۸ء)

چوہدری محمد دین باغبان

اللہ اللہ! ایک وہ زمانہ تھا کہ حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ السلام کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ آپ اکیلے ہوتے تھے۔ اور پھر خدائی وعدے کے مطابق وہ زمانہ آیا کہ قادیان کو تمام دنیا میں شہرت ملی۔ حضور خود فرماتے ہیں

میں تھا غریب و بیکس و گمنام و بے ہنر
کوئی نہ جانتا تھا کہ ہے قادیاں کدھر
لوگوں کی اس طرف کو ذرا بھی نظر نہ تھی
میرے وجود کی بھی کسی کو خبر نہ تھی
اب دیکھتے ہو کیسا رجوعِ جہاں ہوا
اک مرجعِ خواص یہی قادیاں ہوا

حضور اپنے گھر میں تلاوتِ قرآنِ مجید، دیگر کتبِ دینیہ اور ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے یا اُس مسجد میں وقت گذارتے جو شہر کے وسط میں حضور کے والد حضرت مرزا غلام مرتضیٰ نے بنوائی تھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ ۲ جون ۱۸۷۶ء کو اُن کا انتقال ہو گیا اور اپنی وصیّت کے مطابق اُسی مسجد کے ایک کونہ میں دفن ہوئے (اب تو وہ قبر تقریباً درمیان میں آ گئی ہے) اُن دنوں اِس مسجد کو ''مسجد مغلیہ'' کہتے تھے بعد میں مسجد اقصیٰ نام رکھا گیا۔

حضور نے امرِ الٰہی سے ۲۳ مارچ ۱۸۸۹ء بمقام لدھیانہ سلسلہء بیعت شروع کیا۔ اس کے بعد کثرت سے لوگوں کا اِس طرف کو رجوع ہوا۔

اُس زمانہ میں حضرت اقدس کبھی کبھی اپنے احباب کے ساتھ سَیر کرنے کے لئیے جانبِ شمال یا مشرق تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اُس وقت قادیان کے اِردگرد کا علاقہ محض ویرانہ تھا۔ کھیتوں میں جھاؤ خود رو اُگا ہوتا تھا۔ چنانچہ میاں فضل دین صاحب ساکن پیرو شاہ تحصیل بٹالہ روایت کرتے ہیں کہ:۔

''جہان ریتی چھلّہ کی مسجد ہے وہاں حضرت نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ اِس طرف شہر بڑھے گا، آپ کے ہاتھ میں سوٹی تھی اُس سے اشارہ کر کے فرمایا۔ نسواری کوٹ پہنا ہوا تھا۔ میں جی میں کہہ رہا تھا کہ اس طرف تو جھاؤ بہت ہے یہاں شہر کس طرح آباد ہو گا۔

شیخ محمد شفیع صاحب سیٹھی محلّہ خواجگان جہلم روایت کرتے ہیں کہ:۔

''حضور باہر جاتے تو مسجد نور کی بڑی بَڑ کی جڑوں پر تشریف فرما ہوتے۔ دیگر ساتھی زمین پر بیٹھ جاتے۔ فرمایا کرتے کہ یہ جنگل منگل بن جائے گا۔ یہ قصبہ بیاس تک جائے گا اور بڑے بڑے پیٹ والے سیٹھ جو با[illegible] زینت

ہوا کرتے ہیں بڑے بڑے بازاروں میں بیٹھا کریں گے۔''

ایک اورروایت جناب علی محمد صاحب لکھانوالی ضلع سیالکوٹ کی بھی سُنیے :-

''حضور مسجد نور کے بالمقابل جانبِ مغرب پہنچے۔وہاں اُن دنوں بالکل جنگل تھا۔کوئی آبادی نہ تھی۔''

قارئین کرام! یہ حالت تھی اُس جنگل کی جہاں سب سے پہلے حضرت نواب محمد علی خان صاحب نے ایک بہت بڑا قطعہء زمین خرید کراپنی کوٹھی دارالسلام تعمیر کی۔اس کے جلد بعد مسجد نور کا سنگِ بنیاد حضرت خلیفہ اوّل نے ۵ مارچ ۱۹۱۳ءکو رکھا۔اس کے قریب ہی بورڈنگ تعلیم الاسلام کی بنیاد رکھی اور تعلیم الاسلام ہائی سکول کی بنیاد بھی ۲۵ جولائی ۱۹۱۲ءکو رکھی۔ان عالی شان عمارات کے اردگرد بڑے خوبصورت پھل دار درخت اور پُھول دار بوٹے اگائے گئے۔

شاید کسی نے بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن اردو کا مضمون ''نام دیو مالی'' (NOM DEV GARDNER) پڑھا ہو۔اس میں انہوں نے اس ہندو مالی کے کمالات دکھائے ہیں جو اورنگ آباد کے ایک باغ میں کام کرتا تھا کہ کس طرح وہ پودے لگاتا۔اُن کے تھالے بناتا۔پانی وقت پر دیتا۔اُن کی بیماریوں کی تشخیص کرتا۔اور علاج کرتا،مگر قادیان میں بھی ایک مالی ہو گذرا ہے جس کا نام محمد دین تھا۔قادیان کے جنگل کو منگل بنانا اسی کا حصّہ تھا۔

چوہدری محمد دین صاحب ولد گل محمد صاحب موضع شرف کوٹ متصل فتح گڑھ چوڑیاں ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔آرائیں قوم سے تعلق تھا۔فنِ باغبانی موروثی طور پر ملا تھا۔آپ ۱۹۱۱ء کے اردگرد نواب صاحب کے باغ کے لئے بُلائے گئے تھے۔اُس وقت احمدی نہ تھے۔بالکل ان پڑھ تھے مگر اپنے فن کے ماہر تھے۔قادیان میں رہ کر جماعت احمدیہ کے عقائد پر غور کیا اور حقیقت نظر آئی تو خلیفہ اوّل کی بیعت کر لی۔ہر چند کوشش کی کہ لکھنا پڑھنا آجائے مگر کام اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ فرصت ہی نہ ملتی تھی۔اپنے کام میں گہرا انہاک تھا۔اُن کے ساتھ دو آدمی حسین بخش اور کتھو بھی تھے۔وہ تھک کر چور ہو جاتے مگر چوہدری محمد دین صاحب کا جذبہ خدمت سرد ہی نہ ہوتا۔

جن لوگوں نے قادیان نہیں دیکھا وہ جان ہی نہیں سکتے کہ سکول کا احاطہ کس قدر وسیع علاقہ پر پھیلا ہوا تھا۔تمام سڑکوں پر دورویہ شیشم کے درخت لگائے۔پھل دار درخت آم زیادہ جامن اس سے کم۔امرودوں کے علاوہ تقریباً ہر قسم کا پھول ہوتا۔امرتسر اور بٹالہ سے ننھے پودے لا کر اُن کو نصب کرنا۔وقت پر پانی دینا۔اُن کی نگرانی کرنا۔کنواں چلانا۔بیلوں کے لئے علیحدہ چارہ بونا۔بورڈنگ کے طلباء کے لئے ہروقت پانی کا سٹاک مہیا کرنا۔یہ ایک دبلے پتلے انسان کا کام تھا۔شیشم کے درخت کے علاوہ سایہ کے موسمِ خزاں میں چھانٹی ہوتی تو بے شمار ایندھن اترتا جو ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔آم،جامن،امرود وغیرہ کی آمدنی علیحدہ تھی۔ہمارے شاعر خواجہ عبدالمنان ناہید صاحب نے اپنی ایک نظم میں چوہدری محمد دین کے کام کو سراہتے ہوئے لکھا ہے۔

لیکن اے پاک زمین۔ پاک دیارِ محبوب
ہے ابھی تک تیرا ہر گھر ہمیں پیارا اپنا

چوک، بازار۔ کتب خانے۔ دفاتر اپنے
مدرسے جامعہ۔ کالج بھی ہمارا اپنا
مقبرہ۔ بیتِ دُعا۔ قصرِ خلافت۔ الدار
مسجدیں اپنی۔ کنوئیں اپنے۔ منارا اپنا
آموں کے باغ۔ درختوں کی قطاریں اپنی
سبز کھیتوں کا دل آویز نظارہ اپنا
تیرے دیوانوں نے ویرانے کیئے ہیں آباد
تیری تصویروں سے ہر گھر ہے سنوارا اپنا
کب تجھے چھوڑتے تھے چاہنے والے تیرے
نوکِ سنگیں سے مکیں تجھ سے نکالے تیرے

خلافتِ ثانیہ کے قیام پر صدر انجمن احمدیہ کا خزانہ بالکل خالی تھا۔نئی انتظامیہ نے عملہ میں تخفیف کردی۔ چوہدری محمد دین صاحب بھی لپیٹ میں آگئے۔مگر جس طرح ایک بچے کی حقیقی ماں اس کی کسی قسم کی تکلیف یا اس کا مر جانا کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی چوہدری محمد دین نے بھی ایسا ہی ثبوت دیا۔حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ مجھے کام کرنے کی اجازت دیدیں میں بغیر کسی معاوضے کے مفت کام کروں گا۔مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ صدر انجمن احمدیہ کے ہزار ہا روپے کے خرید کردہ درخت جو جوان ہو چکے ہیں اور میری محنت سب ایک ہفتے میں برباد ہو جائے اور یہ باغ سوکھ جائے۔

اِس پر حضور نے ۵ روپے ماہوار ادا کرنے کا حکم دیا اور چوہدری صاحب اسی پر قانع ہوگئے۔جن احباب نے قادیان دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اُن کے لگائے ہوئے تقریباً تمام پودے بارور ہوئے۔ یہ حُسنِ نیت، بے انتہا محنت، توجہ اور دلچسپی کا ثمرہ ہے۔

چوہدی صاحب کی نگرانی کا یہ عالم تھا کہ کئی ایکڑوں میں پھیلے ہوئے باغات کی گشت کرتے رہتے اور نگرانی کا حق ادا کر دیتے۔بعض دفعہ بچے پتھر مار کر پھل گراتے ہوئے پکڑے جاتے۔ یہ دور سے ہی نعرہ لگاتے تو وہ بھاگ جاتے۔بعض دفعہ پکڑے ہی جاتے تو ان کو اخلاقاً شرمندہ کرتے اور وہ پھل اُنہی کو دے دیتے کہ اب یہ میرے کس کام ہے۔مگر آئندہ کے لئے توبہ کرواتے۔

آپ جو چاہیں کہہ لیں ایک بات اُن کی طبیعت میں ایسی منفرد تھی کہ اپنے کام پر تنقید برداشت نہ کرتے۔ پھول توڑنے پر وہ سخت برہمی کا اظہار کرتے اور چھوٹے یا بڑے کا قطعاً لحاظ نہ کرتے۔ جلے کٹے فقرے اُسے ضرور سُننے پڑتے۔

پھل پک جاتا تو درختوں کی نیلامی کرا دیتے اور خود ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے۔

۱۹۳۲ء میں مالی صاحب نے میر عزیز الرحمن صاحب بریلوی کے مکان کے سامنے سے سیدھی سڑک بورڈنگ ہاؤس کو نکالی۔ دو رویہ پودے لگائے۔ دارالفضل والے سرے پر گیٹ بنوایا۔ اس پر نصف دائرے کی شکل میں......لوہے کا جنگلہ بنوایا اور اس کے اندر HOSTEL AVENUE لکھوایا جو اس خاکسار نے تجویز کیا تھا اور جس کی تصدیق انہوں نے مولوی محمد دین صاحب سے کروائی تھی۔

جب حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے احمدیہ فروٹ فارم کی بنیاد رکھی تو تب بھی چوہدری محمد دین صاحب نے ہی میاں صاحب کے تجویز کردہ نقشے کے مطابق پودے لگائے۔ آپ کے ساتھ چوہدری احمد علی صاحب مالی بھی کام کرتے تھے۔ ان دونوں پر حضرت میاں صاحب کی نگرانی تھی۔

اسی طرح حضرت مصلح موعود کی کوٹھی دارالحمد کو الف سے لے کر ی تک انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سنوارا۔ خود سہارنپور گئے۔ انتخاب کر کے پودے لائے۔ امرتسر میں گاڑی تبدیل کرنی ہوتی تھی۔ پھر بٹالہ سے قادیان پہنچانا اور نصب کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا پر آپ نے نہایت صبر اور استقلال سے یہ مراحل بھی طے کیے۔

اسی باغ کی نگرانی کرتے ہوئے اپریل ۱۹۳۵ء میں ٹائیفائڈ بخار میں مبتلا رہ کر انتقال کیا۔ وفات کی خبر لے کر جس وقت ان کی خوش دامن حضرت مصلح موعود کی خدمت میں حاضر ہوئی تو حضور کچھ مضمون لکھ رہے تھے۔ وہیں قلم روک لیا۔ اور گہرے دلی رنج سے تعزیت کی اور بہت دلجوئی کی اور فرمایا کہ میں یہ خبر سن کر اس قابل نہیں رہا کہ خود جا کر جنازہ پڑھاؤں۔ لہٰذا مولوی سرور شاہ صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

آپ حیران ہونگے یہ سن کر کہ جس شخص نے اپنی خدمات ۵ روپے ماہانہ معاوضہ سے شروع کی تھیں اُس نے اپنے ترکہ میں کئی مکان رہائشی اور کئی پلاٹ زمین اور ایک مکان بٹالہ میں چھوڑا۔ اپنے بڑے بھائی نظام الدین کے بیٹے محمد حسین کو ایف۔اے تک تعلیم دلوائی اور اب وہ C.I.D کا انسپکٹر ریٹائرڈ ہے۔

بعد وفات متعدد مستورات تعزیت کے لئے آئیں تو ان سے معلوم ہوا کہ مرحوم ان کو اکثر سبزی اور پھل وغیرہ بھجوایا کرتے تھے۔ ایک دوست (جو ٹانگہ چلاتے تھے) کی گھوڑی مرگئی تو انہوں نے اسے اپنی گرہ سے لے کر دی۔

مرحوم نے تین بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ ان میں سے ایک مولوی عبدالغفور صاحب سیکرٹری مال و امام الصلوٰۃ محلہ دارالنصر ربوہ ہیں۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان اپریل ۱۹۸۴ء)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بتادی جائے اس پر لیکھرام نے کہا کہ:۔

''میں آپ کی پیشگوئیوں کو واہیات سمجھتا ہوں۔ میرے حق میں جو چاہو شائع کرو میری طرف سے اجازت ہے۔ اور میں کچھ خوف نہیں کرتا۔''

تب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے نہایت توجہ اور زاری کے ساتھ خداوند تعالیٰ کی جناب میں دُعائیں کیں۔ جس کے نتیجہ میں حضور کو خبر دی گئی کہ ۲۰ فروری ۱۸۹۳ء سے چھ سال کے اندر اندر وہ ہلاک کر دیا جائے گا۔ الہام کی عربی عبارت حسب ذیل تھی:۔

فبشّرنی ربی بِمَوْتِهِ فِیْ سِتَّةِ سنة یعنی مجھے بشارت دی گئی کہ اس کی موت چھ برس میں ہوگی۔

پھر الہام ہوا عِجلٌ جَسَدٌ لَهٗ خُوَارٌ یہ ایک بے جان گوسالہ ہے جس میں بچھڑے کی مانند آواز آ رہی ہے۔ لَهٗ نَصَبٌ وَعَذَابٌ اس کے لئے دُکھ کی مار ہے اور عذاب ہے۔

۲/اپریل ۱۸۹۳ء کو حضور نے اپنا یہ کشف شائع فرمایا:۔

''آج ۲/اپریل ۱۸۹۳ء مطابق ۱۴ ماہ رمضان ۱۳۱۰ء ہجری صبح کے وقت تھوڑی سی غنودگی کی حالت میں مَیں نے دیکھا کہ ایک وسیع مکان میں بیٹھا ہوا ہوں اور چند دوست بھی میرے پاس موجود ہیں۔ اتنے میں ایک شخص قوی ہیکل مہیب شکل گویا اُس کے چہرے سے خون ٹپکتا ہے۔ میرے سامنے آکر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک نئی خلقت اور شمائل کا شخص ہے گویا انسان نہیں ملائکِ شداد وغلاظ میں سے ہے اور اُس کی ہیبت دلوں پر طاری تھی اور میں اس کو دیکھتا ہی تھا کہ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ''لیکھرام کہاں ہے۔'' اور ایک اور شخص کا نام لیا کہ وہ کہاں ہے۔ تب میں نے اس وقت سمجھا کہ یہ شخص لیکھرام اور اس دوسرے شخص کی سزادہی کے لئے مامور کیا گیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ دوسرا شخص کون ہے۔'' وغیرہ وغیرہ (برکات الدعا)

حضور نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب آئینہ کمالاتِ اسلام میں دوبارہ اس پیشگوئی کو شائع فرمادیا اور اس کے شروع میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک بلند پایہ نعت بھی لکھی جس کا ایک شعر یہ تھا:۔

الا اے دشمن نادان و بے راہ
بترس از تیغ بران محمدؐ

اب ملاحظہ فرمائیں کہ خدائے قادر وقیوم نے (جو مسبب الاسباب) اس کے قتل کے اسباب کس طرح پیدا کئے۔ ان دِنوں لاہور میں طاعون پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے لیکھرام کو مظفر گڑھ بھجوادیا کہ وہاں چلے جاؤ کھلی فضا ہے طاعون کا زور کم ہوگا تو واپس آجانا۔

وہاں لیکھرام کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میرے آباء واجداد کسی وقت مسلمانوں کے دباؤ سے اسلام میں چلے گئے تھے۔ مگر میں واپس ہندو مذہب میں آنا چاہتا ہوں مجھے ہندو بنالیں۔ لیکھرام بہت خوش ہوا کہ چلو ایک

مسلمان تو ہمارا شکار بنا۔ اس کو کہا کہ کل تم میرے ساتھ لاہور چلو۔ وہاں ۷ مارچ ۱۸۹۷ء کو اتوار کے روز تمہیں شُدھ کر لیں گے یعنی ہندو مذہب میں لے آئیں گے۔

۵ مارچ ۱۸۹۷ء کو عید الفطر تھی۔ دونو بازار میں جارہے تھے کہ ایک ہندو دکاندار نے لیکھرام کو اشارے سے بُلا کر کہا کہ مہاراج یہ شخص تو کوئی سخت بھیانک قاتل معلوم ہوتا ہے۔ اس کو دُور کریں مگر لیکھرام نے کہا کہ نہیں یہ تو شُدھ ہونے کے لئے آیا ہے اور ۷ مارچ کو اس کی شدھی ہوگی۔ اور جلسہ عام میں ایک مسلمان کو آریہ بنایا جائے گا۔

اس شخص نے بخار کی شکایت کی تو وہ اُس کو ایک ہندو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ جس نے نبض دیکھ کہ کہا کہ بخار تو نہیں ہے مگر خون میں ایک جوش اور حدت ضرور ہے۔ اس کو شربت پلائیں۔ چنانچہ شربت پلایا گیا۔

۶ مارچ کو بھی وہ لیکھرام کے ہمراہ رہا۔ شام چھ بجے لیکھرام اپنے چوبارے میں چارپائی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ اُس نے گرمی محسوس کرتے ہوئے اپنی قمیض اتار کر الگ رکھ دی وہ شخص قریب بیٹھا ہوا تھا اور اُس نے گرمی میں بھی ایک سیاہ رنگ کا کمبل اوڑھا ہوا تھا۔

یکا یک لیکھرام نے انگڑائی لی۔ قاتل نے فوراً ایک تیز چُھری پہلے پیٹ کے اُوپر سے نیچے اور پھر دائیں سے بائیں پُورے زور سے پھیری اور اس کے بعد وہی چُھری پیٹ کے اندر گھما گھما کر انتڑیاں کاٹ دیں۔ جس طرح بیل ذبح ہوتے وقت مہیب آواز نکالتا ہے اس نے ویسی آواز نکالی۔ اس کی ماں اور بیوی بھی بھاگی آئیں مگر قاتل کا پتہ نہ چلا۔ وہ غائب ہوگیا۔

لیکھرام نے اپنی حفاظت کے لئے پولیس کے دو سپاہی بھی پہرہ کے لئے مقرر کروائے ہوئے تھے۔ وہ نیچے ڈیوڑھی میں بیٹھے رہتے تھے۔ ویسے بھی اعلیٰ افسران پولیس نے لیکھرام کی حفاظت کے لئے خفیہ ہدایات دی ہوئی تھیں۔

جس کوچہ میں لیکھرام کا مکان تھا وہ اب بھی موجود ہے وہ آگے سے بند تھا۔ اس کا مکان آخری تھا۔ وہاں گلی میں ایک گھر میں شادی کی وجہ سے کھانا پک رہا تھا۔ شادی والوں کا بیان ہے کہ ادھر کوئی قاتل نہیں آیا۔ پڑوسیوں نے بیان کیا کہ چھت کے اُوپر کسی کے دوڑنے کی آواز تو آئی مگر ہم نے یہ خیال کر کے کہ بچے کھیل رہے ہوں گے توجہ نہیں دی۔ اس کی ماں کا بیان ہے کہ ابھی یہاں تھا اب پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے۔

۱۹۱۹ء میں میرے والد مولوی نعمت اللہ خان صاحب گوہر مرحوم بی اے اسلامیہ ہائی سکول پونچھ ریاست کشمیر میں ہیڈ ماسٹر تھے وہاں جنگِ عظیم اول ختم ہوئی تو جشن صلح کے سلسلہ میں انگریز ریذیڈنٹ نے راجہ صاحب اور تمام شہر اور علاقے کے سرکردہ لوگوں کو ٹی پارٹی پر بُلایا۔ وہاں سے واپس شہر کو چلے تو وہاں کے انسپکٹر پولیس مرزا قاسم بیگ صاحب گجراتی نے والد صاحب کو بتایا کہ جس دن لیکھرام قتل ہوا تو ڈیوڑھی پر جو سپاہی تھے اُن میں سے ایک وہ خود تھے۔ ہم دونو بھاگ کر اوپر گئے۔ لیکھرام کی ماں سے پوچھا کہ قاتل کدھر کو گیا ہے تو وہ روتے ہوئے کہنے لگی کہ یہ جو چکّی پڑی ہے۔ اس کے اندر ہی غائب ہو گیا ہے۔

فوراً لیکھرام کو میو ہسپتال لے جایا گیا۔ اتفاق سے وہاں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب مرحوم جو حضرت مسیح موعودؑ کے مخلص مرید تھے۔ ڈیوٹی دے رہے تھے۔ انہوں نے لیکھرام کو میز پر لٹا دیا۔ اور فوراً ڈاکٹر کرنل ایف ایف پیری جو انچارج سرجن تھے کو اطلاع دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آ گئے۔ اور جو کچھ اُن سے ہو سکتا تھا وہ کیا۔ جب یہ سرجن مرزا صاحب کو بلاتا تو مرزا کا لفظ سُن کر لیکھرام گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا اور ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔

ڈاکٹر پیری کے آنے سے قبل لیکھرام سخت تکلیف میں تھا۔ بار بار کہتا تھا کہ ''ہائے میری قسمت ہن ڈاکٹر وی نہیں بوہڑدا''۔ یعنی ہائے میری قسمت اب ڈاکٹر بھی نہیں آ رہا۔

تقریباً ساڑھے نو بجے رات کو آپریشن ختم ہوا تو پولیس والوں نے ڈاکٹر سے اجازت مانگی کہ لیکھرام کا نزعی بیان لکھ لیں۔ نزع کے وقت مریض جس کا نام لے دے اس کو قاتل سمجھا جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر نے سختی سے منع کر دیا۔ پولیس نے کوشش کی مگر ڈاکٹر نے پھر روک دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لیکھرام فوت ہو گیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔

اتوار ۷ر مارچ یعنی دوسرے دن جس دن اس نے اس شخص کی شدھی کرنی تھی اس کی لاش دریائے راوی کے کنارے جلا دی گئی۔

ہندوؤں نے شور مچا دیا کہ ہو نہ ہو یہ سب کاروائی مرزا صاحب کی ہے۔ لہٰذا گورداسپور کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ۸ر اپریل کو حضرت اقدس کے گھر کی تلاشی لی۔ مگر وہاں سے کچھ بھی نہ ملا۔

لیکھرام کی وفات پر جو تہلکہ مچا وہ بہت دیر تک جاری رہا۔ مگر قاتل گرفتار نہ ہو سکا۔ [1] لیکھرام کی

---

[1] اس ضمن میں مورخ احمدیت حضرت شیخ یعقوب علی صاحب ''حیات احمد'' میں لکھتے ہیں ''قتل کے شبہ میں ایک شخص کشمیر میں گرفتار ہوا اور اسے لاہور لایا گیا۔ آریہ سماج کے بعض عہدہ داروں نے اسے شناخت کیا اور مشہور ہو گیا کہ قاتل پکڑا گیا۔ اس کی شناخت پریڈ جیل میں ہوتی رہی۔ اس کا حلیہ بالکل قاتل کے مشتہرہ سے ملتا تھا۔ آخر جب پنڈت صاحب کی والدہ اور بیوی نے اسے شناخت کیا تو انہوں نے کہا یہ وہ شخص نہیں ہے اس کی آواز اس کی آواز جیسی نہیں ہے کچھ عرصہ بعد آریہ سماجیوں میں اس پر باہم اختلاف ہوا۔ ایک فریق الزام دیتا تھا کہ قاتل کو چھڑوا دیا گیا ہے۔ رہائی کے بعد وہ شخص ایک مرتبہ مجھے سنہری مسجد کے قریب مل گیا۔ میں نے اس کو السلام علیکم کہہ کر ٹھہرایا۔ اور پوچھا کہ آپ کو پنڈت لیکھرام کے قتل کے شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اور پھر چھوڑ دیا گیا۔ کیا آپ کا تعلق اس معاملہ سے تھا یا نہیں؟ اس نے کہا جو شخص قانون کی نظر میں گنہ گار نہیں اس کے متعلق ایسا سوال نہیں کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی ستاری کو ہر شخص نہیں سمجھ نہیں سکتا۔ اسی گرفتاری میں کچھ ثواب مقدر تھا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔'' حیات احمد صفحہ ۱۷۹-۱۸۰ حیدر آباد ایڈیشن لیکھرام کے قتل کی تاریخ بحساب ابجد کمترین مخلوقات ہے (۱۸۹۷ء)

عمر قتل کے وقت ۳۹ سال تھی اس کا ایک بیٹا ہی تھا جو فوت ہو چکا تھا۔اس کی بیوی ٹی بی کی بیماری سے کسمپرسی میں مرگئی ۔غرض اس کا تمام گھر برباد ہوگیا۔اور یوں حضرت مسیح موعودؑ نے جو پیشگوئی کی تھی وہ واضح رنگ میں پوری ہوئی۔

(ماہنامہ مصباح مارچ ۱۹۸۴ء)

لیکھر ام کا ساتھی کون تھا؟

مجھے خوب یاد ہے ۶ مارچ ۱۹۳۱ء کو محلہ دارالفضل قادیان میں حضرت میر قاسم علی صاحبؓ ایڈیٹر اخبار فاروق نے لیکھرام کی برسی پر ایک جلسہ کا اہتمام کیا اور ساتھ ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا۔ آپ نے لیکچر کا آغاز اس شعر سے کیا تھا ؎

ہے روزِ قتل لیکھوئے بد بین و بد گہر
سینہ تھا جس کا وقف عذاب شدید کا

اور آریوں کا لکھا ہوا ''سیاپا'' (نوحہ) پنجابی میں بھی سُنایا جس کے تین شعر اب بھی مجھے یاد ہیں ؎

کھبّی پگ والیا ہائے ہائے لیکھرام
گھوڑی چڑھیوں کاٹھ دی ہائے ہائے لیکھرام
جانجی پچھے رہ گئے ہائے ہائے لیکھرام

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی حیرت انگیز پیشگوئی کے مطابق جب لیکھرام کو خدا تعالیٰ کے غضب نے گھیر کر ہلاکت کے قعرِ عمیق میں گرا دیا اور وہ بغیر کسی نزعی بیان کے میوہسپتال لاہور کے آپریشن روم میں مرگیا تو اُس کی ماں اور بیوی کو جگہ بجگہ پولیس تھانوں میں جا کر قاتل کے شبہ میں پکڑے ہوئے مسلمانوں کی شناخت کیلئے جایا گیا۔ ہر موقع پر وہ سخت حسرت۔ ناکامی اور مایوسی کے عالم میں واپس آتیں۔ لیکھرام کی ماں نے اپنی بہو لکشمی دیوی کو طعنے دینے شروع کر دیئے کہ تو بڑی منحوس ہے۔ تیرا لڑکا سکھ دیو صغیر سنی میں ہی گذشتہ سال فوت ہو گیا اب میرا بچہ لیکھرام بھی چلا گیا ہے۔ ساس کے طعنے سُن سُن کر بیچاری کو تپدق ہو گیا۔ نہ کوئی علاج نہ پُرسان حال ۔ بھلا مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر بڑی حسرت سے مری۔

بہر حال اس پیشگوئی کی وضاحت کے لئے تذکرہ صفحہ ۲۳۷ پر مندرج کشف قابل مطالعہ ہے:۔

''آج جو ۱۲ اپریل ۱۸۹۳ء مطابق ۱۴ رمضان ۱۳۱۰ ہجری ہے صبح کے وقت تھوڑی سی غنودگی کی حالت میں میں نے دیکھا کہ میں ایک وسیع مکان میں بیٹھا ہوا ہوں اور چند دوست بھی میرے پاس موجود ہیں اتنے میں ایک شخص قوی ہیکل۔ مہیب شکل گویا اُس کے چہرہ پر سے خون ٹپکتا ہے میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک نئی خلقت اور شمائل کا شخص ہے گویا انسان نہیں۔ ملائک شداد وغلاظ میں سے ہے اور اُس کی ہیبت دلوں پر طاری تھی اور میں اس کو دیکھتا ہی تھا کہ اُس نے مجھ سے پُوچھا کہ لیکھرام کہاں ہے ؟ اور ایک اور شخص کا نام لیا کہ وہ کہاں ہے؟ تب میں نے اُس وقت سمجھا کہ یہ شخص لیکھرام اور اُس دوسرے شخص کی سزا دہی کے لئے مامور کیا گیا ہے۔ مگر مجھے معلوم نہیں رہا کہ وہ دوسرا شخص کون ہے؟ ہاں یہ یقینی طور پر یاد رہا کہ وہ

دوسرا شخص اُنہیں چند آدمیوں میں سے تھا جن کی نسبت میں اشتہار دے چکا ہوں اور یہ یک شنبہ کا دن اور ۴ بجے صبح کا وقت تھا۔ فَالْحَمْدُلِلّٰہِ علیٰ ذٰلِکَ ۔"

فوراً ذہن میں آئے گا کہ یہ دوسرا شخص کون تھا؟ اُس کا نام مخفی کیوں رکھا گیا؟ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ دوسرا شخص جسے خدا تعالیٰ کے قہر کا نشانہ بننا تھا اُس کے ماں باپ نے اسکا اور نام رکھا تھا لیکن بعد میں اُس نے اپنا وہ نام ترک کر کے از خود اور نام تجویز کر لیا تھا۔

یہ دوسرا شخص جو اللہ تعالیٰ کی قہری تجلّی کا نشانہ بنا۔ مُنشی رام تھا۔ اُس کے والد کا نام نانک چند تھا۔ موضع تلون ضلع جالندھر کا رہنے والا تھا۔ منشی رام ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کو ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی خدمات کے سلسلہ میں کوتوال بنا دیا گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم پنڈتوں کے ذریعہ گھر پر ہوئی۔ تُلسی داس کی لکھی ہوئی رامائن بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ پہلی دفعہ میٹرک کا امتحان بنارس میں دیا مگر فیل ہو گیا اور واپس اپنے گاؤں میں آ گیا۔ یہاں آ کر تعلیم سے توجہ ہٹ گئی اور ناول ناٹک وغیرہ پڑھنے کی چاٹ لگی۔ بڑی کوشش کے بعد میٹرک پاس کیا۔

جن دنوں منشی رام بنارس میں تھا اس کا والد بلّیا میں کوتوال تھا۔ اُس علاقہ میں لاٹھی چلانا۔ گتکا بازی اور کشتی لڑنے کا فن عام تھا۔ چنانچہ یہ بھی ان میں خاصہ ماہر ہو گیا۔ مگر بدصحبت کے نتیجہ میں حقہ نوشی اور شراب نوشی کی عادت پڑ گئی۔

اس کی شادی ایک سادہ طبع لڑکی شودیوی سے ہوئی۔ منشی رام پر مغربیت سوار تھی ۔ وہ اس لڑکی کی عادتوں کو پسند نہ کرتا مگر اُس کی قدر اُس وقت ہوئی جب ایک رات منشی رام کو شراب میں مست لوگوں کے سہارے گھر پہنچایا گیا۔ بیوی نے نہلا دھلا کر کپڑے تبدیل کر دئے ۔ ساری رات اُسے دباتی رہی۔ شراب نوشی کی وجہ سے منشی رام بے حد مقروض ہو گیا۔ بیوی نے اپنے زیورات فروخت کر کے قرض ادا کیا۔

ایک دن مندر میں ایک عورت پوجا کیلئے آئی تو منشی رام اور اس کے دوست پجاری نے اُس پر ہاتھ ڈالا۔ اُس نے شور مچا دیا۔ لوگوں نے ان دونوں لڑکوں کو قصوروار سمجھ کر مندر سے نکال دیا۔

منشی رام پر ایک ایسا زمانہ بھی آیا کہ وہ عیسائیت قبول کرنے کیلئے تیار ہو گیا مگر اپنے باپ کے ہمراہ بریلی میں پنڈت دیانند کا لیکچر سننے کے بعد اُس نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور ایف اے کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ مگر اُس میں دوبارہ ناکام رہا۔ باپ نے عارضی طور پر اُسے تحصیل دار بنوا دیا۔ پھر مختار عدالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی ۔ مقدموں کے سلسلہ میں اُسے لاہور آنا جانا پڑا۔ یہاں پر اُس نے برہمو سماج اور آریہ سماج کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد موخر الذکر کو ترجیح دی۔ اور آریہ سماج کا ممبر بن گیا۔ اس کے بعد گوروکل کانگڑہ ، ہردوار میں جسے آپ ہندوؤں کا دیوبند کہہ لیں۔ چلا گیا۔ اور گیان دھیان کی زندگی اختیار کر کے "رند سے "مہاتما" بننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں تعلیم سے فارغ ہونے پر اُسے شردھانند کا خطاب دیا گیا۔ شردھا کے معنی

عقیدت اور رند سے مراد خدا یعنی خدا سے عقیدت رکھنے والا کے ہیں۔ یہ ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے۔

(از تہاس آریہ سماج پنجاب لاہور)

۳ راگست ۱۹۱۳ء کو مچھلی بازار کان پور کی مسجد کا وضو خانہ ڈپٹی کمشنر نے گروا دیا تا کہ ایک سڑک سیدھی کی جا سکے۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا مگر ایک سکھ انسپکٹر پولیس نے گولی چلا کر بہت سے لوگوں کو شہید کر دیا۔ ان دنوں اس منشی رام نے ہی ہندو مسلم منافرت پھیلانے میں خاص حصہ لیا۔ یہ تیز طرار اور لسّان آدمی تھا۔ خوب آگ لگوائی۔ ظفر علی خان نے گورنمنٹ کی Divide And Rule پالیسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حسب ذیل شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

عنایت کی نظر اسوقت منشی رام جی پر ہے
انہی آنکھوں کا تارہ تھے مگر کل تک میاں چھٹو
میری سرکار کا اُلو نکل کر جا نہیں سکتا
کبھی ہندو بجر بٹو کبھی مسلم نظر بٹو

تحریک خلافت کے دنوں میں گاندھی جی نے دبی زبان سے تحریک کی تائید کر دی۔ اور سادہ لوح مسلمانوں نے رواداری میں منشی رام جالندھری کو جامع مسجد دہلی میں بلا کر منبر پر بٹھا کر اُس سے لیکچر دلوایا۔ حالانکہ کبھی کوئی ہندو ایک مسلمان کو مندر میں گھسنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

اس واقعہ کے معاً بعد منشی رام عرف سوامی شردھانند نے یو۔پی کے ضلع فرخ آباد میں مسلمانوں کو شُدھ یعنی پاک کر کے ہندو بنانے کی تحریک شروع کی۔ ملکانے دراصل مسلمان تھے مگر عرصہ دراز سے ہندوانہ ماحول میں رہ کر اسلامی اصول بھول گئے تھے اور بہت سی ہندوانہ رسوم اختیار کر لیں تھیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک نئی قوم بن چکے تھے۔ ہندوؤں نے نہایت خفیہ طریق پر شدھی کی یہ مہم شروع کی۔ ایک ہندو شاعر نے لکھا ہے ؎

ہندوؤ تم میں ہے گر جذبہ ایمان باقی
رہ نہ جائے کوئی دُنیا میں مسلماں باقی

اس پر مسلمان پریس نے شور مچایا اور اخبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر مولوی عبداللہ منہاس نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا نام لے کر لکھا کہ اس مشکل میں آپ ہی راہ نمائی فرما سکتے ہیں۔ حضور پہلے ہی باخبر تھے اور انتظام کر رہے تھے۔ ۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو حضور نے ایک خطبہ میں فتنہ ارتداد کیلئے ۱۵۰ والنٹیر مانگے۔ مسلمانوں کو اتحاد کی نصیحت فرمائی جماعت احمدیہ نے روپیہ پیش کیا۔ والنٹیر دیئے۔ اور ایک عمدہ تنظیم کے ماتحت علاقہ ملکانہ میں پھیل گئے۔ سمجھدار غیر احمدی شرفاء نے جماعت احمدیہ کی مساعی کی بے حد تعریف کی اور کام کو سراہا۔ تقریباً ایک سال تک آریہ

سماج کا بھاری جماعت نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آخر کار شردھانند و منشی رام نے شدھی کی تحریک بند کرنے کا اعلان کیا اور لیڈری سے دست بردار ہو گیا۔

یہ شخص بڑا فتنہ پرداز۔ بدزبان۔ تیز طرار اور پھر پولیس کی ملازمت اور قانون سے واقف ہونے کے لحاظ سے خطرناک تھا۔ اب وہ لیکھرام کی جگہ آریہ سماج کا لیڈر اور بدزبانی میں اسکا مثنّی تھا۔ اُس نے لیکھرام کے سوانح حیات مرتب کئے۔

اب وقت قریب آ گیا تھا کہ خدائے غیور نے اپنے پیارے پر جو انکشاف ۱۸۹۳ء میں فرمایا تھا وہ اس شاتم رسول بدزبان کے حق میں بھی حرف بحرف پورا ہو۔

۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء کو شردھانند دہلی میں قتل کر دیا گیا۔ قاتل ایک مسلمان عبدالرشید تھا جو دہلی کے محلہ فیض باغ میں رہتا تھا اور کسی اخبار میں کاتب تھا۔ اصل میں وہ بلند شہر کا رہنے والا تھا۔ واقعہ قتل کی تفصیل آریہ اخبار ''پرتاپ'' لاہور کی زبانی سنیئے۔

''سوامی جی بہت دنوں سے بیمار تھے۔ حادثہ کے روز پونے ۴ بجے کے قریب سوامی جی کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد ہاتھ پاؤں دھوئے۔ نوکر باہر تھا۔ ڈاکٹروں نے ملاقات بند کر رکھی تھی۔ قریب ۴ بجے کے کسی کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ نووارد ایک مسلمان تھا۔ نوکر نے اُسے روک دیا اور کہا۔ سوامی جی سے ملنے کی اجازت نہیں اُس نے اصرار کیا۔ نوکر نے منع کر دیا۔ اس اثناء میں سوامی جی نے نووارد کی آواز سن کر کہا! کون ہے؟ اندر آنے دو۔ نوکر نے مسلمان کو اندر بلا لیا۔

سوامی جی نے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے اُس نے کہا دین اسلام کے بارہ میں کچھ آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ سوامی جی نے کہا ہنوز میں بیمار ہوں تمہاری دُعا سے شفایاب ہو جاؤں گا تو بات چیت کروں گا۔ مسلمان نے نوکر سے پانی پلانے کو کہا۔ دھرم سنگھ نوکر نے مسلمان کو باہر سے پانی لا کر پلایا۔ پانی پینے کے بعد مسلمان پھر سوامی جی کے کمرہ میں آیا۔ نوکر ہمراہ تھا۔ سوامی جی مسند کے سہارے سے چارپائی پر بیٹھ گئے ہوئے تھے۔ نووارد نے سوامی جی کے نزدیک پہنچ کر اُن پر پستول کے یکے بعد دیگرے تین فائر کئے۔ ایک گولی گلے کے نیچے لگی دوسری گولی کے چلتے ہی دھرم سنگھ نے قاتل کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ جب ظالم نے تیسرا فائر بھی کر دیا تب دھرم سنگھ نے آگے بڑھ کر قاتل کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش کی۔ اس اثناء میں قاتل نے دھرم سنگھ پر بھی فائر کر دیا۔ گولی اس کی ران میں لگی۔ گولی کے لگتے ہی دھرم سنگھ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اور قاتل نے بھاگنے کی کوشش کی۔ یہ آواز سن کر سوامی جی کا پرائیوٹ سیکرٹری شری دھرم پال جو کہ پاس کے کمرہ میں تھا دوڑ کر آ گیا اور بھاگتے ہوئے قاتل کو پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ اور اوپر سے دبا لیا۔ اس وقت زخمی دھرم سنگھ نے باہر برآمدے میں آ کر زور سے چلّانا شروع کر دیا کہ سوامی جی کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا ہے۔ اور آواز سنتے ہی لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ پنڈت اندر اور دیش

بند ھو گپتا خبر پاتے ہی دوڑے آئے۔''

(اخبار پرتاپ لاہور مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۶ء)

یہ قتل اُس وقت ہوا جب کہ گوروکل کانگڑی کی سلور جوبلی منانے کی زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں اور صرف ۳ ماہ باقی تھے۔ ملزم کے چہرے پر قطعاً خوف و ہراس نہ تھا بلکہ وہ خوش تھا۔

یہاں پر بعض مماثلتیں پائی جاتی ہیں:۔

(۱) دونوں مقتول اسلام اور حضرت بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں بدزبانی میں حد سے بڑھ گئے تھے اور باوجود منع کرنے کے باز نہ آتے تھے اور مسلمانوں کی دل آزاری میں اُن کو مزہ آتا تھا۔

(۲) لیکھرام اور شردھانند دونو پولیس میں ملازم رہے۔

(۳) دونو کو حضرت مسیح موعودؑ نے کشف میں عذاب شدید کا مورد دیکھا۔

(۴) دونوں قاتلوں کے خون میں واردات سے قبل سخت جوش تھا۔ دونوں نے قتل سے پہلے پانی پیا۔ لیکھرام نے تو اپنے قاتل کو شربت پلوایا۔

(۵) لیکھرام کو ہندوؤں نے منع کیا کہ تم اس شخص کو جو خونی نظر آتا ہے کیوں ہمراہ لئے پھرتے ہو۔ شردھانند نے باوجود ڈاکٹروں کے منع کرنے کے خود اُسے اندر بلایا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ لیکھرام جو بدزبانی کا سرغنہ تھا اُس کے قاتل کا کچھ پتہ نہ چل سکا اور شردھانند کا قاتل گرفتار ہوا۔

اس واقعہ پر کسی نے بہت خوب کہا تھا۔

سر دشمنِ رسول کا تن سے کیا جدا
ناپاک کے وجود کا نقشہ مٹا دیا

لیکھرام کے قتل کی تاریخ ابجد کے حساب سے ''۱۸۹۷ء رکمترین مخلوقات'' نکلتی ہے۔ اور ''پلید نامرغوب'' سے شردھانند کی۔

(ماہنامہ مصباح دسمبر ۱۹۷۳ء، جنوری ۱۹۷۴ء)

پیشگوئی درباره مہاراجہ دلیپ سنگھ کیونکر پوری ہوئی؟

مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک بہت زیرک اور ہوشیار آدمی تھا۔ کم از کم دو باتیں انگریز قوم کے متعلق اُس نے اچھی طرح سمجھ لی تھیں (۱) انگریز جولدھیانہ تک آگئے ہیں اور دوسری طرف پنجاب کو سندھ کی طرف سے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں یہ خالی از علت نہیں اور ایک نہ ایک دن یہ اس کی سلطنت پر قبضہ کرلیں گے (۲) لاہور میں گرجا بنانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔

واقعات نے ثابت کردیا کہ یہ دونوں خدشات درست تھے اُنہی دنوں چارلس مٹکاف سفارت لے کر قصور کے مقام پر حاضر ہوا تو رنجیت سنگھ نے کئی روز تک شرفِ ملاقات نہ بخشا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ آخر جب ملاقات ہوئی تو اس نے پہلے سے تیار کردہ ایک مسودہ ءِ معاہدہ دوستی پیش کیا کہ اس پر دستخط کردیں رنجیت سنگھ حیران ہوا کہ یہ کیا بات ہے۔ جب ہمارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں، کوئی اختلاف نہیں اور دوستی ہے تو اس کے لکھنے پڑھنے کا کیا مقصد؟ مگر وہ اپنی بات پر قائم رہا۔ لیکن جب فقیر عزیز الدین صاحب نے عام فہم پنجابی میں سکھ درباریوں کو انگریز کے منشاء سے باخبر کیا تو لکھا ہے کہ سکھ سرداروں نے انگریز کو بڑی فصیح و بلیغ گالیاں دیں۔

(''رنجیت سنگھ'' مصنفہ خشونت سنگھ صفحہ ۲۱۱)

چنانچہ رنجیت سنگھ کی وفات تک انگریزوں سے دوستی قائم رہی لیکن رنجیت سنگھ کی آنکھ بند ہوتے ہی انگریزوں نے اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کو عیسائی بنالیا۔ اُس کی عمر ۸ سال تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا لڑکا کھڑک سنگھ اس کا جانشین ہوا۔ مگر بڑا کمزور دماغ آدمی تھا۔ چند روز بعد اسے قتل کردیا گیا۔ اور جب اس کا لڑکا کنور نونہال سنگھ اپنے والد کی آخری رسوم ادا کر کے حضوری باغ کے سامنے والے دروازے میں (جو آج کل بھی خستہ حالت میں موجود ہے) سے اندر آرہا تھا کہ اُوپر سے ایک بہت بڑا وزنی پتھر گرا کر اسے ہلاک کردیا گیا۔ نیا مہاراجہ شیر سنگھ (جو مشہور ہے کہ رنجیت سنگھ کا ہی بیٹا تھا) ۱۸ نومبر ۱۸۴۰ء کو تخت نشین ہوا۔ شروع میں تو وہ بہت سادہ لوح اور صاف دل تھا مگر بعض مصاحبوں کی وجہ سے عیاش طبع اور ظالم ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے بھی قتل کردیا گیا۔ اس کا لڑکا پرتاپ سنگھ نہا دھو کر اپنے بال سُکھا رہا تھا کہ حاسدوں نے اُسے بھی قتل کردیا۔ اب رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا بیٹا دلیپ سنگھ جو نومبر ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوا تھا اور بوقت تخت نشینی سات آٹھ برس کا بچہ تھا مہاراجہ تسلیم کرلیا گیا۔ اس کی ماں رانی جنداں سربراہ بنی۔ اُس وقت فوج اور ملک کی حالت کا اندازہ مندرجہ ذیل عبارت سے لگائیں جو سکھوں کے مشہور تاریخ دان گیانی گیان سنگھ اپنی کتاب تواریخ گورو خالصہ صفحہ ۱۶۶ پر لکھتا ہے:۔

''اُس وقت خالصہ فوج کا یہ حال تھا کہ اپنے تئیں بادشاہ سمجھتی تھی اور سوائے لُوٹ مار اور غارت کے کسی کو دوسرا کام ہی نہ تھا۔ جس کو چاہتے تھے لُوٹ لیتے تھے اور جسے چاہتے تھے چھوڑ دیتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ دم مار سکتا۔

فوج کا ہر سپاہی بادشاہ بنا پھرتا تھا۔ مردم آزاری اور دل آزاری کا بازار گرم تھا۔ جس گاؤں میں چلے جاتے تھے وہ اُجڑ جاتا تھا۔ جس بازار سے گذر جاتے تھے وہ خاک ہو جاتا تھا۔ اُسی وقت کا نام سکھا شاہی مشہور ہے۔''

پھر لکھتا ہے:۔

''خالصہ فوج کی خودسری اور سرکشی سے ہر ایک کا ناک میں دم تھا۔ ہر شخص کو اپنی جان کی فکر تھی اور جو دن گذر جاتا تھا غنیمت سمجھتے تھے۔'' (صفحہ ۶۷۳)

اُدھر ستلج کے اس پار لدھیانہ میں بیٹھے انگریز سکھوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں نے عملاً ستلج کے ساتھ ساتھ کے علاقے پر اپنا سکہ جما لیا ہوا تھا اور اردگرد کے سکھ رؤساء کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہوا تھا۔ دارالخلافہ لاہور میں سخت بدامنی کی وجہ سے راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ خوردسال دلیپ سنگھ کو ہمراہ لے کر بمقام قصور لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل کے سامنے پیش ہوا اور رحم کی درخواست کی۔ انگریزوں نے منافقت سے کہا تو یہ کہا کہ ہم ایک دوست کی سلطنت تو نہیں لے سکتے مگر امن قائم کرنے کے لئے سکھ حکومت کی ''امداد'' ضرور کریں گے۔ مگر انگریزوں کی لغت میں ''امداد'' کے معنی کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ غرض گلاب سنگھ کو یقین دلا دیا کہ حکومت سکھوں کی ہی قائم رہے گی مگر چونکہ سکھوں نے انگریزی علاقہ پر حملہ کر کے پہل کی ہے لہٰذا ہم ستلج اور بیاس کے درمیانی علاقہ پر قبضہ کرتے ہیں اور تم ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوان جنگ بھی ادا کرو۔ اُس نے منت سماجت کر کے ۵۰ لاکھ روپیہ معاف کرا لیا۔ کمسن مہاراجہ نے بھی اپنی زبان سے رحم کی درخواست کی اور ۲۰ فروری ۱۸۴۶ء کو لارڈ ہارڈنگ خود لاہور آیا اور طے پایا کہ چونکہ حکومت سخت پریشان ہے، خزانہ خالی ہے، علاقے ویران ہیں، ایک کروڑ روپیہ کے عوض ہم جموں کشمیر اور لداخ لیتے ہیں۔ ۸/مارچ ۱۸۴۶ء کو یہ معاہدہ لکھا گیا۔

اسکے بعد سکھوں نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کی طرف سے درخواست پیش کی کہ چونکہ خالصہ فوج سے دربارِ لاہور کو خطرہ محسوس ہو رہا ہے لہٰذا انگریزی فوج بطور تحفظ لاہور میں رکھی جائے۔ یہی بات انگریز دل سے چاہتے تھے اس پر عہد نامہ کی تمام شرائط کا اعلان کمسن دلیپ سنگھ کی زبان سے کرایا گیا۔ جواباً لاٹ صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر اب سکھوں کی طرف سے ذرا بھی شرارت ہوئی تو پھر معاہدہ وغیرہ کچھ نہ سمجھنا اور ہم جو چاہیں گے کریں گے۔

۱۶/مارچ کو یہ طے ہوا کہ انگریزی فوج کے اخراجات ۲۲ لاکھ روپے دربارِ لاہور ادا کرے گا۔ اس پر رانی جنداں نے سخت احتجاج کیا تو اسے سخت ملٹری پہرہ میں قلعہ شیخوپورہ میں قید کر دیا گیا۔ وہ عورت بڑی ہوشیار تھی اس نے وہاں بھی باہر کے سکھ سرداروں سے رابطہ پیدا کر لیا تو اُسے بنارس بھجوا دیا گیا اور وہاں سے انگلستان، جہاں وہ ۱۸۶۳ء میں فوت ہو گئی۔

آخر کار ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو زمامِ حکومت قلعہ لاہور کے شیش محل میں انگریزوں نے باقاعدہ طور پر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ایک دربارِ خاص منعقد کیا گیا۔ سیّد رجب علی میر منشی گورنر جنرل نے اُٹھ کر اعلان پڑھا کہ مہاراجہ دلیپ

سنگھ کو معزول کیا جاتا ہے اور سکھ حکومت کو مملکتِ برطانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ خطاب مہاراجگی قائم رہے گا۔ ۵ لاکھ روپیہ سالانہ پینشن دی جائے گی وغیرہ۔ اس پر تمام سکھ سردار بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگ گئے اور رنجیت سنگھ کی تمام محنت بیکار ہو گئی۔

چند روز بعد دلیپ سنگھ کو پہلے پشاور کی طرف بھجوا دیا گیا تاکہ اس کو دیکھ کر سکھ قوم کے جذبات بھڑک نہ اُٹھیں۔ پھر فتح گڑھ یو۔پی بھجوایا اور آخر کار ۱۸۵۴ء میں انگلستان بھجوا دیا۔

انگریزی حکومت کے نفوذ کے ساتھ ہی چرچ مشنری سوسائٹی نے اپنا کام تندہی سے شروع کر دیا تھا۔ سر جان لارنس خود اس کا مربّی تھا اور اپنی گرہ سے ۵۰۰ روپے چندہ دیا کرتا تھا اور خواہشمند تھا کہ سکھ سلطنت کے خاتمہ پر پنجاب میں عیسائیت پھیل جائے۔ ۱۸۵۳ء میں امرتسر میں پہلا مشن سکول قائم کیا گیا جہاں پر دلیپ سنگھ بھی پڑھا کرتا تھا۔ انگریز افسران اور پادریوں کے اثر کے تحت دلیپ سنگھ نے عیسائیت قبول کر لی۔ چنانچہ مہاراجہ دلیپ سنگھ جب انگلستان گیا تو ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ ملکہ اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی اسی جذبہ نے اسے مجبور کیا کہ وہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کو یہ خط لکھے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:۔

بکنگھم پیلس

۲۴ جولائی ۱۸۵۴ء

''.....ملکہ لارڈ ڈلہوزی کو بتانا چاہتی ہے کہ وہ دلیپ سنگھ سے مل کر کس قدر خوش ہوئی ہے۔ میرے جذبات ملے جُلے سے ہیں۔ ایک طرف تو تکلیف اور ہمدردی کے جذبات ہیں اور دوسری طرف یہ کہ یہ نوجوان جس کو ہماری فوج نے مغلوب کر لیا، وہ تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا حالانکہ اس غریب کا کوئی قصور نہ تھا، اس کی جوانی عمدہ کیریکٹر اور اس کے تیکھے نقوش اور سب سے بڑھ کر یہ نوجوان اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے اب عیسائی ہو چکا ہے، ہماری ہمدردی کو کھینچتے ہیں۔ ہمیں اس کو دوست بنانا چاہیئے اور اس کی حفاظت کرنی چاہیئے۔..........''

(بحوالہ لیٹرز آف کوئین وکٹوریا۔ جلد سوم صفحہ ۴۹)

اس کے علاوہ بھی ملکہ وکٹوریہ نے دلیپ سنگھ کے بارے میں دو تین خطوط میں اس کے لئے ہمدردی کا اظہار کیا اور بہتری کے خیال سے کچھ تجاویز بتائیں اور ''فرزند دلبند'' کا خطاب بھی عطا فرمایا۔ کیونکہ مہاراجہ موصوف ملکہ وکٹوریہ کے منظورِ نظر تھے۔

مگر خدائی تقدیر کچھ اور ہی تھی۔ خدا تعالیٰ نے اپنی کسی خاص مصلحت کے بناء پر اس کے لئے ذلت اور تکلیف مقدر کر دی تھی جو پوری ہو کر رہی۔

واقعہ یوں ہوا کہ دلیپ سنگھ کے بعض رشتہ داروں نے اُس سے خط و کتابت شروع کر دی اور اُسے لکھا کہ کبھی پنجاب آؤ اور درشن دے جاؤ۔ اُس کے دل میں بھی خیال ہوا کہ چلو اپنے وطن ہو آئیں چنانچہ اس کی ماں رانی جنداں

کے ایک عزیز سردار سنت سنگھ نے اُسے خط لکھا جس کا جواب حسب ذیل ہے۔

ترجمہ:۔

ایلوڈن ہال

تھیٹ فورڈ سفک

میرے پیارے سردار سنت سنگھ

آپ کا خط وصول کر کے مجھے بیحد خوشی ہوئی۔آپ نے جو اپنی خدمات میرے لئے پیش کی ہیں ان کے لئے میں تہ دل سے ممنون ہوں۔مگر مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں۔چونکہ برٹش گورنمنٹ میرے ساتھ انصاف سے انکاری ہے لہذا میں ۱۶ دسمبر کو انگلستان چھوڑ دوں گا اور خاموشی سے دہلی میں رہائش اختیار کر لوں گا۔کیونکہ اب میں بہت غریب ہو چکا ہوں۔

اپنی مرحومہ اماں کے رشتہ دار سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔

جیسا کہ آپ نے سن لیا ہوگا کہ میں نے پھر سے آبائی مذہب قبول کر لیا ہوا ہے۔میں آپ کو ''واہ گرو جی دی فتح'' کہہ کر سلام عرض کرتا ہوں۔

۷ اکتوبر ۱۸۸۵ء دلیپ سنگھ

مہاراجہ دلیپ سنگھ نے برٹش حکومت سے اپنی سلطنت کے عوض بہت سارے مطالبات پیش کئے تھے اور متعدد درخواستیں زیرِ غور تھیں مگر جیسا کہ اس قوم کی عادت ہے وہ ٹال مٹول کرتے تھے۔ان تمام باتوں سے دل برداشتہ ہو کر وہ واپس وطن آنا چاہتے تھے اور عیسائیت قبول کرنے کے باوجود بھی ان کا کچھ لحاظ نہ ہوا اس لئے وہ ان لوگوں سے بہت سخت متنفر ہو گئے تھے۔

اُوپر والا خط مہاراجہ نے اکتوبر ۱۸۸۵ء میں لکھا کہ وہ واپس وطن آ رہے ہیں مگر خدا تعالیٰ کی مشیت کچھ اور تھی۔

چنانچہ نومبر ۱۸۸۵ء میں جمال الدین صاحب سیکھوانیؓ حضرت اقدس امام الزماں مرزا غلام احمد صاحب کی ملاقات کے لئے قادیان گئے۔اُن کا اپنا بیان ملاحظہ ہو:۔

''یہ خاکسار در ماہِ نومبر ۱۸۸۵ء کو واسطے ملاقات جناب مرزا صاحب موصوف کے گیا اور اسی روز منجانب اللہ بابت مہاراجہ دلیپ سنگھ کے منکشف ہوا تھا وہ میرے پاس اور نیز کئی آدمی جو اس وقت موجود تھے ظاہر کیا کہ یہ لوگ آمدن دلیپ سنگھ کے (باعث) سرور و خوشی کر رہے ہیں یہ سرور ان کو حاصل نہ ہوگا۔مجھ کو خدا کی طرف سے ظاہر ہوا ہے کہ جب وہ آئے گا بہت شدائد و مصائب اٹھائے گا بلکہ یہاں تک کہ اُس وقت مرزا صاحب نے فرمایا کہ اس کی لاش ایک صندوق میں مجھے دکھلائی گئی ہے۔''

(رجسٹر روایات صحابہ ۴ صفحہ ۱۵۵، تذکرہ صفحہ ۱۳۷ طبع دوم)

نیز حضرت اقدسؑ نے اشتہار ۲۰ فروری ۱۸۸۶ء میں بھی لکھا کہ:۔

''ایک دیسی امیر نو وارد پنجابی الاصل کی نسبت مجھے بعض متوحش خبریں جو کسی کے ابتلاء اور کسی کی موت وفوت اعزہ وغیرہ پر دلالت کرتی ہیں .... منجانب اللہ منکشف ہوئی ہیں۔''

(تذکرہ صفحہ ۱۳۷ طبع دوم)

اسی طرح حضرت مسیح پاک علیہ اسلام نے کتاب ''شحنۂ حق'' صفحہ ۵۶ پر اپنی پیشگوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

''دلیپ سنگھ کی نسبت پیش از وقوع اس کو (لالہ شرمپت کو) بتلایا گیا کہ مجھے کشفی طور پر الہام ہوا ہے کہ پنجاب کا آنا اس کے لئے مقدر نہیں۔ یا تو یہ مرے گا اور یا ذلّت اور بے عزّتی اُٹھائے گا اور اپنے مطلب سے ناکام رہے گا۔''

اور یہ پیشگوئی حضرت اقدسؑ علیہ السلام نے اُس وقت کی تھی جب سارے پنجاب میں اس کی آمد کا چرچا اور شور مچا ہوا تھا۔ چنانچہ جب مہاراجہ دلیپ سنگھ صاحب سفر کرتے ہوئے عدن پہنچے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے برٹش گورنمنٹ کی ہدایات کے ماتحت اُن کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ گیانی گیان سنگھ نے لکھا ہے کہ:۔

''گورنمنٹ آف انڈیا کو اس کا عام چال چلن مشتبہ نظر آیا۔ اس وجہ سے اُسے عدن سے واپس انگلینڈ جانے کا حکم ہوا۔''

(تواریخ گوروخالصہ صفحہ ۱۰۷)

نیز اس لئے کہ گورنمنٹ نے سوچا ہوگا کہ اگر دلیپ سنگھ پنجاب گیا تو سکھوں کے سوئے ہوئے جذبات بھڑک جائیں گے اور عین ممکن ہے کہ یہ قوم بغاوت کردے اور تمام امن برباد ہو جائے۔ بہر حال خدائی مشیّت یہ تھی کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ وطن نہ آئیں۔

مہاراجہ دلیپ سنگھ نے اپنی خواہش کی تکمیل یوں کرلی کہ عدن کے سکھوں کو بلوا کر ''پوہل'' لے لیا۔ یعنی دوبارہ سکھ مذہب قبول کرلیا۔ جب جہاز مغربی فرانس کی بندرگاہ مارسیلز پہنچا تو دلیپ سنگھ وہاں سے پیرس ہوتا ہوا زارِ روس کے پاس چلا گیا مگر وہاں زار نے اُسے مُنہ نہ لگایا اور آخر کار خجل خوار ہو کر واپس انگلستان آیا۔ ملکہ وکٹوریا سے ملنے گیا تو اس نے ملاقات ہی نہ کی۔ اسے غصہ یہ تھا کہ اس نے عیسائیت کیوں ترک کی۔ آخر کار بڑی مشکل سے شرف ملاقات بخشا مگر پرانی توجہ نہ ہوئی۔ پھر دلیپ سنگھ نے پارلیمنٹ میں دی ہوئی درخواستیں بھی واپس لے لیں مگر ملکہ نے کوئی توجہ نہ دی۔

مہاراجہ دلیپ سنگھ کی غیر حاضری میں اس کی مصری نژاد بیوی نے خاوند کی جدائی سے متاثر ہو کر بندرگاہ ڈوور کے قریب سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔

غرضیکہ خدا کا فرمان جو اس کے پیارے مسیح کی زبان سے جاری ہوا تھا ہر طرح سے پورا ہوا۔ دلیپ سنگھ کو وطن

دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ذلت اور بے عزتی ہوئی۔ اعزہ کی وفات کے سلسلہ میں بیوی فوت ہوگئی اور ہر طرح ناکام رہا۔ اور یہی الہام کا مفہوم تھا۔

دلیپ سنگھ کی ایک لڑکی بمبا سنگھ نے لاہور میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر کرنل سدر لینڈ سے شادی کر لی تھی۔ کرنل صاحب نے حضرت مسیح موعود کو آخری بیماری میں دیکھا تھا اور علاج معالجہ کیا تھا اور انہی کی تصدیق پر انگریز سٹیشن ماسٹر لاہور نے حضور کی نعش کو گاڑی میں لے جانے کی اجازت دی تھی۔

(ماہنامہ خالد مئی ۱۹۷۱ء)

تزلزل در ایوانِ کسریٰ افتاد

ایک عظیم الشان پیشگوئی کا واقعاتی اور تاریخی ثبوت

حضرت سعدی شیرازی کی مشہور کتاب بوستان کے ابتداء میں نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں ایک شعر آتا ہے۔

چوں صیتش بافواہ دنیا فتاد
تزلزل در ایوانِ کسریٰ فتاد

(ترجمہ) جب آنحضرتؐ کی تعریف دنیا میں پھیلی تو کسریٰ کے محل میں زلزلہ آ گیا

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ کسریٰ ایران کے بادشاہ کو کہتے تھے اور تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام کی پیدائش پر کسریٰ کے محل کے چند کنگرے گر گئے تھے۔

اس شعر کا دوسرا مصرع ۱۵ر جنوری ۱۹۰۶ء کو اس زمانہ کے مرسل، امام الزماں حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ السلام پر خدا تعالیٰ نے بطور الہام نازل فرمایا۔

(دیکھئے تذکرہ طبع ثانی ص ۵۸۴)

اس الہام میں اُس زمانہ کی ایرانی حکومت کی ابتر حالت کے متعلق اشارہ ہے۔ اب میں اختصار کے ساتھ اس حکومت کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں جس کے پس منظر میں یہ پیشگوئی نہایت نمایاں نظر آئے گی۔

ایران میں اس وقت قاچار خاندان حکمران تھا۔ قاچار ایران کے چند مشہور اور طاقتور قبائل میں سے ہے۔ اس کا بانی آغا محمد خان تھا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا فتح علی شاہ قاچار بادشاہ ہوا۔ اسی کے زمانہ میں پہلے پہل یورپین اقوام نے ایران میں رسائی حاصل کی۔ ایک امریکن مؤرخ لکھتا ہے:۔

"Under Fateh Ali shah,the nephew and sucsesser of Aga Muhammad Khan,the great drama of Iran begins, in the course of which Iran is drawn deeper and deeper into the net of the European powers. at first as a potential instrument and active partner, later merely as a tool and a victive." "(Iran" by willam S. Hass, columbia University press New Yoork. 1946 pp30)

(ترجمہ) آغا محمد شاہ کے بھتیجے اور جانشین فتح علی شاہ کے عہد میں ایران کا عظیم ڈراما شروع ہوتا ہے جسکے دوران ایران یورپین طاقتوں کے جال میں گھرے سے گہرا پھنس کر رہ گیا۔

ابتداء میں تو (بظاہر) طاقتور ہتھیار بن کر اور پھر سرگرم حصہ دار بن کر اور درحقیقت محض آلہ کار بن کر۔ ("ایران" از ولیم ایس ہاس۔ کولمبیا یونیورسٹی پریس نیویارک ۱۹۴۶ء ص ۳۰) ۱۹۴۶ء میں فتح علی شاہ فوت ہوگیا تو ناصرالدین شاہ قاچار تخت نشین ہوا۔ اُس وقت اُس کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔ اُس نے ۱۸۹۶ء تک حکومت کی مگر اس کا لمبا عہد حکومت مصائب کی ایک لمبی داستان ہے اُس وقت تک ایران ایک ایسا ملک تھا جسکی پُرانی اور قابلِ قدر تہذیب ابھی زندہ تھی۔ اس کے عہد میں یورپین اقوام نے اور بھی جال پھیلائے بظاہر تو وہ ایرانیوں کے بھلے کی بات کرتے تھے مگر دراصل ایران کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جا رہا تھا۔ نہایت باریک تدبیروں سے ایران کی جڑیں کھوکھلی کی جا رہی تھیں۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قدیم تہذیب اور حکومت دونوں کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں اس کے تخت نشین ہونے کے جلد بعد ہی ایرانیوں نے افغانستان کے شہر ہرات پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا مگر انگریزوں نے فوراً بیچ بچاؤ کر کے ہرات واپس افغانوں کو دلا دیا۔ کیوں؟ اس واسطے کہ افغان اُن کے ممنون ہو کر ہندوستان کی سرحد پر توجہ نہ کر سکیں۔ ۱۸۶۴ء میں ایران میں تاربرقی نصب ہوئی اور ۱۸۷۲ء میں بیرن رائٹر کو اجازت مل گئی کہ وہ پہلا بنک ایران میں جاری کرے جو امپیریل بنک آف ایرانکہلاتا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں دریائے قارون میں جہاز رانی کا ٹھیکہ بھی لے لیا۔

ابتداء میں تو ناصرالدین شاہ بہت بیدار مغز معلوم ہوتا تھا مگر اپنے وزیر مرزا تقی خان کے زیرِ اثر اُس نے مغربی طور طریقے ملک میں جاری کرنے شروع کردیئے۔ عوام کی فریاد سننے کے لئے ایک عدالت بھی قائم کی مگر اُسے باقاعدگی سے چلا نہ سکا۔ بادشاہ کے کان میں یہ بات بھی ڈالی گئی کہ وہ یورپین ممالک کی سیاحت کرے۔ کسی ایرانی بادشاہ نے آج تک اپنی مملکت کی سرحد سے باہر قدم نہ نکالا تھا۔ آخر بادشاہ سفر پر روانہ ہوا اور یورپ کے مختلف درباروں میں اس کا نہایت خوشامدانہ استقبال ہوا۔

۱۸۷۳ء میں بادشاہ نے ایک کونسل آف سٹیٹ بنائی مگر کبھی سنجیدگی سے اس کے فیصلوں پر عمل درآمد نہ کرا سکا کیونکہ اس کونسل کی پشت پر کوئی آئینی طریق کار یا قوانین نہ تھے۔ بادشاہ کی مرضی کے مطابق ہی فیصلے ہوتے تھے۔ ایسے حالات میں کوئی شخص ذمہ داری قبول کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا۔ بادشاہ یہ بات خوب سمجھتا تھا کہ مغرب کے طریقے جبھی کامیاب ہو سکتے ہیں اگر اُن کو مشرق کی روایات سے پیوند کر دیا جائے اور یہی بات مشکل تھی۔ نیز مغربی حکومتوں کی سی سپرٹ کہاں سے لاتا؟ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ مغربی اصلاحات ایرانی مزاجوں کے موافق نہیں ہیں اور بات بھی درست تھی۔ ایران خود بھی کسی تبدیلی کے لئے تیار نہ تھا۔ جب مغربی نمائندوں نے دیکھا کہ بادشاہ ہمارے طور طریقے اپنے ملک میں آزمانا چاہتا ہے تو ہر ملک کے نمائندے اپنے اپنے ملک کے لئے مراعات حاصل

کرنے کے لئے آگے بڑھنے لگے اور وزراء کو رشوتیں پیش کرنی شروع کردیں۔ بادشاہ ان تمام واقعات کو بڑے غور سے دیکھ کر دل ہی دل میں کُڑھتا تھا مگر کچھ کر نہ سکتا تھا۔ تاہم مغربی ممالک کے خلاف سخت نفرت اور حقارت کے جذبات اُس کے دل میں بھر گئے۔

He found himself more and more involved in adverse circunistances,so fatal that they in avitably overuholmed his capacities and so he truly became a pathetic figure symbolizing in his person the desting of his country(p.p36)

(ترجمہ) اس نے اپنے آپ کو نہایت مہلک حالات سے گھرا ہوا پایا جو اس کی طاقتوں سے بہت بالا تھیں۔ اس طرح وہ صحیح طور پر ایک قابلِ رحم ہستی بن کر رہ گیا اور اپنے وجود میں اپنے ملک کی مجسم قسمت بن گیا۔ (''ایران'') ص ۳۶

اس عالم مایوسی میں ایک دن آخر اُس کی زبان سے یہ فقرہ نکل ہی گیا ''میں چاہتا تھا کہ ایک بھی یورپین سرزمین ایران میں قدم نہ رکھتا۔ اس صورت میں ہم ان تمام مصائب سے نجات پا سکتے تھے۔ مگر اب چونکہ انہوں نے یہاں قدم جما لئے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ان کی تمام خوبیوں سے پورا فائدہ اٹھائیں۔''

شاہی خزانہ کی آمد بڑھانے کے لئے بعض اشیاء کے ٹھیکے نیلام کئے جاتے تھے مگر ایسے مواقع پر بھی وزیر لوگ خوب کماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان ٹھیکوں کا نیلام بادشاہ کے لئے کسی نیک نامی کا باعث نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۰ء میں تمباکو کی فصل کا نیلام سخت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اُس زمانہ میں دستور تھا کہ ایران میں جس قدر تمباکو کاشت ہوتا وہ بادشاہ کی ذاتی ملکیت تصور ہوتا مگر حکومت نے ایک انگریز کمپنی کو ٹھیکہ دیدیا۔ عوام پہلے ہی نالاں تھے انہوں نے بغاوت کردی۔ مجتہدین نے فتویٰ دیدیا کہ ''قلیاں کشیدن حرام است'' کہ حقّہ پینا حرام ہے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بادشاہ سلامت کا حقّہ بھرنے والے ملازمین نے بھی چلم بھر کر دینے سے صاف انکار کردیا۔ ہر طرف بے چینی کے آثار دیکھ کر بادشاہ نے برٹش کمپنی کا ٹھیکہ منسوخ کردیا مگر بنیا صفت انگریز کو اب چین کہاں؟ جھٹ ایرانی عدالتوں میں بادشاہ پر ۵ لاکھ پاؤنڈ حرجانہ کا دعویٰ کردیا اور ججوں کو رشوت وغیرہ دے دلا کر ڈگری لے لی۔ اب بادشاہ حیران کہ اس قدر رقم کہاں سے ادا کرے؟ آخر امپیریل بنک آف ایران سے ۶ فی صدی شرح پر سودی روپیہ حاصل کیا اور کمپنی کو ادا کیا۔ ۱۸۹۶ء میں بادشاہ کو قتل کردیا گیا اور اُس کی جگہ مظفر الدین شاہ نے لی۔

نیا بادشاہ مظفر الدین شاہ روس کی طرف زیادہ مائل تھا اُس نے خزانہ خالی دیکھ کر روس سے ۶ کروڑ ۲۵ لاکھ روبل (روسی سکہ) قرض لیا۔ دو سال کے بعد ایک کروڑ رُوبل مزید لے لیا۔ روس بھلا کونسا کم ساہوکار تھا اُس نے قرضہ کی ضمانت کے طور پر شمالی ایران کے بہت سے صوبے اپنے نام لگوا لیئے۔ یہ تمام رقوم بادشاہ کی منظور نظر ہستیوں

کے اور سفر یورپ کے کام آئیں، ملکی فائدہ کچھ بھی نہ ہوا۔

ن ۱۹۰۱ء میں تاریخ ایران کا سب سے بڑا حادثہ پیش آیا یعنی حکومت نے ایک آسٹریلین نژاد انگریز ولیم ناکس ڈآرسی کو سوائے پانچ شمالی صوبوں کے تمام مملکت میں سے جہاں چاہے تیل نکالنے کیلئے ۶۰ سالہ پٹہ دیدیا۔ ۱۹۰۹ء میں ڈآرسی نے اپنا ٹھیکہ حکومت انگلستان کے نام منتقل کردیا۔ جس نے لنڈن میں ایک بہت بڑی کمپنی ''اینگلو پرشین آئل کمپنی'' بنا کر مسجد سلیمان میں کام شروع کردیا۔ اس کمپنی نے ہر قدم پر حکومتِ ایران کو دھوکا دہی، فریب کاری غلط حسابات پیش کر کے عظیم الشان نقصان پہنچایا۔ قصہ مختصر کہ آخر کار ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت نے انگلستان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تیل کی صنعت کو قومی تحفظ میں لے لیا اور انگریزوں سے ایک طرح نجات پائی۔ (یہ بہت لمبا قصہ ہے اور انشاءاللہ کسی اور صحبت میں مفصل حالات پیش کئے جائیں گے)۔

جمال الدین افغانی کی تلقین کے زیر اثر ایرانی لوگوں کو یہ شوق ہوا کہ ہم بھی اپنے ملک میں مغربی جمہوریت کی طرز پر اصلاحات جاری کریں۔ چنانچہ بادشاہ سے مطالبہ کیا گیا کہ فوراً پارلیمنٹ (مجلس) بنائی جائے۔ نیز یہ بھی مطالبہ کیا کہ جو وزیر تم کو یورپ کے سیر سپاٹے کیلئے روپیہ فراہم کر کے دیتا ہے اُسے برطرف کردیا جائے مگر بادشاہ نے مطلق توجہ نہ دی۔

ایرانی تاجروں کا طبقہ بھی بادشاہ کی غیر آئینی حکومت سے سخت نالاں تھا۔ ان کی تمام تجارت برباد ہو چکی تھی۔ سامان باہر سے آتا تو قبائلی لوگ لُوٹ لیتے اور کوئی فریاد سُننے والا نہ تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

The xecutive was powerless and order could only be maintained by foreigne troops and genderniry to aggravate the auarchy,the crown was non existant (p.39)

ترجمہ۔ انتظامیہ اسقدر مجبور ہوکر رہ گئی تھی کہ نظم وضبط صرف غیر ملکی فوج اور پولیس کے ذریعہ ہی قائم رکھا جاسکتا تھا۔ طوائف الملو کی کا مقابلہ کرنے کیلئے تاج کی ہستی ہی موجود نہ تھی (ایران ص ۳۹)

بادشاہ کے سرد رویہ سے تنگ آکر لوگوں نے ایران کی قدیم رسم کے مطابق تہران کے باہر بادشاہ عبدالعظیم کی درگاہ میں ''بست'' یعنی وہاں پناہ لیکر بیٹھ گئے۔ کہ ہماری بات بادشاہ مانے گا تو گھروں کو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ تجارتی کاروبار بالکل بند ہوگیا۔ لوگوں کو ضروریاتِ زندگی میسر نہ آتی تھیں۔ تب بادشاہ نے اپنے ایک معتمد کو بھجوایا کہ تم گھروں کو جاؤ ہم انصاف کریں گے اور شکایات دُور ہو جائیں گی مگر بقول آغا حشر کاشمیری بادشاہوں کے وعدے تو

''ریت کی دیوار پر بنیاد ہے ہر بات کی'' طرح ہوتے ہیں۔

اُدھر اتفاق سے ۱۹۰۶ء میں بادشاہ فالج سے سخت لاچار ہو گیا۔ لوگوں نے پھر مطالبہ کیا کہ وہ آپ کے وعدے کہاں گئے؟ اور پھر ایک دفعہ "بست" اختیار کی گئی۔ اس دفعہ کہاں؟ انگریزی سفارت خانہ میں۔ بادشاہ کی گرتی ہوئی صحت دیکھ کر انگریزوں نے لوگوں کو پھر اُکسایا کہ اب موقعہ ہے مطالبہ تیز کر دو۔ ورنہ کیا ایرانیوں کو برٹش سفارت خانہ کے سوا کسی اور جگہ بست کے لئے جگہ نہ مل سکتی تھی؟

بادشاہ نے وفات سے قبل ایران کی پہلی مجلس (پارلیمنٹ) بلوا ہی لی۔

اس کا جانشین محمد علی شاہ قاچار سخت نالائق انسان تھا۔ وہ بادشاہ کم اور گھسیارا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ بدقماش حاشیہ نشین فراہم کر لئے۔ دو تین دفعہ کوشش کی کہ ملکی آئین کو توڑ کر پھر سے شخصی حکومت قائم کر لے۔ پہلے ۱۹۰۷ء میں اور پھر ۱۹۰۸ء میں جب زارِ روس نکولس ثانی نے اسے ترغیب دی کہ تم مجلس اور رعایا کو سختی سے کیوں نہیں دباتے۔ بادشاہ نے اس تجویز کے مطابق اپنی فوج جمع کی مگر عوام بیدار ہو چکے تھے ڈٹ کر مقابلہ ہوا اور ایران کے مشہور طاقتور بختیاری قبیلہ کی مدد سے بادشاہ کو شکست دی بادشاہ نے مغلوب ہو کر ۱۵۔ نومبر ۱۹۰۹ء کو تخت سے دستبرداری لکھ دی اور روس کے سفارت خانہ میں جا کر پناہ لے لی۔

امراء سلطنت نے اُس کے ۱۲ سالہ بچے شاہ احمد شاہ قاچار کو تخت پر بٹھا دیا۔ مگر ایک بچہ اس بگڑی ہوئی حالت کو کیسے سنبھال سکتا تھا؟ روسی امداد سے ۱۹۱۱ء میں محمد علی شاہ نے ایک دفعہ پھر تاج و تخت واپس لینے کی کوشش کی مگر نا کام رہا۔ ایک تو احمد شاہ بچہ ہی تھا دوسرے مصاحب سخت خراب مل گئے۔ اُس نوجوان کو عیاشی کا راستہ دکھانے لگے۔ چنانچہ اس کی صحت بگڑ گئی اور وہ اکتوبر ۱۹۲۳ء سے مستقل طور پر پیرس میں جا کر بیٹھ گیا۔ احمد شاہ کے متعلق ۱۹۲۵ء کے اخبارات میں کے فائل دیکھ لیں لکھا تھا کہ پیرس کی گلیوں میں خجل خوار اور گدھے سوار ہو کر مرا۔ کوئی اُس پر آنسو بہانے والا بھی نہ تھا۔ بھلے وقت کے تمام حواری بھاگ گئے۔

احمد شاہ کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

Ahmad Shah practically ruled over ruines and being infirm in health disinterested in a task which exceeded his powers.(world History by Hayes Moon and Wayward Mae Millan coy Londan)

(ترجمہ) احمد شاہ عملاً کھنڈروں پر حکومت کرتا تھا اور چونکہ کمزور صحت کا تھا وہ جلد ہی اپنے فرض سے اُکتا گیا جو اسکی طاقت سے کہیں بڑھ کر تھا۔

ناظرین کو خوب اندازہ ہو گیا ہوگا کہ حضرت امام الزماں کو خدا تعالیٰ نے اپنی وحی میں جو خبر دی تھی وہ کس شان سے پوری ہوئی وھو المراد:

(ماہنامہ خالد مارچ ۱۹۷۱ء)

خان بہادر ملک صاحب خان نُون

پنجاب کے چار اضلاع پاکستان کے بازوئے تیغ زن کہلاتے ہیں یعنی سرگودہا۔ جہلم۔ راولپنڈی اور کیمل پور۔

ضلع سرگودہا کا پہلا نام شاہ پور ہوتا تھا۔ مگر ۱۹۰۱ء میں جب نیا بندوبست ہوا تو اُس وقت کے افسر آباد کاری مسٹر ولیم میلکم ہیلی (جو بعد میں پنجاب اور یوپی کے گورنر ہوئے) نے اس کا نام سرگودھا رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس جگہ آجکل یہ شہر سرگودھا آباد ہے وہاں پر ایک بڑا سا جوہڑ ہوا کرتا تھا جس کے اردگرد گودہا نامی ایک شخص اپنی بھینسیں چرایا کرتا تھا اور جوہڑ کو ہندی میں ''سر'' کہتے ہیں۔ جیسے امرت سر۔ اسی کے وزن پر سرگودہا۔ یعنی گودھے کا تالاب کے نام سے یہ جگہ سرگودہا مشہور ہوگئی۔

اس ضلع میں نُون، ٹوانے۔ قریشی [1] گوندل نگیانے۔ رانجھے [2] ککارے۔ کلیار اور اعوان وغیرہ قومیں آباد ہیں۔ اور معزز شمار کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض قومیں اپنی شجاعت، دلیری اور فوجی سپرٹ کے لحاظ سے تمام برصغیر میں مشہور ہیں۔ نواب سرمحمد حیات خاں نون اور اُن کے بیٹے ملک سرفیروز خاں نُون (سابق وزیراعظم پاکستان) معروف ہستیاں تھیں اور ٹوانوں میں سے جنرل نواب سرعمر حیات ٹوانہ اور اُن کے فرزند ملک خضر حیات خاں ٹوانہ بہت مشہور تھے۔

نواب سرمحمد حیات خاں نُون کے ایک بھائی ملک حاکم خاں نُون کے فرزند ارجمند خان بہادر ملک صاحب خاں نُون ڈپٹی کمشنر آج کے مضمون کا عنوان ہیں۔

ملک صاحب خاں نون نے اُس وقت کے رواج کے مطابق میٹرک چیفس کالج (جسے آجکل ایچی سن کالج کہتے ہیں) سے پاس کیا اور اپنی خاندانی وجاہت کے پیش نظر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بھرتی ہوئے۔ سب سے پہلی تقرری گورداسپور میں ہوئی۔ ٹریننگ کے سلسلہ میں ایک دن قادیان کا دورہ تھا۔ حضرت امیرالمومنین مولانا نورالدین صاحب رضی اللہ عنہ، سریر آرائے خلافت تھے۔ حضرت کے اور نُون خاندان کے بوجہ ہم وطنی قدیم اور گہرے مراسم تھے۔ سعادت ازلی ملک صاحب کو کشاں کشاں حضرت کے مطب میں لے گئی۔ سلام عرض کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرت جب اور مریضوں سے فارغ ہوئے تو ملک صاحب نے اپنا تعارف کرایا۔ حضور بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''بیٹا تم کدھر آنکلے''؟ ملک صاحب نے عرض کیا کہ میری تقرری گورداسپور میں ہوئی ہے آج حُسن اتفاق سے قادیان کا دورہ تھا۔ میں نے سوچا کہ حضور کو سلام کرتا جاؤں۔ حضرت

---

[1] حضرت خلیفۃ المسیح الاول نے لکھا ہے کہ حضرت عکرمہ بن ابوجہل کی اولاد ضلع ہوشیار پور میں آباد ہے۔ یہ لوگ صابو وال تحصیل شاہ پور کے مشہور قریشی خاندان کے افراد ہیں۔

[2] حضرت مسیح موعود کے جلیل القدر صحابہ حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ بھی رانجھا تھے۔

مولانا نے علاوہ اور باتوں کے یہ بھی دریافت فرمایا کہ ’’ہمارے ہاں کب آؤ گے‘‘ ملک صاحب جھٹ سمجھ گئے اور عرض کیا کہ ’’میں کوئی دور تو نہیں ہوں۔ صرف حجاب سا ہے اور یہ بھی خیال ہے کہ استقلال ہو جائے گا تو بیعت کرلوں گا۔‘‘ حضور نے فرمایا۔ ’’نیکی میں دیر نہ کرنی چاہئے۔‘‘ اور ملک صاحب نے بلا پس و پیش حضرت خلیفہ اوّلؓ کے ہاتھ پر سلسلہ عالیہ احمدیہ میں بیعت کرلی۔ حضرت مولانا نے بہت دعائیں دیں جو ملک صاحب کی کامیابیوں کی ضامن ہوئیں۔

میرے دریافت کرنے پر ملک صاحب نے مجھے بتایا کہ ہماری باتیں پنجابی میں ہوئی تھیں اور وہ بھی ضلع سرگودہا کی بولی میں۔

ستمبر ۱۹۳۴ء میں راقم الحروف رسالہ ’’پیشوا‘‘ دہلی میں حافظ سیّد عزیز حسن بقائی کے پاس ملازم تھا کہ یکا یک ایک دن مجھے حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحبؓ کا خط ملا کہ فوراً ملازمت چھوڑ کر میرے پاس گوجرانوالہ آجاؤ۔ میں نے تمہاری ملازمت کا بندوبست ایک احمدی مجسٹریٹ کے پاس کر دیا ہے۔ یہ بھی تحریر فرمایا کہ آتے ہوئے عمدہ پانوں کی ایک ڈھولی حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کے لئے لیتے آنا جو میں لے کر اگلے دن حاضر ہو گیا۔

حضرت میر صاحبؓ مجھے اپنے ہمراہ لے کر ملک صاحب خاں صاحب نُون کے ہاں آئے اور فرمایا کہ ’’ملک صاحب یہ میرا آدمی ہے۔‘‘ ملک صاحب نے میرے شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کا امتحان لیا اور اظہار اطمینان فرمایا۔

آپ کا تبادلہ چکوال ہو چکا تھا۔ جب ہم روانہ ہونے لگے تو حضرت ڈاکٹر صاحبؓ الوداعی ملاقات کیلئے تشریف لائے۔ ملک صاحب سے اجازت لے کر مجھے ایک طرف لے گئے اور فرمایا کہ جس جگہ تم جا رہے ہو وہاں لوگ تم کو بہت رشوت پیش کیا کریں گے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ ایک پیسہ بھی قبول نہ کرو گے۔ میں نے اپنے الفاظ میں اقرار کیا مگر حضرت میر صاحب فرمانے لگے کہ میری تسلّی نہیں ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی تسلی آخر کس طرح ہوگی؟ فرمانے لگے۔ کہ میرے ہاتھ پر بیعت کرو کہ تم کبھی بھی کسی حالت میں رشوت نہیں لوگے۔‘‘ میں نے حضرت میر صاحب کا ہاتھ اپنے دونو ہاتھوں میں تھام لیا اور نہایت صدق دل سے وہ الفاظ دہراتا رہا۔ بیعت کے بعد آپ نے فرمایا کہ مجھے خط لکھتے رہنا۔

چکوال پہنچ کر میاں محمد شریف صاحب (جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی ہیں) سے ملک صاحب نے ڈویژن کا چارج لیا اور چند فیصلے مجھے لکھوائے۔

اگلی صبح سردار مکھن سنگھ صاحب کورٹ انسپکٹر مجھے ملنے کیلئے آئے اور آتے ہی بڑی صفائی سے ۔/۵۰ روپے کے نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیئے اور کہا کہ صرف یہ بتا دو کہ فلاں مقدمہ میں کتنی سزا ہوئی ہے؟ میں نے بہت حیرانگی سے نوٹوں کو دیکھا۔ حضرت میر صاحب میرے سامنے آگئے اور گھورنے لگے۔ میں نے بڑی جرأت سے کہا کہ سردار صاحب! پہلے ایس ڈی۔ او میاں محمد شریف صاحب بھی احمدی تھے۔ ملک صاحب بھی احمدی ہیں اور میں بھی

احمدی ہوں۔ہم لوگ نہ ایسا کام کرتے ہیں نہ کریں گے۔اپنے نوٹ واپس لیں۔وہ بڑی لجاجت سے کہنے لگے کہ تم نے طلب تو نہیں کئے میں خوشی سے دے رہا ہوں۔میں نے کہا مجھ سے کسی ایسی بات کی توقع نہ رکھیں اور وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔

قریباً پانچ دن تک ایسا ہی ہوتا رہا کہ کوئی نہ کوئی وکیل رشوت دے کر مجھ سے دریافت کرنے آجاتے کہ صرف دو گھنٹے ہی قبل از وقت بتا دو کہ فلاں مقدمہ میں کیا فیصلہ ہوا ہے مگر سب مجھ سے مایوس ہی واپس لوٹتے۔

اس تسلسل سے مجھے کچھ حیرت ہوئی اور میں نے محترم ملک صاحب مرحوم کی خدمت میں حضرت میر صاحب سے اپنی بیعت کا واقعہ اور رشوت کا حال عرض کر دیا۔اس پر ملک صاحب نے اپنی کوٹھی پر پولیس کا پہرہ لگوا دیا تا کہ کوئی اندر آ ہی نہ سکے۔دوسرے مجھے ہدایت کر دی کہ فیصلہ شدہ مقدمات کی امثلہ لے کر کچہری جانے سے ۱۰ منٹ قبل اُن کے کمرے میں آجایا کروں وہاں سے ہم دونوں اکٹھے نکلا کرتے تھے اور کمرہ عدالت میں جاتے ہی وہ فیصلے سُنا دیتے۔

ملک صاحب موصوف بہت وجیہہ انسان تھے۔لحیم شحیم اور ضلع سرگودہا کے مردانہ حُسن کا اعلیٰ نمونہ تھے۔کچہری کے وقت انگریزی لباس پہنتے اور وہاں سے واپس آکر ضلع سرگودہا کے رواج کے مطابق کھلے گلے کا کرتہ اور ''لاچا'' پہن لیتے۔جمعہ اور عیدین کے موقعوں پر اچکن پگڑی سلوار پہنتے۔

ایک دفعہ جہلم کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایف ایم انر چکوال آئے۔اُس دن ملک صاحب نے نہایت اعلیٰ قسم کا سوٹ پہنا۔فیلٹ ہیٹ بالکل نئی تھی۔ملک صاحب کے مقابل میں ڈپٹی کمشنر ایک غریب سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔جب کھانے کا وقت آیا اور ملک صاحب نے چاندی کے برتن نکال کر میز پر سجائے تو اسکی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔یہ صاحب فتنہ احرار کے دنوں میں گورداسپور کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے تھے اور قادیان کے ٹاؤن ہال میں ان کی ملاقات حضرت خلیفہ ثانیؓ سے ہوئی تھی۔یہ صاحب چاہتے تھے کہ گورنمنٹ اور جماعت احمدیہ کی غلط فہمیاں دُور کر دی جائیں مگر گورنر نے ان کو بہت جلد تبدیل کر دیا ان کے والد سر چارلس انر گورنر برما تھے۔

ملک صاحب موصوف نہایت ستھری عادات کے مالک تھے۔صفائی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ سفر ہو یا حضر نماز عین وقت پر نہایت خشوع وخضوع سے ادا کیا کرتے۔تسبیح۔درود شریف اور دیگر مسنون ادعیہ پر بہت زور دیتے تھے۔سردیوں میں نماز عشاء کے بعد تیز گرم پانی کا آفتابہ نمدے سے ڈھانپ کر ایکطرف رکھدیا جاتا تھا تا کہ نماز تہجد کے وقت پانی نیم گرم مل سکے۔تہجد کی نماز بڑی باقاعدگی سے ادا کرتے تھے اور اس کے بعد نماز فجر تک مصلّے پر بیٹھے رہتے تھے۔میں نے کبھی نماز بے وقت پڑھتے ہوئے انہیں نہیں دیکھا۔

صدقہ خیرات کثرت سے دیتے تھے۔جب دورہ پر ہوتے تو مساجد میں تیل ڈلوایا کرتے تھے مگر جب علم

ہوا کہ اردلی رقم ہضم کر جاتا ہے تو یہ ڈیوٹی میرے ذمہ لگی کہ خود جا کر تیل ڈالا کروں۔

جماعتی چندے بڑی باقاعدگی اور شوق سے ادا کیا کرتے تھے اُس زمانہ میں ہر ماہ کا میزان -/۲۲۰ روپے ہوتا تھا۔ میں منی آرڈر کی رسید دکھاتا تب اطمینان ہوتا تھا۔ ایک دن میں ڈاک خانے جا رہا تھا۔ ایک ہندو وکیل میرے ہمراہ چل رہا تھا وہ پوچھنے لگا کہ یہ رقم ملک صاحب اپنے گھر بیوی کو بھجوا رہے ہیں؟ میں نے کہا نہیں یہ جماعتی چندوں کی رقم ہے۔ وہ نہایت خوفزدہ سا ہو کر کہنے لگا تو پھر یہ بچاتے کیا ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ خدا کے بنک میں بھی تو BALANCE ہونا چاہئے۔ جس پر وہ بہت خوش ہوا مگر ساتھ ہی کہنے لگا کہ ”مہاراج! کوئی ہندو کا بیٹا یہ کام نہیں کر سکتا۔“

حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ سے دالہانہ محبت تھی اور بڑا ادب کیا کرتے تھے۔ جب ۱۹۳۴ء میں تحریک جدید کا آغاز ہوا۔ اور انیس (۱۹) مطالبات کا اخبار میں اعلان ہوا تو پہلے اُن کا خلاصہ تیار کیا۔ پھر مجھ سے تیار کرایا اور مقابلہ کر کے جب دیکھ لیا کہ دونوں تقریباً برابر ہیں تو ایک نقل خوشخط لکھوا کر گھر بھجوائی کہ اسے ہر وقت پیش نظر رکھو اور اس پر سختی سے عمل کرو۔

حضرت خلیفہ ثانیؓ کی ذات سے دالہانہ عشق کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں:۔

احرار نے جب جماعت احمدیہ کے خلاف ۱۹۳۵ء میں طوفان اٹھایا۔ انہی دنوں ملک صاحب پنجاب گورنمنٹ کے چیف سکرٹری سی۔ سی۔ گاربٹ کی کوٹھی پر کھانا کھا رہے تھے۔ دوران گفتگو گاربٹ صاحب کے منہ سے حضرت صاحب کی شان میں کچھ بے ادبی کے الفاظ نکل گئے۔ ملک صاحب کو بڑا طیش آیا۔ جھٹ ایک پلیٹ اُٹھا کر صاحب کے سر پر دے ماری اُسے ڈانٹ کر کہا کہ تم کو معلوم ہونا چاہیئے میں اُن کا ادنیٰ سا خادم ہوں۔

انگریزوں میں یہ صفت بہت خوب تھی کہ ایسے موقعوں پر جھٹ سنبھل جایا کرتے اور معافی مانگنے لگ جاتے تھے۔ گاربٹ نے بھی جھٹ ملک صاحب سے معذرت کی اور افسوس ظاہر کیا کہ بالکل نادانستہ طور پر اُس کے منہ سے ایسے الفاظ نکل گئے اور کہا کہ آپ مجھے معاف کر دیں۔ جب ملک صاحب رخصت ہونے لگے تو باوجودیکہ وہ خود چیف سیکرٹری تھا اور ملک صاحب اُس کے ماتحت ایک مجسٹریٹ تھے خود دروازے تک ساتھ آیا اور دوبارہ معذرت پیش کی۔

دینی غیرت کا ایک اور واقعہ ہے:۔

ایک دن ملک صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے اور ایک خط مجھے دیا کہ ”یہ فیروزے کا خط ہے اسکا جواب لکھ دو“ میں حیران کہ یہ ”فیروزہ“ کون ہوا؟ ملک صاحب کا ایک اردلی بڑا اکھڑ مزاج فیروز خاں نامی تھا۔ میرا ذہن اُس کی طرف گیا۔ میں نے سمجھا کہ کوئی گستاخی کا خط لکھا ہے۔

کھولنے پر معلوم ہوا کہ ملک صاحب کے تایازاد بھائی ملک سر فیروز خاں نون (سابق وزیر اعظم پاکستان)

کا خط ہے۔ اُس کا جواب مجھے زبانی بتادیا اور چلے گئے۔ میں فوراً جواب لکھ کر دستخط کیلئے اُن کے کمرے میں گیا تو پڑھ کر کہنے لگے۔ ''میں نے تو اسپر دستخط نہیں کرنے۔ تم اپنے دستخط سے بھجوادو۔'' میں نے وہی خط اپنی طرف سے لکھکر ملک فیروز خاں صاحب کو پوسٹ کردیا۔

چندروز بعد ملک فیروز خاں صاحب نے میرا لکھا ہوا خط یہ لکھ کر واپس کردیا۔ ''بھائی جان ہمیں اپنے کلرک سے توذلیل نہ کرائیں۔''

اس کا جواب بھی ملک صاحب نے مجھ سے ہی لکھوا کر بھجوایا۔ بعد میں خاکسار نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ نے خود جواب نہ دیا تو فرمایا کہ ''تم کو نہیں معلوم۔ قادیان میں احرار کا جو جلسہ آریہ سکول کے احاطہ میں ہوا تھا اُس میں ''فیروزے'' کا بہت حصہ تھا۔ اُس دن سے مجھے اس سے نفرت ہوگئی ہے۔''

آخرایک لمبے عرصہ کے بعد حضرت اقدسؓ کے ارشاد کے ماتحت ملک فیروز خاں سے صلح کرنے کیلئے لاہور گئے اپنا کارڈ اندر بھجوایا تو وہ خود برآمدے میں آئے اور ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ ''آخر آگئے نا میرے پاس'' بس طبیعت خراب ہوگئی اور بغیر ملاقات کے فوراً واپس چلے آئے اور حضرت صاحب سے آکر کہہ دیا کہ آئندہ کبھی نہیں ملوں گا۔

ایک دفعہ میں نے دریافت کیا کہ آپ کو سب سے عجیب مقدمہ کونسا پیش آیا؟ فرمانے لگے کہ میں پاک پٹن میں تھا۔ ایک لاولد بیوہ عورت کے خلاف اس کے دیوروں نے درخواست دی کہ یہ بڑی فاحشہ ہے جائیداد کو ٹھکانے لگارہی ہے۔

شام کو وہ عورت کوٹھی پر آگئی تا اپنے مقدمہ کے حالات بتاسکے مگر آپ نے سختی سے ڈانٹا کہ جو کہنا ہے عدالت میں کہنا۔ وہ رونے لگ گئی اور کہا کہ بیٹا خدا تم کو بڑا اقبال دے میری ایک بات سُن لو پھر جو مرضی ہے کرنا۔

اُس نے بتایا کہ ۴۰ سال قبل جس شخص سے اُس کی شادی ہوئی تھی وہ بالکل نااہل تھا۔ شادی کے معاً بعد وہ ہاتھ جوڑ کر مجھے کہنے لگا کہ میری عزّت رکھ لو۔ اس شریف عورت نے اس کی بات مان لی۔ اب وہ فوت ہوگیا ہے اور میرے دیور اُس کی زمین لینے کیلئے کوشاں ہیں کہ مجھے فاحشہ ثابت کریں۔ تم مجسٹریٹ ہو تم لیڈی ڈاکٹر سے میرا معائنہ کرالو اگر یہ ثابت ہوجائے کہ مجھے آج تک کسی مرد نے نہیں دیکھا تو میں سچی وگرنہ جس قدر چاہو سزا دے دینا۔ اگلے دن ملک صاحب نے لیڈی ڈاکٹر کو بلوا کر رپورٹ مانگی۔ رپورٹ عورت کے حق میں تھی۔ آپ نے اس کے دیوروں کو بہت بُرا بھلا کہا اور اُن سے نیک چلنی کی ضمانت لے لی۔

چکوال میں ایک ہندو سنار کی بیوی بڑی خوبصورت تھی۔ ایک مسلمان اے۔ ایس۔ آئی اُس پر فریفتہ ہوگیا مگر وہ شریف زادی گمراہ نہ ہوئی۔ تھانیدار نے اُسے پریشان کرنے کیلئے ان کی دُکان میں کوکین کی ایک پُڑیا رکھوا کر ان کی تلاشی لی اور سنار کو گرفتار کرلیا۔ ساتھ ہی اس کی بیوی کو بغیر کسی وجہ سے گرفتار کرکے حوالات میں

بھجوادیا۔ گرمیوں کے دن۔ رات گئے تک اُسے پینے کو پانی نہ دیا۔ ملک صاحب کو چند ہندو وکیلوں نے تمام حالات کی اطلاع دے دی۔ عشاء کے بعد میں سونے ہی لگا تھا کہ ملک صاحب خلاف عادت آگئے اور حکم دیا کہ تم فوراً تھانے جاؤ اور اُس عورت کو اپنے سامنے پانی پلوا کر آؤ اور تھانیدار سے کہدو کہ صبح عدالت میں ان دونوں کو پیش کرے گا وہ کئی دن کا ریمانڈ لے چکا تھا جب تک میں تھانے سے نہ لوٹا ملک صاحب کوٹھی سے باہر ہی ٹہلتے رہے۔

اگلے دن ملک صاحب نے اس غریب عورت کو تو فوراً رہا کر دیا اور اس کے خاوند سے صرف ایک سو روپے کی ضمانت لے کر جانے دیا اور ہندو وکیلوں سے معذرت کی کہ اُس تھانیدار نے مسلمانوں کو ذلیل کرایا ہے۔ پھر اُس کے خلاف رپورٹ کر کے اُسے ڈی گریڈ کرا کے حوالدار بنوادیا۔

ملک صاحب کو اپنے ضلع کے دوسرے امراء کی طرح شکاری کتّوں کا بڑا شوق تھا۔ ان کیلئے علیحدہ نوکر مقرر تھے۔ کبھی میں نے کتّوں کو زمین پر بیٹھتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ان کیلئے چارپائیاں مہیّا کی جاتیں۔ گاہے گاہے وٹرنری ڈاکٹر کو بلوا کر ان کا معائنہ کرایا جاتا تھا۔

ملک صاحب کی بڑی خواہش ہوتی تھی کہ یہ عاجز بھی شکار میں اُن کے ہمراہ جایا کرے مگر مجھے کتّوں سے شدید نفرت تھی سوائے ایک آدھ دفعہ کے کبھی ہمراہ نہ گیا۔ مجھے اُس زمانہ میں بھی کتب بینی میں مزہ آتا تھا۔

ملک صاحب کے کئی نوکر تھے۔ جب یہ خاکسار حاضر ہوا تو ایک دن مجھے فرمانے لگے کہ مجھے ایک موٹر ڈرائیور بھی منگوا دو تو اچھا ہو اس طرح ہم تینوں باجماعت نماز بھی ادا کر لیا کریں گے۔

میں نے قادیان سے میاں محمد رمضان صاحب کو بلوا لیا جو کچھ عرصہ قبل دفتر پرائیویٹ سیکرٹری میں ملازم تھے وہ بہت ایماندار نیک طبع اور صوفی منش آدمی تھے۔ ملک صاحب ان کی بہت قدر کرتے تھے۔

ملک صاحب کے باورچی کا نام ممتاز علی تھا جو یو۔ پی کا رہنے والا تھا۔ قریبی رشتہ دار اُس کا کوئی نہ تھا۔ ایک لمبے عرصہ سے یہاں ملازم تھا۔ اپنے فن کا استاد اور بہت ہوشیار آدمی تھا۔

ملک صاحب نے اُسے حکم دے رکھا تھا کہ شاکر صاحب اور رمضان صاحب کو وہی کھانا دیا جائے جو ملک صاحب کے لئے تیار ہوتا ہے۔ کچھ دنوں تک ایسا ہی ہوا پھر باورچی سالن میں گرم پانی ڈال کر دینے لگا۔ میں تو صابر شاکر آدمی تھا خاموش رہا مگر محمد رمضان نے لڑائی شروع کر دی۔ اُدھر باورچی کہنے لگا جاؤ جو کرنا ہے کر لو۔ اگر شکایت ہوتی تو شاکر صاحب کیوں نہ بولتے۔

محمد رمضان نے فوراً بھوک ہڑتال کر دی۔ تیسرے دن ملک صاحب نے مجھے بلوایا اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے صاف صاف کہدیا کہ ممتاز باورچی کی شرارت ہے۔ کہنے لگے کہ مجھے کیوں نہ بتایا؟ میں نے کہا ملک صاحب میں خُدا کا دن بھر کیا سنوارتا ہوں کہ مجھے یہ خوراک بھی دے جو مجھے مل رہی ہے۔ صبر شکر کر کے چُپ رہتا ہوں کہنے لگے یہ بالکل غلط ہے۔ مجھے فوراً بتانا چاہیئے تھا۔ تم میرے احمدی بھائی ہو تم کو تکلیف ہوگی اور تمہیں تو

حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب نے اپنا آدمی سمجھ کر بھجوایا تھا۔ میں تمہاری ذلت نہیں دیکھ سکتا۔

محمد رمضان نے فوراً جلتی پر تیل ڈال دیا۔ کہ جناب یہ آپ کا باورچی آپ کے نام پر نمبرداروں سے روزانہ تین چار سیر مکھن۔ دودھ۔ چینی منگوایا کرتا ہے اور مکھن کا بڑا حصہ خود کھا جاتا ہے۔ ملک صاحب کہنے لگے یہ کیسے ممکن ہے؟ اُس نے کہا آج رات آپ کو یہ تماشہ دکھا سکتا ہوں۔ خود ملاحظہ فرمالیں۔ ملک صاحب نے میری ڈیوٹی لگا دی کہ جب باورچی مکھن کھا رہا ہو مجھے جگا دینا۔

رات ساڑھے بارہ بجے محمد رمضان نے آ کر مجھے بتا دیا کہ اب اس وقت ممتاز مکھن پر چینی ڈال کر کھا رہا ہے۔ جب میں نے خود دیکھ کر تسلی کر لی تو میں نے ملک صاحب کو جگا دیا۔ اُنہوں نے خود دیکھ لیا اور کافی دیر انتظار کرتے رہے۔ پھر غصے سے جالی دار دروازے کو جولات ماری تو وہ تڑاق سے ٹوٹ گیا اور ممتاز کو خوب مارا۔ پھر مجھے کہنے لگے تم بھی مارو۔ میں نے کہا کہ اب اسے نصیحت آ گئی ہو گی معاف فرمائیں۔

اب مجھ پر حقیقت کھلی کہ ممتاز باورچی ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ وہ سوائے چائے کے کچھ نہیں کھاتا۔ وہ کہا کرتا تھا وہ مطلق روٹی نہیں کھاتا۔ بھلا جو ڈھائی تین سیر مکھن اور اسی قدر چینی کھالے اُسے روٹی کی کیا ضرورت رہی ؟ دن بھر وہ تیز چائے پیتا رہتا تھا۔ اس کے بعد ہمیں اچھا سالن باقاعدہ ملنے لگا۔ ایک دفعہ ملک صاحب دو ہفتے کی رخصت پر اپنے گاؤں فتح آباد گئے۔ مجھ سے پوچھا کہ ہمراہ چلو گے۔ میں نے کہا اگر کوئی کام ہے تو ضرور جاؤں گا کہنے لگے کام تو کوئی نہیں ہو گا۔

فتح آباد ایک قدرتی جھیل کے کنارے آباد ہے۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ جب محمد رمضان نے دیکھا تو وہ غیر آباد پڑی تھی۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی۔ اُسے بہت دُکھ ہوا اُس نے تمام گرد و غبار اپنی پگڑی سے صاف کیا اور مسجد کے فرش کو دھویا۔ اور خوشبو جلائی۔ اذان دی مگر ایک شخص بھی نماز کے لئے نہ آیا۔ اُس نے اس پر بھوک ہڑتال کر دی۔ آخر ملک صاحب نے پوچھا تو اُس نے بڑی جرأت سے جواب دیا کہ یہ مسجد قیامت کے روز آپ پر دعویٰ کرے گی۔ ملک صاحب فوراً سمجھ گئے۔ کہنے لگے آئندہ میں نماز پڑھنے کے لئے ضرور آیا کروں گا تم کھانا کھالو مگر رمضان صاحب نہ مانے اُس نے کہا کہ تمام شہر میں منادی کرائیں کہ سب خورد و کلاں۔ مرد و زن آج عصر کی نماز میں آئیں عورتوں کے لئے پردے کا انتظام کرائیں۔ آپ کی بیگم صاحبہ بھی آئیں۔ باتیں سب معقول تھیں۔ تب تیسرے دن عصر کی نماز رمضان صاحب نے پڑھائی۔ پھر ملک صاحب خود اندر سے پُر تکلف ناشتہ لائے اور مسجد میں پاس بٹھا کر کھلایا۔ اس واقعہ کے بعد رمضان صاحب کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔

ملک صاحب کا طریق یہ تھا کہ دس بجنے میں دو تین منٹ ہوتے تو مجھے اشارہ کرتے کہ آؤ چلیں پورے دس بجے عدالت شروع ہو جاتی ۱۲ بجے دوپہر تک تمام مقدمات ختم ہو جاتے۔ دو دفعہ ظہر کے بعد بھی عدالت کی۔ پھر باہر نکل کر پوچھ لیتے کہ کسی شخص نے کچھ کہنا ہو تو آگے آجائے۔ جب دیکھ لیتے کہ کوئی نہیں آگے آیا تو گھر کو چل دیتے۔

ملک صاحب کے ریڈر منشی غلام محمد سکنہ ٹاہلیانوالہ نزد جہلم بھی باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ مقدمات کی لسٹ مجھے بھی دکھا دی جاتی تھی۔ جب کبھی کوئی ہندو ساہوکار کسی مسلمان کی زمین قرضے کے عوض قرق کرانے کی درخواست دیتا تو غلام محمد صاحب مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیتے اور آہستہ سے مثل ملک صاحب کے سامنے رکھ کر عرض کرتے کہ فلاں سیٹھ صاحب نے مسلمان مزارع کی زمین قرق کرانے کیلئے درخواست دی ہے۔ بس ملک صاحب باوجود اپنے تقویٰ وطہارت اور شائستگی کے چراغ پا ہو جاتے اور پنجابی میں اُس ہندو کو بہت سخت سُست کہہ جاتے۔ مثل اُٹھا کر دُور پھینک دیتے اور غصّے سے کہتے کون ہندو ہے؟ میرے سامنے آئے۔ وہ انکسار مجسم بنا ہوا ہاتھ جوڑ کر کانپتا ہوا سامنے آتا۔ اُس سے کہتے بتا یہ تیرا باپ آخر کہاں سے کھائے گا؟ یہی کرے گا نا کہ تیرے ہی مکان میں سینڈھ لگا کر چند روز کے لئے مالا مال ہو جائے گا۔ تیرا سابقہ قرضہ اتار کر پھر نئے سرے سے قرض لے گا یا پکڑا جائے گا تو قید ہوگا۔ اب اگر تم نے اصل زر لینا ہے تو ابھی دلواتا ہوں۔ اگر سُود در سُود لینا ہے تو جاؤ۔ جب تک میں یہاں ہُوں تمہاری درخواست منظور نہیں ہوگی۔ پھر کوئی تاریخ ڈال دیتے اور یہ قصہ چلتا رہتا۔

ملک صاحب کی تین بڑی خواہشات تھیں۔ اُن کے حصول کے لئے وہ بزرگان سلسلہ سے دعائیں کراتے رہتے تھے۔ آپ مولانا راجیکی صاحب۔ شیخ غلام احمد صاحب نومسلم وغیرہ کو خاص طور دعائیہ خطوط لکھتے رہتے اور ان کی خدمت میں معقول نذرانے بھی بھجوایا کرتے۔

پہلی خواہش یہ تھی کہ اُن کو خان بہادر کا خطاب مل جائے۔ دوسری یہ کہ وہ ڈپٹی کمشنر سے ریٹائر ہوں اور تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو اولادِ نرینہ عطا فرمائے۔ خدا تعالیٰ نے تینوں خواہشات پوری کر دیں۔ لڑکے کا نام احمد خان رکھا گیا۔ اس خوشی کے موقعہ پر ملک صاحب نے حضرت امیر المومنینؓ کا لیکچر کمپنی باغ سرگودھا میں کرایا جو بہت کامیاب رہا۔ یہ عاجز مع اپنی اہلیہ کے بھی شریک ہوا پہلے ہم ملک صاحب کی کوٹھی پر گئے۔ مبارکباد عرض کی۔ مجھ سے دریافت کیا کہ تمہاری شادی کہاں ہوئی ہے؟ میں نے کہا بس آپ سے چند قدم پیچھے رہا ہوں۔ کہنے لگے کیا مطلب؟ میں نے کہا آپ کی اہلیہ اوّل ہڈالی کی ہیں اور میری بیوی خوشاب کی۔ (دونوں قصبوں کے درمیان ۹ میل کا فاصلہ ہے) اس پر بہت ہنسے۔

ملک صاحب سخاوت کے دریا تھے۔ مرکز سے کبھی کوئی مالی تحریک آئی جس میں حصہ نہ لیا ہو۔ ۱۹۲۲ء میں حضرت مسیح موعودؑ کے مزار کے گرد کچی چار دیواری گرا کر آپ نے پختہ بنوائی۔ ربوہ میں کوارٹر تحریک جدید کے سامنے ایک خوبصورت مسجد بنوائی جو مسجد محمود کہلاتی ہے۔ محلّہ دارالیمن کے وسط میں بھی ایک پختہ مسجد بنوائی۔ ملک صاحب خفیہ طور پر روپیہ دیا کرتے تھے۔ آپ سے بہت لوگ فیض یاب ہوئے

اے خوش آں جور کہ از خجلت وضع سائل

لب بہ اظہار نیارند و بایما بخشند

غرض ملک صاحب مرحوم بہت خوبیوں کے مالک تھے قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے حضور روٗ ساء پیش ہوں گے تو خدا تعالیٰ ملک صاحب خاں نوٗن کو اُن کے سامنے پیش کر کے پوچھیں گے کہ کیا تم کو اس شخص کا نمونہ نظر نہ آیا تھا؟ تو اغلباً ان کا جواب آئیہ کریمہ

"لَوْ کُنَّا نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِی اَصْحَابِ السَّعِیر"

(سورۂ مُلک)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک صاحب کو اعلیٰ علیّین میں جگہ دے اور اُن کی اولاد کو بھی ہدایت دے اور اُن کے نیک نمونے کو قائم رکھنے کی توفیق دے۔ آمین

(ماہنامہ مصباح اکتوبر ۱۹۷۴ء)

مباحثہ مُدّ اور رسالہ اعجاز احمدی

موضع مُدّ ضلع امرتسر کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مخلص صحابی میاں محمد یوسف صاحب ہوئے ہیں۔ چونکہ ان کے والد پشاور کی طرف تحصیلدار تھے۔ لہٰذا عرصہ سے ان کا دسرا وطن مردان ہی تھا۔ وہاں پر میاں محمد یوسف صاحب اپیل نویس تھے اور شہر میں اچھے صاحب رسوخ تھے۔ یہ تین بھائی تھے دوسرے کا نام اب یاد نہیں۔ تیسرے کا نام محمد یعقوب تھا۔ تینوں احمدی تھے۔

اس گاؤں کے اکثر لوگ مذہبی بات چیت کرتے رہتے اور حضرت اقدس کی پیشگوئیوں کو سامنے رکھ کر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میاں محمد یوسف صاحب لاہور سے اپنے وطن مُدّ کو جا رہے تھے تو ان کے ایک غیر احمدی دوست احمد علی صاحب بھی ہمراہ تھے۔ باتوں باتوں میں احمد علی صاحب نے تجویز کیا کہ کیوں نہ احمدیوں اور غیر احمدیوں کا تبادلہ خیال ہو جائے اور لوگ خود ہی سمجھ لیں گے کہ حق کس طرف ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ مولوی ثناء اللہ صاحب کو لائیں گے اور بات طے ہوگئی۔

میاں محمد یوسف صاحب قادیان گئے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ سلسلہ کے کسی عالم کو بھجوایا جائے۔ حضور نے میاں صاحب کو سمجھایا کہ ایسے مناظروں سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ مگر میاں صاحب نے اصرار کیا کہ کسی موزوں آدمی کو بھجوائیں۔ لہٰذا حضور نے مولانا سرور شاہ صاحب کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور اپنے ہمراہ مولوی عبداللہ صاحب کشمیری کو بھی لے جائین۔ اس پر میاں صاحب اس وقت تک حضور کی تمام شائع شدہ تصنیفات لے کر اپنے گاؤں چلے گئے۔

یہ مباحثہ موضع مُدّ کے ایک بڑے درخت کے نیچے مورخہ ۲۹۔۳۰ / اکتوبر کو ہوا۔ سامعین کے لئے چٹائیاں بچھا دی گئیں تھیں۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے صرف تین اصحاب اور غیر احمدی اصحاب تقریباً ۳۰۰ موجود تھے۔

دوپہر کے کھانے کے وقفہ میں میاں صاحب کے مکان سے ملحق باغ میں جناب مولوی سرور شاہ صاحب بیٹھے تھے کہ اس گاؤں کا ایک شریف طبع لوہار وہاں آیا اور کہنے لگا کہ میں ان مولویوں کی باتیں سن کر آیا ہوں میرا اندازہ ہے اب نماز کے بعد مناظرہ نہیں بلکہ فساد ہوگا۔ مولانا سرور شاہ صاحب نے فوراً ہاتھ اٹھا کر بارگاہِ رب العزت میں دُعا کی۔ خیر دو دن مباحثہ جاری رہا۔ حضرت مولوی صاحب واپس قادیان پہنچے تو حضور نے شام کی مجلس میں تمام حالات تفصیل سے سنے۔ اور پھر دس بارہ دن تک ہر مجلس میں یہ مباحثہ آتا رہا۔

مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء کو حضور بٹالہ تشریف لے گئے۔ تو کچہری میں میاں محمد یوسف بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر حضور نے فرمایا:۔

''آپ ایک دینی جہاد کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی جزا دے گا۔ میں نے ایڈیٹر الحکم کو حکم دے دیا ہے کہ وہ سارا مباحثہ چھاپ دیں۔ جو زائد کاپیاں آپ کو مطلوب ہوں ان سے لے لیں۔ زائد اخراجات آپ کو برداشت نہیں کرنے پڑیں گے اور ثواب بھی ہو گیا۔ آپ دیکھتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ جلدی اس سلسلہ کو پھیلا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ اس سلسلہ کو دنیا میں پھیلائے۔''

(اخبار الحکم ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء)

مباحثہ مُدّ میں مولوی ثناء اللہ صاحب نے تین باتیں خاص طور پر کہی تھیں۔

۱۔ مرزا صاحب کی تمام پیشگوئیاں جھوٹی نکلیں۔

۲۔ وہ مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔

۳۔ رسالہ اعجاز المسیح کوئی معجزہ نہیں ہے۔ میں اگر چاہوں تو ایسی کتاب لکھ سکتا ہوں۔

حضور علیہ السلام نے مولوی ثناء اللہ صاحب کی زائد اور خارج از موضوع باتوں کو چھوڑ کر انہی تینوں باتوں کا جواب دینے کے لئے رسالہ اعجاز احمدی لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ آپ نے ۸ نومبر ۱۹۰۲ء سے شروع کر کے ۱۲ نومبر تک ختم کر لیا کل ۷۷ صفحات ہیں ۳۸ صفحے اردو کے اور باقی ۳۹ صفحے ایک فصیح و بلیغ عربی نظم ہے۔ جس کے کل ۵۳۳ اشعار ہیں۔ نیچے ہر شعر کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ اس نظم کی مثل لانے کے لئے حضور نے (۱) مولوی ثناء اللہ صاحب (۲) پیر مہر علی شاہ صاحب (۳) مولوی اصغر علی روحی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور (۴) شیعہ مجتہد مولوی علی حائری صاحب (۵) مولوی محمد حسین بٹالوی اور (۶) قاضی ظفر الدین صاحب پروفیسر عربی و فارسی اورینٹل کالج لاہور (جو عربی رسالہ نسیم الصبا کے ایڈیٹر بھی تھے۔) کو خاص طور پر مخاطب کیا اور ساتھ ہی دس ہزار روپے کا انعام بھی رکھا جو صاحب جواب لکھیں گے ان کو دیا جائے گا۔ جواب دینے کے لئے حضور نے ۱۰ دسمبر ۱۹۰۲ء آخری حد مقرر فرمائی۔

کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ سلطان القلم کے مقابلہ میں آتا۔ ہاں قاضی ظفر الدین صاحب نے چند اشعار لکھے ہی تھے کہ طاعون سے ہلاک ہو گئے۔ یہ چیلنج آج بھی خدا کے فضل سے قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔

حضور کو اپنے حق پر ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ حضور نے تحریر فرمایا

''اگر میعاد کے اندر مخالفوں کی طرف سے اس کا جواب مطلوبہ شائع ہو گیا تو میں نیست و نابود ہو گیا اور جماعت کو چاہئے کہ مجھے چھوڑ دے۔''

حضور نے مولوی ثناء اللہ صاحب پر حجت تمام کرنے کے لئے ۱۶ نومبر ۱۹۰۲ء کو مولانا سرور شاہ صاحب کو امرتسر بھجوایا کہ ان کو رسالہ اعجازِ احمدی دے کر آئیں۔ دیگر تمام احباب کو بھی بذریعہ رجسٹری کتب بھجوا دی گئیں۔ اشتہار انعامی دس ہزار روپے میں حضور نے یہ بھی لکھا تھا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب چاہیں تو قادیان آکر میری

ہر ایک پیشگوئی کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ آنے جانے کے اخراجات میں ادا کروں گا۔

چنانچہ مولوی ثناء اللہ صاحب بغیر کسی اطلاع کے ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء کو یکا یک قادیان پہنچ کر آریوں کے مندر میں ٹھہرے جو حضرت اقدس کی مخالفت کا اڈہ تھا۔ ظاہر ہے کہ تحقیق حق کے لئے یہ رویہ قطعاً مناسب نہ تھا۔ اور آتے ہی ایک رقعہ بغیر سلام مسنون کے لکھا۔ دراصل مولوی صاحب کو یاد تھا کہ انجام آتھم میں حضور لکھ چکے ہیں کہ آئندہ وہ مباحثات سے مجتنب رہیں گے جو طریق اب مولوی صاحب اپنانا چاہتے تھے وہ لازماً مناظرہ ہو جانا نیز مولوی صاحب قادیان اس وقت آئے جب حضور مولوی کرم دین کے مقدمہ کے سلسلہ میں جہلم جانے کیلئے تیاری کر رہے تھے یعنی ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء کو وہاں حاضری تھی۔

تاہم حضور نے ۱۱ جنوری کو مولوی صاحب کے رقعہ کا جواب لکھا کہ چونکہ میں قسم کھا کر انجام آتھم میں لکھ چکا ہوں کہ گروہ مخالفین سے آئندہ مباحثات نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اب بھی اگر کوئی طالبِ حق بن کر آئے اور شبہات دور کرانا چاہے تو تیار ہوں۔ یہ چیز مولوی صاحب کے ذہن میں ہرگز نہ تھی۔ لہذا مولوی ثناء اللہ صاحب خود ہی واپس امرتسر چلے گئے۔

ایک دفعہ میاں محمد یوسف صاحب قادیان میں اپنے داماد حاجی محمد اسمٰعیل صاحب سٹیشن ماسٹر دارالبرکات کے ہاں مقیم تھے۔ میں حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کیا کہ مباحثہ مُدّ کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہوا ہے کوئی نئی بات سنائیں۔ فرمانے لگے کہ وہاں کی مسجد میں نے اپنے خرچ سے بنوائی تھی۔ اس مسجد کے صحن میں چیونٹیوں نے ایک بڑا سابل بنا لیا۔ اس پر کچھ لوگ مذاق کرنے لگے کہ دیکھ لو یہ بربادی کا نشان ہوتا ہے۔ میں نے بہت دوائیں چھڑکائیں مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک دن تنگ آ کر میں نے بہت دعا کی۔ اور دعا کے بعد ان چیونٹیوں سے مخاطب ہو کر بلند آواز سے کہا کہ دیکھو یہ مسجد مسیح موعودؑ اور ان کے مریدوں کی ہے۔ تم یہاں سے نکل جاؤ۔

اللہ کی حکمت کہ تین دن میں وہ چیونٹے وہاں سے غائب ہو گئے۔ پھر میں خیران لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ دیکھ لو ایک ہی فقرے سے کام بن گیا ہے۔

مباحثے کے بعد مُدّ میں طاعون سے تقریباً نصف آبادی ہلاک ہو گئی تو وہاں کی مستورات اکثر کہا کرتی تھیں کہ بعض لوگوں نے خواہ مخواہ مرزا صاحب سے مخالفت کر کے یہ مصیبت گھڑی ہے۔

نوٹ !۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ۱۹۲۲ء میں جب قادیان کے غیر احمدیوں نے جلسہ کیا جو ڈاکٹر گوربخش سنگھ کی دوکان کے پیچھے سکھوں کے احاطہ میں ہوا تھا تو مولوی ثناء اللہ دوبارہ قادیان میں آئے اور جلسہ میں اعلان کیا کہ مرزا صاحب کی صداقت کا ثبوت اس طرح مل سکتا ہے کہ ان کی قبر اکھیڑ کر دیکھ لیا جائے اگر تو نعش صحیح سالم ہوئی تو سچے ہوں گے اور اگر نعش خراب ہو گئی ہو تو جھوٹے۔ حضرت قاضی امیر حسین صاحب (جو مولوی ثناء اللہ کے استاد بھی تھے) نے اپنے بعض شاگردوں سے کہا کہ مجھے ان کے پاس لے چلو قاضی صاحب بہت ضعیف تھے۔ شاگرد سہارا دے

کرمولوی صاحب موصوف کی قیام گاہ پر لے گئے۔قاضی صاحب کی آمد کی خبر سن کر وہ دروازے پر آ گئے۔قاضی صاحب نے پنجابی میں کہا ''اوئے ثناء اللہ تینوں شرم نہیں۔کس نوں گالاں کڈ دا ایں۔میں تیرا استاد ایں۔میں وی مرزا نوں مَن لیا اے پر توں مخالفت وچ وھد دا جاندا ایں۔''

اور مولوی ثناء اللہ ہمہ وقت استاد کے سامنے دم بخود خاموش نگاہیں نیچی کئے کھڑے رہے۔اور ایک لفظ نہ بولے۔حتیٰ کہ قاضی صاحب خود ہی واپس چلے گئے۔میں پاس کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔مولوی ثناء اللہ صاحب اسی مکان میں ٹھہرے تھے جہاں لیکھ رام ٹھہرا تھا۔عبدالرحمن شاکر۔

(ماہنامہ انصار اللہ ستمبر ۱۹۷۸ء)

مولوی غلام حسین صاحب ایاز کی یاد میں

خاکسار کے ایک ہم زلف حکیم محمد نذیر صاحب احمدی موضع منگوڑیل ڈاکخانہ صابووال ضلع شاہ پور میں رہتے ہیں ۔جنگ عظیم ثانی میں وہ انگریزی فوج کے محکمہ سپلائی میں بھرتی ہوکر برما، سنگاپور اور جاوا تک گئے تھے ۔۴۶-۱۹۴۵ء میں وہ تقریباً گیارہ ماہ سنگاپور میں مقیم رہے۔ وہاں مکرم محترم مولوی غلام حسین صاحب ایاز مرحوم کے ہمراہ اکثر نشست و برخاست رہی جو کافی بے تکلفی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حکیم صاحب موصوف گزشتہ دنوں ربوہ آئے تو مجھے مندرجہ ذیل حالات لکھوا گئے تھے جو ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ حکیم صاحب بوجہ شدید رعشہ کے خود نہیں لکھ سکتے ۔بیان اُن کا ہے اور عبارت میری۔

خاکسار

عبدالرحمٰن شاکر کارکن نظارت اصلاح وارشاد ربوہ

مکرم حکیم محمد نذیر صاحب نے ۱۹۴۵ء میں راقم الحروف (عبدالرحمٰن شاکر) کو سنگاپور سے لکھا کہ اگر سنگاپور میں کوئی احمدی مبلغ موجود ہوں تو ان کا ایڈریس بھجواؤ۔ میں نے ان کو مولوی غلام حسین صاحب کا پتہ دے دیا۔ حکیم صاحب اپنی فوج کے ہمراہ کرنجی کیمپ میں جو سنگاپور سے گیارہ میل دور تھا مقیم تھے۔ میرا خط لیکر نمبر ۱۱۱۱ ون روڈ پہنچے ۔مولوی صاحب کو میرا تعارفی خط دیا۔ وہ ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے اور بہت گرم جوشی سے باتیں ہوئیں۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد رخصت ہوکر واپس چلے آئے۔

حکیم صاحب نے واپس کیمپ میں آکر دیگر احمدی دوستوں کو بھی مولوی صاحب سے ملاقات کا ذکر سنایا۔ تمام دوست خوش ہوئے ۔اگلے جمعہ کو بہت سے دوست جمعہ پڑھنے کے لئے مشن ہاؤس پہنچ گئے ۔مولوی غلام حسین صاحب اُس دن بے حد مسرور تھے۔ جاپانی قبضہ سنگاپور کے بعد پہلی مرتبہ احمدیوں سے ملاقات ہوئی۔ اور اُن میں سے بعض خاص قادیان کے باشندے تھے۔ پھر کیا تھا ہر جمعہ اور اتوار کو مشن ہاؤس میں اجتماع ہونے لگا۔ پچاس ساٹھ کے قریب احمدی جن میں افسر اور ماتحت بھی ہوتے تھے آیا کرتے۔ باجماعت نماز ادا ہوتی ۔مولوی صاحب کی ایمان افزاء تقریریں، نہایت درجہ سبق آموز گزشتہ واقعات بے حد لطف دیتے تھے۔

سنگاپور پر جاپانی قبضہ سے پہلے مولوی صاحب موصوف خود کپڑے کی پھیری لگایا کرتے تھے جس سے وہ کافی کچھ کما لیا کرتے تھے اور جدھر نکل جاتے ساتھ ساتھ تبلیغ بھی کرتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک موٹر بوٹ خریدی ہوئی تھی جو مختلف مقامات کے درمیان لوگوں کا سامان تجارت لے جاتی تھی۔ اس پر ایک آدمی ملازم رکھا ہوا تھا۔ اس کی بھی آمدنی ہوتی تھی ۔تیسرے ایک موٹر لاری بھی خرید لی ہوئی تھی وہ بھی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ تھا۔ چوتھے مولوی صاحب گاہے گاہے سیالکوٹ سے کھیلوں کا سامان منگوا کر فروخت کرلیا کرتے تھے مگر جاپانی قبضہ کے بعد یہ تمام ذرائع آمدنی مسدود ہوگئے ۔اُوپر سے بوجہ جنگ ڈاک کا سلسلہ قطعی طور پر بند تھا۔ مولوی صاحب کو مرکز سے کسی

قسم کی کوئی امداد نہیں پہنچ سکتی تھی۔غرضیکہ سخت ابتلاء کے دن تھے اور نہایت تنگی سے گزراوقات کرتے تھے۔

پھر مولوی صاحب اکیلے ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔انہوں نے دو چینی خاندانوں کو جن کے کمانے والے افراد مر گئے تھے محض خوف خدا کر کے اپنے مکان میں پناہ دے رکھی تھی۔اور اُن کے ہر قسم کے اخراجات کے کفیل تھے۔اُن دنوں بوجہ فوجی حکومت ہونے کے تمام انتظامات درہم برہم تھے۔ضروریات زندگی تو کجا معمولی سادہ کھانا بھی مشکل سے میسر آتا تھا۔مگر مولوی صاحب ان دونوں خاندانوں کو تسلی دیتے رہتے اور کہا کرتے تھے کہ تم منہ میں کچھ ڈالو گے تو تب خود کھاؤں گا۔کمال دل سوزی سے ان کی ضروریات پوری کرتے۔انہی ایام میں بعض اوقات مولوی صاحب پر ایسے آئے کہ سرس کی قسم کے ایک درخت کے پتے اُبال کر کھایا کرتے تھے۔

غرضیکہ خواجہ دل محمدؒ صاحب ایم۔اے کا یہ شعر گویا انہی کے لئے موزوں ہوا تھا ؎

اپنی فکر نہ کچھ کریں ملک وطن کے داس !

سُوئی ننگی خود رہے اور سب کا سئے لباس

آخر کار چار سال متواتر غیر متوازن غذا کھانے اور سختیاں جھیل جھیل کر مولوی صاحب کی صحت بالکل تباہ ہو گئی اور مرض بیری بیری Beri Beri ہو گیا اور جسم محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا۔

انہی ابتدائی ایام میں مولوی صاحب نے حکیم محمد نذیر صاحب سے کہیں ذکر کر دیا کہ ان کے ذمہ ایک معقول رقم قرض ہو چکی ہے جس کے اُتارنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔تو حکیم صاحب نے جھٹ اپنی گرہ سے ۳۰۰ ڈالر سنگاپوری (ایک ڈالر سنگاپوری = ڈیڑھ روپیہ) مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا اور کیمپ میں آکر دوسرے احمدی دوستوں سے بھی ذکر کر دیا اور اُن سب کو غیرت دلائی کہ ہمارا مبلّغ سخت پریشانی میں ہے کیوں نہ ہم سب مل کر اس کی امداد کریں؟ چنانچہ تمام دوستوں نے اپنی ہمت سے بڑھ چڑھ کر ایک معقول رقم جمع کی اور چپکے سے مولوی صاحب کے حوالے کر دی۔جس سے نہ صرف مشن کا تمام قرضہ اُتر گیا بلکہ مولوی صاحب کی صحت پر بھی بہت اچھا اثر پڑا۔کیپٹن ڈاکٹر حافظ بدرالدین صاحب (حال بورنیو) اور کیپٹن ڈاکٹر عمرالدین صاحب (حال راولپنڈی) نے علاج معالجہ بھی شروع کیا جس سے صحت بہتر ہو گئی اور مولوی صاحب چاق و چوبند ہو گئے۔پھر تو سب احمدی دوستوں کا معمول ہو گیا کہ جو بھی مولوی صاحب سے ملاقات کے لئے جاتا کچھ نہ کچھ تحفہ ضرور لیکر جاتا۔کوئی پھل لئے جا رہا ہے۔کوئی کپڑے۔کوئی ڈبہ میں بند فروٹ حکیم محمد نذیر صاحب نے تو معمول ہی بنا لیا تھا کہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ اوقات میں مشن ہاؤس میں حاضری دیتے۔

مولوی غلام حسین صاحب نے سخت تکالیف برداشت کیں۔فاقے بسر کئے۔مگر بنک میں جو رقم (اڑھائی ہزار ڈالر) جمع کرائی ہوئی تھی اُسے ہاتھ نہ لگایا۔کیونکہ وہ جماعتی چندوں کی رقم تھی۔اور بوجہ سلسلہ مواصلات بند ہونے کے مرکز میں بھجوا نہ سکے تھے۔بعد میں راستے کھلنے پر انہوں نے وہ رقم قادیان بھجوا دی۔سبحان اللہ کیا قربانی

ہے!

حکیم صاحب نے اپنی پہلی ملاقات کے بعد مولوی صاحب کو اپنے کیمپ میں دعوتِ طعام دی۔ وہاں گندم کی روٹی دیکھ کو مولوی صاحب نے فرمایا کہ آج چار سال کے بعد گندم کی روٹی میسّر آئی ہے ورنہ جاپانی قبضہ میں تو چاول بھی بمشکل نظر آیا کرتے تھے۔ گندم کا ذکر ہی کیا۔

مولوی صاحب نے اپنے دفتر میں ایک ملائی احمدی سکول ماسٹر کو کچھ اُجرت پر رکھا ہوا تھا جو اپنے فارغ اوقات میں انگریزی اور عربی خطوط ٹائپ کر دیا کرتا تھا اور سائیکلو سٹائل مشین پر تبلیغی ہینڈ بل بھی طبع کر دیا کرتا تھا۔ جو مولوی صاحب تقسیم کیا کرتے تھے۔

انہی دنوں ایک ڈچ ڈاکٹر بھی وہاں آیا تھا یہ شخص غیر مبائع تھا مگر مولوی صاحب سے دو ہفتے تک گفتگو کر کے مبائع ہو گیا تھا۔ بڑا نیک بخت، تہجد گزار اور شریف انسان تھا۔ نام اب یاد نہیں رہا۔

مولوی صاحب کی زندگی ہر لحاظ سے بڑی سادہ تھی۔ لباس بھی سادہ تھا۔ تکلّف نام کو بھی نہ تھا۔ رات کو مسجد کے فرش پر ہی سو رہتے تھے۔ اپنے وعظ و نصیحت میں زیادہ طور پر اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے پر زور دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اپنے اعمال سے اسلام کی سچائی کا ثبوت دو۔ اور جو کہتے ہو اس کے مطابق عمل بھی کر کے دکھاؤ۔

آپ نے ملائی زبان میں سلسلہ کی بعض کتب کے تراجم بھی کیے تھے۔ ملائی زبان پر خوب عبور حاصل تھا۔ ڈاکٹر بدرالدین صاحب نے جب قرآن مجید حفظ کیا تو آخری پارے مولوی صاحب اُن سے روزانہ سُنا کرتے تھے کہ اچھی طرح حفظ ہو گئے ہیں کہ نہیں۔!

آخر جولائی ۱۹۴۶ء میں حکیم محمد نذیر صاحب رخصت پر ہندوستان آئے۔ مولوی صاحب سے ملاقات کے لئے گئے تو مولوی صاحب کہنے لگے۔ ''محمد نذیر! دل میرا بھی بہت چاہتا ہے کہ وطن جاؤں مگر جب تک حضرت صاحب کی اجازت نہ آجائے کیونکر جا سکتا ہوں۔'' پھر فرمانے لگے کہ ''تم جو جا رہے ہو حضرت صاحب سے ملاقات کرنا اور میرے تمام حالات عرض کر دینا۔ تم اپنی طرف سے اشارۃً و کنایۃً کچھ کہہ سکو تو کہہ دینا مگر میری طرف سے ہرگز نہ کہنا کہ واپس آنے کو دل چاہتا ہے۔'' اس کے بعد حکیم صاحب کو حضرت کے حضور عرض کرنے کے لئے مختصر نوٹ لکھوائے کہ ان کو سامنے رکھ کر تفصیل سے عرض کر دینا۔

حکیم صاحب ۲۔ اگست ۱۹۴۶ء کو قادیان پہنچے حضرت صاحب اُن دنوں اپنی نو تعمیر شدہ کوٹھی واقع ڈلہوزی میں تشریف فرما تھے۔ حکیم صاحب نے راقم الحروف سے کہا کہ چلو ڈلہوزی چلیں۔ حضرت صاحب کی زیارت کر آئیں۔ میں نے حکیم صاحب کے چہرے پر اشتیاق کی جھلک کچھ زیادہ ہی دیکھ کر پوچھا کہ کیا کوئی خاص بات ہے۔ مگر مجھے اس وقت کچھ نہ بتایا۔ یہی کہ بس تم میرے ساتھ ڈلہوزی چلے چلو۔ حضرت صاحب سے ملاقات کر آئیں گے اور سیر تو

ہو ہی جائے گی۔

اب جو مولوی صاحب درجۂ شہادت پا گئے ہیں اور من قضیٰ نحبہٗ کے حقیقی مصداق ہو گئے ہیں تو ایک گونہ خوشی بھی ہوتی ہے کہ ہمارا ایک پُرانا دوست کس قدر آگے بڑھ گیا ہے مگر اُن کی غربت اور بے وطنی کی موت سے دل کو صدمہ بھی ہوتا ہے۔ میں تو ان کو یاد کر کے حسبِ ذیل شعر پڑھا کرتا ہوں

آدمی۔ اور قیودِ تن و سر سے گزرے!
کیا فرشتے تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

(ماہنامہ مصباح مئی ۱۹۶۰ء)

یادِ یارِ مہربان آید ہمے

سیّد محمد محسن شاہ صاحب کی یاد میں

تاریخ احمدیت میں قادیان کے علاوہ تین اور شہروں کو ایک ایک شرف حاصل ہے۔ اول سرینگر جہاں حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کا مزار ہے دوئم لدھیانہ جہاں سے حضرت مہدی نے اپنے سلسلہ بیعت کا آغاز فرمایا۔ سوم لاہور جہاں پر حضرت اقدس کا وصال ہوا۔

لدھیانہ شہر میں حضرت صوفی احمد جان صاحب کا وجود ہی کافی تھا تاہم ان کے صاحبزادے پیر افتخار احمد اور پیر منظور محمد (اور ان دونوں کی ہمشیرہ محترمہ صغریٰ بیگم صاحبہ جو حضرت مولانا نورالدین صاحب کی اہلیہ تھیں) کو مزید شرف حاصل ہوا۔ حضرت مسیح موعود کے ساتھیوں میں حضرت شہزادہ عبدالمجید صاحب شہید امیران امیر عنایت علی شاہ صاحب۔ خواجہ علی احمد صاحب۔ ماسٹر قادر بخش صاحب اور ان کے لائق بیٹے مولوی عبدالرحیم صاحب درد۔ مولوی عبدالقادر صاحب (والد حکیم محمد عمر صاحب) جو قبل از دعویٰ مسیحیت حضرت اقدس کے امام الصلوٰۃ ہوتے تھے۔

لدھیانہ شہر میں جو چشمہ ہدایت جاری ہوا اس کے چھینٹے اطراف میں بھی پڑے اور بہت لوگوں کی ہدایت کا موجب ہوئے۔ جن میں صرف چند ایک کے نام درج کرتا ہوں۔ شیخ غلام احمد صاحب واعظ، مولوی عبدالقادر صاحب مدرس منصوراں، ماچھی وارہ میں سید عبدالهادی شاہ صاحب ریلوے انجینئر، حکیم محمد عبداللہ صاحب اور ان کے صاحبزادے حکیم عبدالرحمٰن صاحب اور ڈاکٹر عبدالستار صاحب وٹرنری اسسٹنٹ، ماسٹر ماموں خاں صاحب ڈرل ماسٹر نیز تحصیل جگراؤں میں خاکسار کے والد چوہدری نعمت اللہ خان صاحب گوہر بی۔اے اور ان کے دو چھوٹے بھائی چوہدری علی محمد صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی اور مولوی عطاء محمد صاحب۔ علاوہ ازیں حافظ محمد ابرہیم صاحب، ماسٹر محمد سعد اللہ خان صاحب انگلش ٹیچر کھنہ۔

تابعین کی فہرست میں ماسٹر محمد شفیع اسلم صاحب جنہوں نے یو۔پی کے ملکانوں میں نمایاں خدمات سرانجام دیں اور ڈاکٹر عمر دین صاحب سدھو، جنہوں نے افریقہ میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں، اور سید محمد محسن شاہ صاحب مرحوم انسپکٹر وقفِ جدید ربوہ۔

سید محسن شاہ صاحب ۱۹۱۴ء میں موضع للوڑی کلاں تحصیل سمرانہ ضلع لدھیانہ میں ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد سیر کے لئے دلی گئے۔ وہاں سے خیال آیا کہ قادیان دیکھ کر واپس گھر جاؤں۔ مہمان خانہ میں حضرت میر محمد اسحاق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ان کی طبیعت کا اندازہ کر کے

مہمان خانہ میں ایک جلسہ ترتیب دیا۔ جس میں تمام تقاریر شیعوں سے متعلق تھیں۔ خود میر صاحب کی صدارتی تقریر نے محسن شاہ صاحب کے تمام شکوک رفع کر دیئے اور اپنے پہلے عقائد سے بیزار ہو گئے۔ نماز کے لئے مسجد مبارک میں گئے اور دعا کی کہ خدایا اگر یہ امام تیری طرف سے ہے تو مجھے یہ نشان دکھا کہ جب تک اس کو مان نہ لوں یہاں سے نہ جاؤں۔ اگلے روز واپسی کا پروگرام بھی تھا۔ بستر بندھا ہوا تھا جو کسی نے چرا لیا اور باوجود تلاش کے نہ ملا۔

ادھر جلسہ سالانہ میں چند دن رہ گئے تھے۔ شاہ صاحب صرف خطبہ سننے کے لئے مسجد کے اندر منبر کے قریب جا کر بیٹھ گئے وہاں پر ایک نہایت بزرگ صورت ہستی بیٹھی تھی انہوں نے محسن شاہ صاحب کو کہا کہ آپ قطار کے اندر بیٹھیں۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ میں شیعہ ہوں صرف خطبہ سننے کے لئے آیا ہوں نماز میں شرکت نہیں کرنی۔ اتنے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی تشریف لے آئے۔ خطبہ کے بعد شاہ صاحب باہر جانے لگے تو اسی بزرگ نے کہا کہ بیٹے دروازے پر میرا انتظار کرنا۔ میں نے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔ نماز کے بعد جب شاہ صاحب ان سے ملے تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ جواب دیا کہ ضلع لدھیانہ سے۔ انہوں نے فرمایا بھئی آخر کون سے گاؤں یا قصبے سے آئے ہو؟ یہ تھے نوجوان تیز ہو کر کہنے لگے آپ تو تفتیش کرنے آئے ہیں۔ انہوں نے نرمی سے کہا کہ بھائی آخر بتا دو کس گاؤں کے ہو؟ انہوں نے کہا للوڑی کلاں تحصیل سمرالہ کا ہوں۔

اس بزرگ کے چہرے پر رونق آگئی اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور فرمایا کہ میں بھی وہاں کا رہنے والا ہوں۔ اس پر شاہ صاحب چونک پڑے۔ بزرگ نے کہا آپ کے گھر کے دیوار بدیوار کس کا گھر ہے؟ شاہ صاحب نے کہا کہ سیٹھ گلاب مل صراف کا۔ بزرگ نے کہا ان کے کسی لڑکے کا نام یاد ہے انہوں نے کہا دولت رام اور پوہلو رام اور ایک اور تھا جو عرصہ ہوا گھر سے نکل کر چلا گیا ہوا ہے۔ اس بزرگ نے ان کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا وہ جو گھر سے چلا گیا تھا وہ ہیرا لال تھا اور وہ میں ہوں اب میرا نام غلام احمد ہے اس پر دونوں نے فرطِ مسرت سے بیتاب ہو کر معانقہ کیا۔

شیخ غلام[1] احمد صاحب ان کو گھر لے گئے۔ بہت خاطر مدارات کی اور فرمایا کہ روزانہ مجھ سے ملا کرو۔ اور یہ بھی فرمایا کہ بیٹے تمہیں خبر نہیں میری دعائیں تم کو یہاں لائی ہیں۔ میں دعا کیا کرتا تھا کہ خدایا جو نعمت تو نے مجھے عطا کی ہے۔ میرے گھر کے کسی اور شخص کو بھی عطاء کر۔

شیخ صاحب چونکہ محلہ دار الفضل قادیان میں رہتے تھے۔ محسن شاہ صاحب روزانہ وہاں جاتے اور شیخ صاحب ان کی تربیت کرتے، مسائل سمجھاتے اور شیعیت کے تمام نقوش دھو ڈالے اور احمدیت کے رنگ میں رنگین

[1] حضرت شیخ غلام احمد صاحب عرف واعظ وہ شخص ہیں جن کے لئے حضرت مسیح موعود نے ٹریکٹ ''ایک غلطی کا ازالہ'' لکھا۔ تیرہ سال کی عمر میں گھر سے نکلے اور ایک ہی خواہش تھی کہ خدایا مجھ سے کلام کر۔ عرصہ تک بھٹکتے رہے۔ آخر خدا نے ان کو اسلام کا راستہ دکھایا اور یہ خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے تھے

کر دیا۔ علاوہ ازیں شیخ صاحب اکثر حضرت حافظ محمد ابراہیم صاحب امام الصلوٰۃ دارالفضل اور حضرت میر مہدی حسین صاحب کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے۔ محسن شاہ صاحب کو بھی ہمراہ لے جاتے وہاں سوائے قال اللہ وقال الرسول کے کچھ اور نہ ہوتا تھا۔ اس طرح خدا نے سید محسن شاہ کے قلب کو اور صیقل کر دیا۔

ان تینوں بزرگوں کا یہ دستور تھا کہ جب موسم اچھا ہوتا تو قادیان سے جانب شمال موضع ٹھیکری والا کے قریب جو چھتری نما بڑ کا ایک بڑا درخت تھا وہاں جا کر تنہائی میں اجتماعی دعائیں کرتے۔ سید محسن شاہ صاحب کی ڈیوٹی یہ ہوتی کہ ان تینوں کے گھروں سے کھانا لے کر وہاں پہنچاتے اور نماز ظہر اکٹھی ادا کر کے ان کو واپس بھجوا دیتے۔

محسن شاہ صاحب بیان کرتے تھے کہ وہ حافظ محمد ابراہیم صاحب کو لے کر نماز تہجد مسجد مبارک قادیان میں ادا کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ وہاں تہجد کے بعد نماز فجر ادا کر کے بہشتی مقبرہ میں دعا کر کے واپس آیا کرتے تھے۔ گو یہ بہت مشکل ڈیوٹی تھی۔ تاہم محسن شاہ صاحب کو خدا نے توفیق دی کہ اس کو احسن طریقے سے نبھائیں۔

ان دنوں شاہ صاحب بورڈنگ تحریک جدید میں چھوٹے بچوں کے ٹیوٹر تھے یکا یک ایک دن خلیفہ ثانی کا حکم آیا کہ اس کو فارغ کر دیا جائے۔ شاہ صاحب بہت گھبرائے کہ شاید حضور ناراض ہیں فراغت کے معاً بعد حاضر خدمت ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ آپ میری زمینوں پر سندھ چلے جائیں۔ یہ تو تابع احکام تھے فوراً روانہ ہو گئے۔ حضور ان کی کارکردگی سے بہت خوش ہوئے۔ ایسا قابلِ اعتماد شخص کہاں ملتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد شاہ صاحب نواب محمد عبداللہ خان صاحب کی طرف منتقل ہو گئے نصرت آباد اور فضل بھمبرو میں خوب محنت سے کام کیا اور نواب صاحب نے بھی قدردانی فرمائی۔ ہر سال پچاس روپے ترقی ہو جاتی تھی۔ متعدد بار انعام ملا۔

وہاں پر ایک واقعہ پیش آیا۔ شاہ صاحب ایک دوست کو جو اب فوت ہو گئے ہیں صبح نماز تہجد کے لئے بیدار کرنے جاتے۔ وہ ٹس سے مس ہی نہ ہوتے۔ ایک دن جو یہ گئے تو انہوں نے اٹھ کر برا بھلا تو کہا بلکہ مارا بھی۔ یہ خاموش ہو رہے اور اس کے لئے دعا کرتے رہے۔ پانچ روز کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ان سے بھی پہلے مسجد میں جا کر تہجد ادا کر رہے ہیں۔ اس نے شاہ صاحب سے ندامت کے ساتھ معذرت کی اور معافی چاہی۔ شاہ صاحب نے نہایت فراخدلی سے اسے معاف کر دیا۔

وہاں سے ٹوبہ ٹیک سنگھ آ کر عرائض کا امتحان دیا اور پاس بھی ہو گئے مگر ادھر شاہ صاحب کو وقف جدید کی طرف سے بلا لیا گیا اور پھر آخری دم تک اپنے فرائض کو نہایت سے خوبی سرانجام دیا۔

شاہ صاحب مرحوم نے مجھے روایتیں سنائیں جو ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوئیں درج کرتا ہوں۔

سید محسن شاہ صاحب نے شیخ غلام احمد صاحب کا ایک واقعہ جو خود شیخ صاحب نے ان کو سنایا تھا مجھے سنایا۔ شیخ غلام احمد صاحب کی ایک ہی تڑپ تھی کہ خدا ان سے ہم کلام ہو ایک دن حضرت مسیح موعود مسجد مبارک میں مجمع احباب سے کسی موضوع پر تقریر فرما رہے تھے اور شیخ غلام احمد صاحب اس مجمع سے ذرا ہٹ کر ایک طرف کو بیٹھے تھے یکا یک

حضرت اقدس نے اپنی تقریر ختم کردی شیخ غلام احمد صاحب کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا شیخ صاحب خدا تعالیٰ آپ سے بھی کلام کرے گا اور حضور اندرونِ خانہ تشریف لے گئے۔

اس پر حافظ مختار احمد صاحب اور دیگر احباب نے شیخ صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ کہا آپ نے حضور سے کوئی درخواست کی تھی۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں جس وقت حضور تقریر کر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ خدا تعالیٰ مرزا غلام احمد کا ہے جس سے خدا ہم کلام ہوتا ہے۔ اور ایک خدا کا بندہ غلام احمد میں ہوں جس سے خدا نے کبھی کلام نہیں کیا۔ حضور علیہ السلام کی مومنانہ فراست نے۔ میرے دل کی بات کو بھانپ لیا تبھی حضور نے اوپر والا فقرہ فرمایا۔ بعد میں شیخ غلام احمد صاحب واعظ خدا سے خوب ہم کلام ہوتے رہے۔ بہت مستجاب الدعا تھے۔

دوسرا واقعہ سید محسن شاہ نے یہ سنایا کہ واڑہ میں سید عبدالہادی شاہ صاحب ریلوے ملازم تھے۔ وہ پہلے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے معتقد تھے۔ جب حضرت اقدس نے دعویٰ فرمایا تو حضور کی بیعت میں آ گئے۔ چنانچہ حضرت صاحب نے ازالہ اوہام طبع اول میں خاص مریدوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سید عبدالہادی صاحب کا ذکر ۱۰۰ صفحہ پر ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

ان کا واقعہ ہے کہ تقریباً انہی دنوں مولوی محمد حسین صاحب نے سید عبدالہادی صاحب کو لکھا کہ وہ لدھیانہ سے دریائے ستلج بذریعہ کشتی پار کر کے ماچھی واڑہ آ رہے ہیں۔ اب سید عبدالہادی

(روزنامہ الفضل یکم فروری ۱۹۸۳ء)

حکیم غلام حسین صاحب لائبریرین

خلافت ثانیہ کے قیام کے بعد دسمبر ۱۹۱۶ء میں قادیان میں پہلی باقاعدہ لائبریری قائم ہوئی جس کا نام صادق لائبریری تھا۔ حضرت مفتی محمد صادق صاحب نے اپنا عظیم کتب خانہ جماعت کیلئے وقف کر دیا تھا۔ شہزادہ عبدالمجید صاحبؓ لدھیانوی پہلے لائبریرین مقرر ہوئے۔ جولائی ۱۹۲۴ء میں جب شہزادہ صاحب زندگی وقف کر کے ایران تشریف لے گئے تو اُن کی جگہ بابو عبدالحمید صاحب مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے ۱۳ جنوری ۱۹۳۹ء کو حکیم غلام حسین صاحب کو چارج دیا۔

حکیم غلام حسین صاحب ولد حکیم نور احمد صاحب موضع ہیلاں تحصیل پھالیہ ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ میٹرک تک تعلیم تھی۔ قادیان آنے سے قبل وہ ریاست بھوپال کے شاہی کتب خانہ میں عرصہ تک کام کر چکے تھے جہاں وہ اپنے ایک عزیز بابو رحمت اللہ صاحب اوورسیئر کے توسط سے پہنچے تھے۔

حضرت خلیفہ ثانیؓ کے حکم سے حضرت مولانا عبید اللہ بسملؔ صاحب کو بھوپال میں تبلیغ سلسلہ کیلئے بھیجا گیا۔ وہ کتابوں کے کیڑے تھے۔ ہر وقت مطالعہ کتب میں مصروف رہتے۔ شاہی کتب خانہ میں حکیم غلام حسین صاحب سے جو ملاقات ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور اس طرح اُن کو اپنے علمی ذوق کی تسکین کا بڑا سہارا مل گیا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا بسملؔ کو واپس بلوالیا گیا اور اتفاق سے ۱۹۲۹ء میں حکیم غلام حسین صاحب بھی لائبریرین ہو کر قادیان آ گئے اور لطف کی بات یہ ہوئی کہ دونوں بالکل ہمسایہ تھے۔

مولانا عبید اللہ صاحب کی بیٹھک اُن دنوں علم و فضل کا مرکز تھا۔ یوں بھی لوگ طبی مشورہ کیلئے آتے تھے۔ وہاں میری اور حکیم غلام حسین صاحب کی پہلی ملاقات ہوئی۔ آہستہ آہستہ واقفیت بڑھتی گئی اور پھر بے تکلفی کی حدود بھی پھلانگ گئی۔ اُسی زمانہ میں بعض دفعہ حکیم غلام حسین صاحب مجھے کتابیں دیتے وقت کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس کرتے اور مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

کتب خانہ کی دیکھ بھال بڑے انہماک سے کرتے۔ اُن کو ہر کتاب کا ذاتی طور پر علم ہوتا کہ کس فن کی ہے۔ کس الماری میں کہاں پڑی ہے۔ ایک دفعہ ایک مناظرے کیلئے حکیم صاحب اندھیرے میں کتب نکال کر لائے۔ واپس آمدہ کتب کو خود اپنی جگہ پر رکھتے اور مددگار کارکن پر اعتبار نہ کرتے۔ حتی الوسع اپنا تمام کام کر کے گھر کو لوٹا کرتے۔ دس دن کے بعد بھی جو کتب باہر ہوتیں اُن کی علیحدہ فہرست بنا کر اُن لوگوں سے واپسی کا مطالبہ کرتے۔ اس معاملہ کسی کا لحاظ نہ کرتے۔

حکیم غلام حسین صاحب بہت نیک طبع۔ نمازی۔ تہجد گذار۔ دُعا گو اور صاحب کشف والہام تھے۔ ہر شخص سے خوش خلقی سے پیش آتے اور ہمدردی دکھاتے۔ طبیعت میں ظرافت بھی کافی تھی۔

چونکہ طبّ خاندانی پیشہ تھا اس لئے نبض دیکھتے ہی مرض کو سمجھ لیا کرتے۔ میں نے بارہا تجربہ کیا۔ پس نبض دیکھتے ہی کہہ دیتے کہ تم نے فلاں چیز کھائی ہے اُس کی وجہ سے تکلیف ہوئی ہے اور بالکل سستا نسخہ بتاتے جو ایک دو پیسہ میں آجائے۔ آپ حسابات کے بھی خاصے ماہر تھے۔ چنانچہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب اور مولانا شیر علی صاحب کے ذاتی حسابات بھی حکیم صاحب کے ہی سپرد تھے۔

خدا تعالیٰ حکیم صاحب کو کشوف والہام سے نوازتا رہتا۔ جن کا ذکر وہ اپنے حلقہ احباب میں ضرور کرتے۔

دوسری جنگ عظیم یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی تو کچھ عرصہ بعد حکیم صاحب نے دفتر میں ذکر کیا کہ اُن کو الہاماً بتایا گیا ہے کہ ''ہٹلر پہنچ گیا تبریز''۔ تبریز ایران کا شمالی شہر ہے۔ روس کی سرحد کے قریب ہم لوگ حیران ہوئے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جرمنی کی فوج وہاں گئی ہو۔ مگر بعد میں جب چرچل کی کتاب ہسٹری آف دی سیکنڈ گریٹ وار چھ جلدوں میں پڑھی تو اس الہام کی صداقت پر کوئی شبہ نہ رہا۔ واقعی جرمن فوجیں تبریز تک پہنچ گئی تھیں۔ جبھی تو چرچل۔ سٹالن اور روزویلٹ نے رضا شاہ اول کو مجبور کیا تھا کہ ان کو یہاں سے نکالو انہوں نے ذرالیت ولعل کی تو فوراً قید کر کے پہلے جزیرہ ماریشس میں پھر جوہینسبرگ جنوبی افریقہ میں رکھا جہاں وہ فوت ہو گئے۔

ایک دن نمازِ فجر کے بعد گھر آتے ہوئے مجھے کہنے لگے کہ تمہارے ہاں دوسرا لڑکا پیدا ہوا ہے اور تم نے کچھ کھلایا نہیں۔ میں نے حیرانی سے کہا کہ میرے ہاں کوئی دوسرا لڑکا نہیں ہے تو کہنے لگے۔ ہیرا پھیری نہ کرو مجھے تو خدا تعالیٰ نے بتایا اور تم چالاکی کرتے ہو۔ میں نے کہا ہمارے گھر چل کر دیکھ لیں۔ جب خوب تسلی کر لی تو کہنے لگے کہ انشاء اللہ دوسرا لڑکا آنے والا ہے جب وہ لڑکا پیدا ہوا تو میں نے اطلاع دی۔ گھر آکر اُسے دیکھا۔ گود میں اٹھایا اور چار آنے دیئے۔ (آجکل وہ کراچی میں پوسٹل لائف انشورنس کے ہیڈ آفس میں کام کرتا ہے)

تقسیم ملک کے بعد حکیم صاحب نے چنیوٹ میں بتایا کہ الہام ہوا ہے۔ "اٰوَیۡنٰہُمَاۤ اِلٰی رَبۡوَۃٍ" ابھی شہر ربوہ کا تصور بھی موجود نہ تھا۔ اب تو ربوہ ایک انٹرنیشنل شہر ہے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں کہاں تک لکھوں۔

حکیم صاحب کی عادت تھی کہ اپنے خوابوں اور الہاموں کی خوب تشہیر کرتے۔ ایک دن میں نے علیحدگی میں لے جا کر کہا کہ اس طرح نہ کیا کریں کہیں آپ کا نفس آپکو دھوکا نہ دے اور ٹھوکر لگ جائے تو فوراً سمجھ گئے اور بہت محتاط ہو گئے۔

قادیان سے تقسیم کے بعد کافی حد تک ہماری لائبریری یہاں آگئی تھی مگر چونکہ ربوہ میں مطلق انتظام نہ تھا اس لئے کتابیں چنیوٹ میں ہی پڑی تھیں۔ کہ یکا یک ۱۳ جون ۱۹۵۰ء کو حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا۔

حضرت مفتی محمد صادق صاحب کی توجہ سے آخر یہاں لائبریری کیلئے ایک کمرہ بنایا گیا جس میں کتابیں منتقل کر دی گئیں۔ مولانا جلال الدین شمس صاحب نے اخبار میں لائبریرین کے لئے اشتہار دیا انٹرویو کے بعد خاکسار راقم الحروف کا بطور لائبریرین تقرر ہوا۔ آگے رپورٹ صدر انجمن احمدیہ پاکستان بابت ۵۱،۱۹۵۰ء ملاحظہ

ہو:۔

''افسوس کہ سال زیر رپورٹ میں مرکزی لائبریری کے دیرینہ اور مستعد کارکن حکیم غلام حسین صاحب ۱۳ جون ۱۹۵۰ء کو ایک مختصر سی علالت کے بعد وفات پا گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحوم ایک محنتی۔ دیانتدار اور مخلص کارکن تھے۔ حکیم صاحب مرحوم کی جگہ لائبریری کا کام چوہدری عبدالرحمٰن صاحب شاکر کے سپرد کیا گیا۔'' (ص ۷۸)

''حکیم غلام حسین صاحب مرحوم لائبریری کی کتب چنیوٹ سے ربوہ لے آئے تھے۔ ابھی اُن کو ترتیب نہ دے سکے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے حقیقی مولا سے جا ملے۔ اس لئے الماریوں میں کتب بے ترتیبی سے مختلف مضمونوں کی ملی جلی پڑی تھیں یکم ستمبر ۱۹۵۰ء کو شاکر صاحب نے چارج لیا اور نہایت محنت اور تندہی سے کتابوں کو مضمون وار کر کے ترتیب دیکر الماریوں میں رکھا'' (ص ۸۰)

اب رپورٹ صدر انجمن احمدیہ بابت سال ۵۳-۱۹۵۲ء ملاحظہ ہو:۔

''سیدنا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے مشاورت ۱۹۵۲ء پر سلسلہ کی لائبریری کو زیادہ جامع اور وسیع کرنے پر سیر کن تبصرہ فرمایا اور فرمایا کہ آئندہ کیلئے صدر انجمن احمدیہ کی مرکزی لائبریری اور حضور کی اپنی لائبریری کو یکجا کیا جائے اور اُس کا نام خلافت لائبریری رکھا گیا ہے۔ چنانچہ مئی ۱۹۵۲ء سے اس پر عمل درآمد کیا گیا ہے۔

خلافت لائبریری کی موجودہ تشکیل یہ ہے کہ اسکا ایک حصہ (سابقہ مرکزی لائبریری) کتب خانہ حضرت خلیفہ المسیح الاولؓ۔ کتب خانہ حضرت مفتی محمد صادق صاحب کتب خانہ حضرت مرزا سلطان احمد صاحب اور کتب صدر انجمن احمدیہ پر مشتمل ہے۔ اس میں چوہدری عبدالرحمٰن صاحب شاکر لائبریرین اور ایک مددگار کارکن کام کرتے ہیں۔ دوسرا حصہ اسکا وہ ہے جو پہلے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی ذاتی لائبریری ہوتی تھی۔ اس حصہ میں چوہدری خلیل احمد صاحب اور ایک مددگار کارکن کام کرتے ہیں۔ لائبریری کے دونوں حصوں پر مولوی محمد صدیق صاحب فاضل واقفِ زندگی انچارج خلافت لائبریری ہیں۔'' (ص ۸۲)

خاکسار عبدالرحمٰن شاکر کو خدا تعالیٰ نے ۱۹۴۱ء میں بذریعہ کشف بتا دیا تھا کہ جہاں اب ربوہ شہر آباد ہے یہاں لائبریری میں کام کروں گا۔ پوری تفصیل کیلئے دیکھئے رسالہ ریویو آف ریلیجنز انگریزی بابت ماہ جنوری ۱۹۵۳ء میرے مضمون کا عنوان ہے:۔

RABWAH THE LAND OF MY DREAMS

جن دنوں میں لائبریری کو ترتیب دے رہا تھا تو حکیم صاحب مجھے قدم قدم پر یاد آیا کرتے تھے مرحوم بھائی

کبھی مذاقاً میری اور مولوی احمد خاں صاحب تبسم کی ہجو لکھا کرتے تھے۔ جو ہوتی تو تک بندی تھی مگر حکیم صاحب ہمیں ہنسایا بہت کرتے تھے۔

حکیم صاحب مرحوم نے دو بیٹیاں اور تین لڑکے یادگار چھوڑے۔ بڑی بیٹی نصرت گرلز سکول میں ملازم ہے۔ دوسری اب بیوہ ہوگئی ہے۔ بڑا لڑکا بشیر احمد واپڈا راولپنڈی میں ہے۔ دوسرا محمود احمد نشتر میڈیکل کالج میں آرٹسٹ ہے اور تیسرا بھی واپڈا میں ملازم ہے۔

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان اکتوبر ۱۹۷۸ء)

حافظ سلیم احمد آٹاوی

حافظ سلیم بھی ایک رقم تھے۔حافظ قرآن شاعرِ بے بدل۔نکتہ سنج۔ذہین۔باغ و بہار طبیعت منکسر المزاج بے حد ہمدرد۔دوستی نبھانے میں مثال۔سلسلہ احمدیہ پر فدا۔تقریباً مولوی فاضل۔بس ذرا یونہی سی لاپرواہی دکھائی یایُوں کہئے کہ اپنا ہی شعر بیچ میں حائل ہوگیا۔ورنہ فاضل بنے بنائے تھے

نہیں ہے شوق کہ کہلاؤں مولوی فاضل
لاہور کس لئے جاؤں میں امتحاں کے لئے

اصل وطن آٹاوہ (یو۔پی۔بھارت) والد کا نام رحیم خاں تھا۔وہاں کی گذری بازار کی جامع مسجد کٹڑہ پنجابیاں میں حافظ عبدالرحیم سے قرآن مجید حفظ کیا۔تعلیم مڈل تک پائی اور تحصیل میں سمن تعمیل کرانے کی ڈیوٹی سنبھالی۔خود سُناتے تھے کہ میں چپڑاس پہن کر بڑا فخر محسوس کیا کرتا تھا۔

۱۹۱۶ء میں سعادتِ ازلی نے احمدیت کی طرف متوجہ کیا۔قادیان دیکھنے آئے اور بیعت کرلی۔جب گھر والوں کو بتایا تو وہ سخت خفا ہوئے اور ان کو گھر سے نکال دیا۔یہ لوٹ کر پھر قادیان آگئے اور مدرسہ احمدیہ میں داخلہ لے لیا۔مولوی فاضل کلاس تک پڑھے مگر عین آخری وقت ارادہ بدل لیا اور امتحان نہ دیا۔

مبداءِ فیض نے ان کو حُسنِ صورت سے ذرا کم ہی حصہ دیا تھا۔مجھے ایک دن ہنس ہنس کر حسب ذیل واقعہ سنایا۔کہ ایک عزیز دوست نے جو تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں پڑھتے تھے۔موسم گرما کی تعطیلات میں دعوت دی کہ ان کے ہمراہ پشاور چلوں۔جو خود سیکنڈ کلاس میں سفر کررہے تھے ان کو سرونٹ کا ٹکٹ لے دیا۔جہلم سے آگے نکل کر میل ٹرین ایک جگہ ٹھہری تو انہوں نے بلایا کہ آکر ناشتہ کرلوں۔پولیس والے دیکھ رہے تھے آتے ہی ان سے پوچھا تم کون ہو؟ اور ان کے سامان کی تلاشی لینے پر زور دیا۔مگر ان کے دوست نے ان کا تعارف کرایا تو گلو خلاصی ہوئی۔تھانیدار جاتے ہوئے کہنے لگا کہ شکل سے تو تم مجھے چور ہی معلوم ہوئے تھے۔

حافظ صاحب میں احمدیت کے لئے بہت غیرت تھی۔پیغام حق پہنچانے میں کسی سے دب کے نہ رہتے تھے۔ایک دفعہ مولوی ثناءاللہ صاحب امرتسری کو مکتوب مفتوح لکھا۔پھر اپنی عمر کے آخری حصہ میں وفات سے کچھ عرصہ قبل مولوی احتشام الحق تھانوی (کراچی) کو تبلیغی خط لکھا کہ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو پیغام حق دوں۔اوّل آپ میرے ہموطن ہیں۔دوسرے آپ کے والد مرحوم مولوی ظہور الحق صاحب سے میں نے کچھ حصہ قرآن مجید کا یاد کیا تھا۔اور تیسرے آپ نے ہماری جماعت کے متعلق سُنے سنائے الزامات کو سچ مان لیا ہے۔کچھ مطبوعہ ٹریکٹ بھی بھجوائے اور آخر میں لکھا کہ۔

لَا تَقُولُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِناً ط

تقریباً ۲ سال تک قادیان میں نائب ایڈیٹر الفضل بھی رہے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تقسیم ملک تک حضرت پیر منظور محمد صاحب موجد طرز کتابت یسرنا القرآن کے دفتر میں کارکن رہے۔ اور نہایت محنت۔ دلچسپی اور دیانتداری سے کام کیا۔ جس پر حضرت پیر صاحب نے خوش ہوکر دو مختلف اوقات میں انہیں ۵۰۰ روپے انعام دیئے۔ اس بارے میں محترم پیر صاحب کی اصل تحریر کا چربہ:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہِ الکریم

اخویم حافظ سلیم احمد خاں صاحب کو بوجہ اس کے کہ انہوں نے دفتر یسرنا القرآن میں پندرہ ۱۵ برس نہایت اخلاص اور دیانت اور محنت سے کام کیا ہے علاوہ تنخواہ میں انہیں یک مشت مبلغ ۵۰۰ پانسو روپے دیتا ہوں جو انہوں نے وصول کرلیا ہے۔ رسید اُن کی دفتر کی رسیدوں کی تار میں ہے۔

خاکسار

پیر منظور محمد بقلم خود ۲۷۔ اپریل ۱۹۴۶ء

دفتر یسرنا القرآن۔ قادیان دارالامان

ضلع گورداسپور۔ پنجاب

۳۰۔ مئی ۱۹۳۱ء میں حافظ صاحب موصوف نے دفتر یسرنا القرآن میں کام شروع کیا۔ آج ۲۷۔ اپریل ۱۹۴۶ء کو پورے پندرہ سال ہو جائیں گے۔

مولوی نذیر احمد علی مرحوم سیرالیون سے پہلی مرتبہ واپس آئے تو انہوں نے حافظ سلیم احمد کو آمادہ کرلیا کہ وہ مولوی صاحب کے ہمراہ مغربی افریقہ چلیں۔ وہاں پر حافظ قرآن کوئی نہیں ہے۔ یہ راضی ہوگئے۔ مولوی صاحب موصوف نے حضرت خلیفہ ثانیؓ سے بھی ان کو ہمراہ لے جانے کی اجازت لے لی مگر جس وقت حضرت پیر منظور محمد صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے سخت احتجاج کیا اور عرض کیا کہ میرا دفتر حافظ صاحب کے بغیر کیسے چلے گا۔ تب حضرت مصلح موعودؓ نے حافظ صاحب کو افریقہ جانے سے منع کر دیا ورنہ یہ تو تقریباً پہنچ ہی گئے تھے کیونکہ دوستوں سے الوداعی پارٹیاں لے چکے تھے۔

حافظ صاحب کی صحبت مدرسہ احمدیہ کے نہایت ہی محترم اساتذہ کے علاوہ حافظ احمد اللہ صاحب (جنہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جگہ حج بدل کیا تھا) قاضی محمد ظہور الدین اکمل صاحبؓ حضرت شہزادہ عبدالمجید صاحبؓ۔ اور حضرت پیر منظور محمد صاحب کے پاس تو اکثر وقت گزارتے تھے۔

حافظ سلیم احمد نے اخبار الفضل میں نہایت سنجیدہ مضامین اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مگر بعض دفعہ اپنی باغ و بہار

طبیعت کی رَو میں بہہ جایا کرتے تھے تاہم زبان کا چٹخارہ نہیں جاتا تھا۔

حافظ صاحب کے ایک کلاس فیلو سیّد محمد یوسف شاہ فارغ تخلص کرتے تھے۔ آپ کشمیری تھے۔ ایک دن جمعہ سے واپس لوٹے تو انہوں نے یونہی کہہ دیا کہ یار لنڈن کبھی نہیں دیکھا۔ حافظ صاحب کہنے لگے چلو اب دیکھ لو۔ فارغ صاحب نے کہا چلو اُٹھو پھر دیر کیا ہے۔ ابھی روانہ ہو جائیں۔ معاً دونوں منہ اٹھا کر بٹالہ کے راستے پر چل پڑے شہر سے نکل کر آدھ میل گئے ہوں گے کہ دونوں نے گھبرا کر تجویز کی کہ سرِ دست ارادہ ملتوی کر دیتے ہیں۔ اور واپس آ گئے۔ اس پر بڑی ہنسی ہوئی تب حافظ سلیم نے ایک لمبی مزاحیہ نظم لکھی جس کا ایک بند یاد رہ گیا ہے۔

عقل سے فارغ ہو تم یار
آدھے اُلّو آدھے حمار
ٹونکل ٹونکل لِٹل سٹار
ہاؤ آئی وَنڈر وَٹ یُو آر

قادیان میں حضرت میاں احمد دین صاحب زرگر علاقہ بار کا گھی لا کر فروخت کیا کرتے تھے ۳۲-۱۹۳۱ء کی بات ہے۔ کہ قادیان میں میر قاسم علی صاحب ایڈیٹر فاروق کی زیر صدارت ایک مشاعرہ ہوا۔ طرح مصرع تھا

ہاتھ ہے تیری طرف ہر گیسوئے خمدار کا

حافظ صاحب نے بھی اسی زمین میں نظم لکھی۔ دو تین شعر یاد ہیں۔ مقطع میں میاں احمد دین کی خبر لی ہے

سر خوشی سے کیوں نہ ناچیں اور گائیں آج ہم
عید کی بھی اک خوشی ہے دن بھی ہے اتوار کا
جب سے حاجی برکت اللہ پوسٹ آفس میں گیا
بڑھ گیا محصول اس دن سے ہے ڈاک اور تار کا
نزلہ و کھانسی سے میرا ناک میں دم ہے سلیم
جب سے گھی لائے ہیں احمد دین زرگر بار کا

آخری شعر میں نے قاضی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کو سنایا جو یہی گھی خریدنے جا رہے تھے اور وہیں رُک گئے۔

جب میاں ظفر احمد صاحب بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولائت کو روانہ ہوئے تو حافظ صاحب نے الوداعی نظم لکھی جس کا مقطع تھا

بس یہی ہے دعا کہ اے بھائی
بسلامت روی و باز آئی

دمشق کے مخلص احمدی خاندان کے نونہال احسان سامی حقی جناب سیّد زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب کے ہمراہ قادیان آئے اور مدرسہ احمدیہ میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔انہوں نے قادیان کے ہائی سکول کے وسیع ہال میں ایک عربی ڈرامہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے متعلق کرنا چاہا۔مگر مفتی سلسلہ مولانا سرور شاہ صاحب نے اجازت نہ دی۔اس پر احسان صاحب بڑے مایوس ہوئے کیونکہ وہ ہر قسم کی تیاریاں کر چکے تھے تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور حضرت خلیفۃ المسیحؓ سے اجازت لے لی۔اس پر حافظ صاحب نے رباعی لکھی تھی ؎

نہ مغموم ہو تو ذرا میرے بھائی
اگر روک دیں مفتی دیں ڈرامہ
شریفوں کی تعریف کرتا ہے قرآں
اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَاماً

حافظ صاحب کے ایک کلاس فیلو نے ایک مطلقہ لڑکی سے شادی کر لی۔حافظ چند اشعار لکھ کر لے گئے اور جا کر اُسے سُنائے مقطع یہ تھا ؎

یہ ترانہ بجا رہا ہے بینڈ
تجھ کو بیوی ملی ہے سیکنڈ ہینڈ

وہ کچھ ناراض ہوئے تو مگر یہ بھی حافظ سلیم تھے۔زبانی پھلجھڑیوں سے اُسے خوش کر دیا۔

حافظ صاحب کے ایک دوست عبدالسلام تاؔج بھی تھے۔وہ ان کے گھر تشریف لائے۔تو حافظ صاحب نے قلاقند منگوائی۔پیش کی اور مجلس میں حسب ذیل رباعی سنائی جس پر بہت واہ واہ ہوئی تھی ؎

مارے خوشی کے دل ہے مرا باغ باغ آج
آیا ہے میرے گھر میں جو عبدالسلام تاج
(تیسرا مصرع یاد نہیں رہا)
لیتا رہے حسینوں سے تو اس طرح خراج

حافظ صاحب میں ایک خوبی یہ تھی کہ روزانہ عصر کے بعد چڑیوں کے لئے باریک چاول یا باجرہ وغیرہ التزام کے ساتھ بکھیرا کرتے تھے۔اور ملنے والوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی تلقین کرتے تھے۔کہا کرتے تھے کہ ان بے زبانوں کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔

ایک دفعہ حافظ سلیم احمد نے خواب میں دیکھا کہ جناب چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے اُن کو دس دس کے تین نوٹ دیئے ہیں۔کچھ دنوں کے بعد حضرت خلیفہ ثالث ایدہ اللہ تعالیٰ ایک جنازہ کے ہمراہ بہشتی مقبرہ تشریف لے گئے تو حضور نے حافظ سلیم احمد کو یاد فرمایا۔یہ حاضر ہوئے تو حضو نے حافظ صاحب کو تین نوٹ دس دس روپے کے

عنایت فرمائے۔ حافظ صاحب نے ان میں سے دس روپے فضل عمر فاؤنڈیشن کو اور دس روپے ایک محتاج کو دیدیئے اور دس روپے خود رکھ لئے۔

اس خواب اور واقعہ کا ذکر مکرم شیخ مبارک احمد صاحب نے چوہدری صاحب موصوف سے ربوہ سے لاہور کار میں جاتے ہوئے کر دیا تو چوہدری صاحب نے حافظ صاحب کو ایک معقول رقم بھجوائی نیز حافظ صاحب کے لئے کچھ وظیفہ مقرر فرمایا۔

آخری عمر میں مولانا جلال الدین صاحب شمس نے اپنے مکان کے ایک گوشہ میں ایک کمرہ دے دیا تھا جہاں ۷۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ تمام عمر مجرد رہے۔ بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئے۔

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان نومبر، دسمبر ۱۹۷۸ء)

نواب سیّد صدیق حسن خان بھوپالوی

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

''منجملہ خداتعالیٰ کے نشانوں کے جو میری تائید میں ظاہر ہوئے نواب صدیق حسن خان وزیر ریاست بھوپال کے بارہ میں نشان ہے اور وہ یہ ہے کہ نواب صدیق حسن خان نے بعض اپنی کتابوں میں لکھا تھا کہ جب مہدی موعود پیدا ہوگا تو غیر مذاہب کے سلاطین گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کئے جائینگے اور یہ ذکر کرتے کرتے یہ بھی بیان کر دیا کہ چونکہ اس ملک میں سلطنت برطانیہ ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کے ظہور کے وقت اس ملک کا عیسائی بادشاہ اسی طرح مہدی کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ یہ الفاظ تھے جو انہوں نے اپنی کتابوں میں شائع کئے تھے جواب تک ان کی کتابوں میں موجود ہیں اور یہی موجب بغاوت سمجھے گئے۔ اور یہ ان کی غلطی تھی کہ انہوں نے ایسا لکھا''۔ (حقیقۃ الوحی ص ۴۷۶)

مگر چونکہ نواب صدیق حسن کے دل میں خشک وہابیت کا خمیر تھا۔ اس لئے انہوں نے غیر قوموں کو صرف مہدی کی تلوار سے ڈرایا اور آخر پکڑے گئے۔ اور نواب ہونے سے معطل کئے گئے۔ اور بڑی انکساری سے میری طرف لکھا کہ میں ان کے لئے دعا کروں۔ تب میں نے ان کو قابل رحم سمجھ کر اس کے لئے دعا کی۔ تو خداتعالیٰ نے مجھ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ سرکوبی سے اسکی عزت بچائی گئی۔

میں نے یہ اطلاع بذریعہ خط ان کو دے دی۔ اور کئی لوگوں کو بھی جو ان دنوں میں مخالف تھے یہی اطلاع دی۔ چنانچہ منجملہ ان کے حافظ محمد یوسف ضلعدار نہر حال پنشنر ساکن امرتسر اور مولوی محمد حسین بٹالوی ہیں۔ آخر کچھ مدت کے بعد گورنمنٹ کا حکم آ گیا کہ صدیق حسن خان کی نسبت نواب کا خطاب قائم رہے گویا یہ سمجھا گیا کہ جو کچھ اس نے بیان کیا ایک مذہبی پرانا خیال ہے جو ان کے دل میں تھا بغاوت کی نیت نہ تھی۔ نواب صدیق حسن خان پر جو یہ ابتلاء پیش آیا۔ وہ بھی میری ایک پیشگوئی کا نتیجہ ہے۔ جو براہین احمدیہ میں درج ہے۔ انہوں نے میری کتاب براہین احمدیہ کو چاک کر کے واپس بھیج دیا تھا۔ میں نے دعا کی تھی ان کی عزت چاک کر دی جائے۔ سو ایسا ہی ظہور میں آیا۔

(حقیقۃ الوحی ص ۴۷۰ طبع پنجم ۱۹۶۸ء)

نواب سیّد صدیق حسن خان صاحب مصنف حج الکرامہ ۱۴۔ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام اولاد حسن خان تھا۔ ابھی آپ پانچ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی والدہ نے بچوں کو بڑی تنگی سے پالا۔ آپ کو مختلف مقامات پر تعلیم کی غرض سے بھجوایا۔ اور حدیث فقہ وغیرہ علوم اسلامیہ کی تعلیم دلوائی آپکے والد (جو حضرت سیّد احمد صاحب بریلوی شہید بالاکوٹ کے مرید تھے اور بہت پرہیزگار آدمی تھے) نے اپنے شیعہ

والد کی لاکھوں روپے کی جائیداد جو ورثے میں ان کا حق بنتا تھا لینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان کے دوسرے شرکاء مالا مال ہو گئے۔ اور صدیق حسن معہ برادران غریب ہو گئے۔

آخر کار مولانا صدیق حسن صاحب نے اپنے گھر کی حالت دیکھ کر ملازمت کی نیت سے بھوپال کا سفر اختیار کیا۔ مگر چونکہ کسی کا وسیلہ نہ تھا اسلئے کوئی کام نہ مل سکا۔ آخر آپ نے بھوپال کے مدارالمہام سید جمال الدین صاحب [1] کو درخواست پیش کی۔ اس پر تین روپے ماہوار کی ایک ملازمت مل گئی۔ مگر وہ ان کے اور گھر کے اخراجات کیلئے کافی نہ تھی۔ تاہم آپ بہت محنت سے کام کرتے رہے۔ اور کچھ عرصہ بعد میر دبیر بنا دیئے گئے۔ اور تنخواہ پچاس روپے ماہوار ہو گئی۔ مگر بعض حاسدین نے سازش کر کے ان کو وہاں سے نکلوا دیا۔ اور آپ بھوپال سے کانپور چلے آئے۔ وہاں پہنچتے ہی ۱۸۵۷ء کا سانحہ پیش آ گیا اور بڑی مشکل سے اور خطرات سے گزر کر اپنے وطن قنوج پہنچے۔ ان دنوں مالی حالت بالکل صفر تھی۔ تاہم ان کے والد کے دوست ان کی مدد کرتے رہے اور گزراوقات ہوتی رہی۔

ان حالات میں نواب سکندر بیگم صاحبہ والیۂ بھوپال کا خط آپ کو ملا کہ آپ فوراً بھوپال آ جائیں۔ مولوی صاحب وہاں چلے تو گئے مگر گروہ حاسدین نے ان کے پاؤں نہ جمنے دیئے اور آپ مایوس ہو کر ٹونک چلے گئے۔ ٹونک میں آپ کو سید جمال الدین صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کے خطوط ملے کہ آپ پھر بھوپال آئیں اور اپنے سابقہ رویہ پر معافی چاہی چنانچہ اگست ۱۸۵۹ء میں آپ تیسری مرتبہ پھر بھوپال آئے۔ اور سرکاری حکم سے تاریخ بھوپال لکھنے پر مامور ہوئے وہیں پر ۱۸۶۰ء میں ذکیہ بیگم صاحبہ بنت سید جمال الدین صاحب موصوف سے شادی ہو گئی۔ اور آپ ریاست کے عمائدین میں شمار ہونے لگے۔ ۱۸۶۹ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔

نواب سکندر بیگم کے بعد نواب شاہ جہاں بیگم ملکہ بھوپال ہوئیں۔ انہوں نے مولوی صدیق حسن صاحب کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری مقرر فرمایا۔ اور خان صاحب کا خطاب بھی عطا کیا۔ چونکہ یہ ملکہ بھوپال جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ لہذا ۱۸ مئی ۱۸۷۱ء میں انہوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کی اجازت سے عقدِ ثانی مولوی حسن خان صاحب سے کر لیا۔ (اس سے قبل مولوی صاحب کی پہلی بیوی ذکیہ بیگم بنت جمال الدین صاحب فوت ہو چکی تھیں۔) نواب شاہ جہان بیگم ملکہ بھوپال نے اپنے مرحوم خاوند کے خطابات ناظر الدولہ نواب والا جاہ امیر الملک بھی مولوی موصوف کیلئے گورنمنٹ سے منظور کروا لئے۔ اور ۷۵۰۰۰ روپے کی جاگیر بھی ان کے نام کر دی۔ نیز گورنمنٹ آف انڈیا نے نواب صدیق حسن خان کیلئے ۱۷ توپ کی سلامی کی بھی منظوری دے دی۔

نواب صاحب فرقہ اہلحدیث کے بڑے مشہور لیڈر تھے۔ آپ نے قریباً ۹۰ کتب دینیہ لکھیں۔ جن میں حجج الکرامہ فی آثار القیامہ بہت مشہور ہے۔ ''ترجمان الوہابیہ'' بھی انہی کی تصنیف ہے۔

---

[1] یہ وہی منشی جمال الدین صاحب ہیں جن کا ذکر حضرت خلیفۃ المسیح الاول مولانا نورالدین صاحب نے اپنی سوانح حیات ''مرقاۃ الیقین فی حیات نورالدین'' میں بڑی محبت سے کیا ہے۔

مشہور انقلابی مفکر سید جمال الدین افغانی جو پان اسلام ازم کے بانی تھے اور جنکو کوئی مسلم حکومت پناہ دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ دورہ کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور بھوپال گئے۔ وہاں پر تین چار لیکچر بھی دیئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزوں کو شمالی مغربی سرحد کی طرف سے روس کے حملہ کا خطرہ ہر وقت آتش زیر پا رکھتا تھا اور اس کے ساتھ اگر کوئی لفظ جہاد۔ مہدی۔ پان اسلام ازم وغیرہ کا نام لے لیتا تو انگریزوں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں۔

ان دنوں انگلستان کا وزیر اعظم ولیم گلیڈسٹون سخت معاند اسلام تھا۔ ہر ممکن موقعہ پر وہ مسلمانوں کو زک دینے کیلئے تیار رہتا تھا۔ ٹرکی کی حکومت کو وہ وحشی اور غیر مہذب حکومت سمجھتا تھا۔ ٹرکی کی مرغی کو اسی نے رواج دیا تھا کیونکہ یہ پل کر بہت موٹی ہو جاتی ہے اور کھانے میں بہت لذیذ ہوتی ہے۔ چنانچہ انگلستان میں کرسمس کے موقعہ پر ''ٹرکی'' کے بغیر ضیافت ادھوری سمجھی جاتی ہے۔ اس شخص کی اسلام دشمنی کے پیش نظر اکبر آلہ آبادی نے یہ شعر کہا ہے ؎

جو مرے بربادی اسلام کی تلقین میں
قبر اسکی ہو گلیڈ اسٹون کی پائین میں

ایسا شخص کیونکر برداشت کر سکتا تھا کہ انگریزوں کی ایک باجگزار ریاست بھوپال میں سید جمال الدین افغانی حریت پرور تقریریں کرے۔ چنانچہ اس کے اشارہ سے مولانا جمال الدین افغانی کو بھوپال سے نکلوا دیا گیا۔

اس شبہ پر کہ جمال الدین افغانی ضرور نواب سید صدیق حسن خان سے ملے ہوں گے اور انگریزوں کے خلاف گفتگو ہوئی ہو گی اس لئے گورنمنٹ آپ سے بدظن ہو گئی۔ انہی دنوں آپ نے مہدی سوڈانی محمد احمد کو کچھ مالی امداد بھی دی۔ آپ پر یہ بھی الزام لگا کہ ریاست کے مہاجنوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ بھی الزام آیا کہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اچھے اچھے عہدوں پر فائز کرایا ہے۔ ریاستوں میں درباری سازشیں بھی درپردہ کام کر رہی ہوتی ہیں مزید برآں نواب شاہ جہان بیگم کی پہلے خاوند سے بیٹی نواب سلطان جہاں بیگم جو ولیعہد بھی تھیں نواب صدیق حسن خان صاحب کے سخت خلاف تھیں۔

بھوپال کے ریذیڈنٹ سر لیپل گریفن (مصنف پنجاب چیفس) نے گورنمنٹ آف انڈیا کو رپورٹ دی جو نواب صاحب کے سخت خلاف تھی۔ جس کے نتیجہ میں نواب صدیق حسن صاحب کے تمام خطابات توپوں کی سلامی وغیرہ ضبط کر لئے گئے اور آپ کو اپنے عالی شان محل ''نور محل'' میں قید کر دیا گیا۔ دن کے وقت وہ اپنی بیوی ملکہ بھوپال سے ملاقات بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور صرف رات گزارنے کیلئے ملکہ کے محل ''تاج محل'' میں جا سکتے تھے آٹھ ماہ تک یہی حالت رہی۔ پھر ملکہ بھوپال نے کلکتہ جا کر وائسرائے لارڈ ڈفرن سے نواب صاحب کیلئے سفارش کی اور ان کی طرف سے معافی مانگی تو صرف اتنی اجازت ملی کہ نور محل میں ملکہ بھوپال اور مولوی صاحب اکٹھے رہ سکتے ہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ امام الزمان مرزا غلام احمد صاحب قادیانی جری اللہ فی حلل الانبیاء نے اپنی معرکتہ الآراء

کتاب براہین احمدیہ (۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک) چار جلدوں میں شائع فرمائی تھی ۔اس وقت حضور کے پاس اس قدر رقم نہ تھا۔ چنانچہ دعائیں کرنے کے بعد الہام ہوا کہ۔

وَهُزِّیْ اِلَیْکَ بِجِزْعِ النَّخْلةِ تُسَاقِطُ عَلَیْکَ رُطَباً جَنِیًّا

اس حکم الٰہی پر عمل کرتے ہوئے اول تو حضور نے خلیفہ محمد حسن صاحب وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی طرف خط لکھا انہوں نے دو اقساط میں ۵۰۰ روپے بھجوا دیئے۔اور کتاب باوجود نومیدی کے چھپ گئی۔ حضور نے مختلف رؤساء و اکابر کو بھی خطوط لکھے۔محترم خلیفہ محمد حسن صاحب کے علاوہ بعض اور اہل دل حضرات نے حضور کی تحریک پر توجہ دی۔ مثلاً مرزا محمد علاؤالدین صاحب رئیس لوہارو ۴۰ روپے۔ نواب سر وقار الامراء اقبال الدولہ صاحب حیدرآباد دکن ۱۰۰ روپے ۔محمد افضل خان صاحب ۱۱۰ روپے نواب صاحب مالیر کوٹلہ ۱۰۰ روپے شیخ محمد بہاء الدین صاحب وزیر اعظم جونا گڑھ ایک ہزار روپے۔

اسی سلسلہ میں حضرت اقدسؑ نے نواب صدیق حسن صاحب کو بھی لکھا۔ پہلے تو انہوں نے کتب کی خریداری کا وعدہ کیا مگر بعد میں دستکش ہو گئے۔ حضور تحریر فرماتے ہیں۔'' کچھ عرصہ گزرا اس خاکسار نے ایک نواب صاحب کی خدمت میں کہ جو بہت پارسا طبع اور متقی خصائل حلمیہ اور قال اللّٰہ اور قال الرسول سے بدرجہ غایت خبر رکھتے ہیں۔ کتاب براہین احمدیہ کی اعانت کیلئے لکھا تھا۔سو اگر نواب صاحب اس کے جواب میں لکھتے کہ ہماری رائے میں یہ کتاب ایسی عمدہ نہیں ہے۔جس کیلئے کچھ مدد کی جائے افسوس نہ تھا مگر صاحب موصوف نے پہلے تو یہ لکھا کہ پندرہ بیس کتب ضرور خریدیں گے اور پھر دوبارہ یاددہانی پر یہ جواب آیا کہ دینی مباحثات کی کتابوں کا خریدنا یا انہیں کچھ امداد دینا خلاف منشاء گورنمنٹ انگریزی ہے۔اس لئے اس ریاست سے خرید وغیرہ کی امید نہ رکھیں۔ سو ہم بھی نواب صاحب کو امید گاہ نہیں بناتے ۔ بلکہ امید گاہ خداوند کریم ہی ہے ۔اور وہی کافی ہے۔ خدا کرے گورنمنٹ انگریزی نواب صاحب سے بہت راضی رہے''۔

حضور علیہ السلام کو نواب صدیق حسن صاحب کے اس جواب پر زیادہ رنج اس وجہ سے ہوا کہ نواب صاحب نے پہلے تو کتابوں کا پیکٹ وصول کر لیا۔مگر کھول کر جب پڑھا تو اپنے پرانے خیالات کی وجہ سے کچھ ایسے بگڑے کہ دوبارہ نہایت بُری طرح پیکٹ بنا کر واپس بھیج دیا۔نہ معلوم خود غصہ سے کتابیں پھاڑ دیں ۔یا اس لاپرواہی سے پیکٹ بنوایا کہ کتابیں پھٹ گئیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ پھٹی ہوئی کتابوں کا پلندہ جب حضرت اقدس کو وصول ہوا۔ بھلا جو کتابیں اس قدر خون جگر کھا کر محض خدمت دین کیلئے لکھی گئی تھیں۔ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ کو بہت رنج ہوا۔[1]

حاشیہ [1] :۔اس کتاب کی اشاعت کے لئے حضور نے بڑی تکلیف اٹھائی ۔کاپیاں کاتب سے لکھوا کر خود پڑھتے ۔پھر ان کو لیکر امرتسر جاتے بعض دفعہ ۳۶ میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا عیسائیوں کے پریس پر زیادہ اجرت دیکر چھپوائی۔ شیخ نور احمد صاحب نے اپنے رسالہ ''نور احمد'' میں پوری تفصیل اس کتاب کی طباعت کی درج کردی ہے۔ جو قابل ملاحظہ ہے۔

شیخ حامد علی صاحب (جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم امیر جماعت احمدیہ قادیان کے ماموں اور خسر) جو حضرت کے خادم خاص تھے بیان کرتے ہیں اُس بُری حالت اور کتب کو اس بُری طرح پھٹا دیکھ کر آپ کا رنج اور غصہ سے چہرہ متغیر اور سرخ ہو گیا۔۔آپ اس وقت صحن میں چہل قدمی فرما رہے تھے اور آپ کی طبیعت نہایت بیقرار تھی۔اس حالت میں ٹہلتے گئے اور بالکل خاموش تھے کہ اچانک آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ

''اچھا تم اپنی گورنمنٹ کو خوش کرلو''۔

خدا جانے کس درد سے آپ کے دل سے یہ کلمہ نکلا کہ بقول مولانا روم ؎

تا دلِ مردِ خدا ناید بدرد
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

براہین احمدیہ کی جلد ۴ ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی اور ۱۹۔اکتوبر ۱۸۸۵ء کو نواب صدیق حسن خان صاحب کے تمام خطابات ضبط کر لئے گئے۔

غرض اس وقت سے نواب صاحب کے مصائب کا آغاز ہوا۔درباری شازشیں ،شماتت اعداء خود ولیہٗ عہد نواب سلطان جہاں بیگم (والدہ نواب سر حمید اللہ خان صاحب مرحوم) کی مخالفت جب چاروں طرف سے مایوسی اور ناکامی نے آن گھیرا۔تو نواب صاحب نے حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ السلام کے ایک پرانے ملنے والے حافظ محمد یوسف صاحب امرتسری ضلعدار نہر (جو کہ خود نواب صاحب کی طرح اہلحدیث تھے) کو قادیان بھجوایا اور معافی کی درخواست کی حافظ محمد یوسف صاحب نے بھی نواب صاحب کی سفارش کی اور دعا کیلئے عرض کیا۔پہلے تو حضرت نے انکار فرمایا مگر حافظ صاحب پر حضور بڑے مہربان تھے اس لئے انہوں نے بھی پیچھا نہ چھوڑا۔اور بار بار عرض کرتے رہے آخر حضور نے دعا کا وعدہ فرمایا۔حافظ صاحب کہتے ہیں کہ میں اس وقت تک قادیان سے نہ ہلا۔جب تک کہ دعا نہ کرالی۔آخر حضرت مرزا صاحب نے فرمایا کہ

''میں نے دعا کی ہے نواب صاحب کو چاہیئے کہ خود بھی توبہ کریں۔اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے وہ رحم فرمائے گا اور وہ حکومت کے اخذ سے بچ جائیں گے۔

اس کے بعد حافظ محمد یوسف صاحب نے نواب صاحب کی طرف سے براہین احمدیہ کی خریداری کی درخواست کی۔مگر حضرت نے منظور نہ فرمایا۔حافظ صاحب نے ہر چند عرض کیا مگر حضور راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ

''میں نے رحم کر کے دعا کر دی ہے اور خدا تعالیٰ کے فضل سے وہ عذاب سے بچ جائیں گے میرا یہ فعل شفقت کا نتیجہ ہے۔ایسے شخص کو جس نے اس کتاب کو اس حالت کے ساتھ واپس کیا اب کسی قیمت پر بھی دینا نہیں چاہتا۔یہ میری غیرت اور ایمان کے خلاف ہے۔ان لوگوں کو جو تحریک کی تھی تو خدا تعالیٰ کے مخفی امور کے ماتحت اور ان پر رحم کر کے کی تھی کہ یہ لوگ دین سے غافل ہوتے ہیں۔براہین کی اشاعت میں اعانت کر کے گناہوں گا کفارہ ہو جائے

اور خدا تعالیٰ انہیں کسی اور نیکی کی توفیق دے۔ ورنہ میں نے تو ان لوگوں کو کبھی امید گاہ نہیں بنایا۔ ہماری امید گاہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور وہی کافی ہے'' (مجدد اعظم ص ۱۰۳)

بہر حال گورنمنٹ آف انڈیا نے ملکہ بھوپال کی منت سماجت پر بالآخر نواب صدیق حسن صاحب پر سے تمام پابندیاں اٹھالیں۔ اور تمام خطابات وغیرہ واپس دینے کے احکام جاری کر دیئے۔ مگر احکام کے بھوپال پہنچنے سے قبل نواب صاحب موصوف بقضائے الٰہی ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء کو مرض استقاء سے فوت ہو چکے تھے۔

نواب صاحب کی وفات کے بعد ۱۲۔ اگست ۱۸۹۰ء کو لارڈ لینڈون وائسرائے نے حکم دیا کہ مولوی صدیق حسن خان صاحب کو مرحوم نواب صاحب لکھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

ماخذ۔ (۱) حقیقۃ الوحی (۲) تذکرہ (۳) مجدد اعظم (۴) نواب صدیق حسن خان (انگریزی) (حیات سلطانی)

(ماہنامہ انصار اللہ فروری ۱۹۷۸ء)

حسن رہتاسی کے ایک شعر کا پس منظر

حسن صاحب منشی گلاب دین صاحب کے بیٹے تھے جو تین سو تیرہ صحابہ میں سے تھے۔ منشی صاحب سکول ٹیچر تھے اور بڑے منجھے ہوئے شاعر بھی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان کا ایک قصیدہ سراج منیر کے آخر میں نقل کیا ہے۔ حسن صاحب کی تاریخ بیعت ۱۸۹۵ء ہے۔

۱۹۳۰ء میں حسن صاحب لاہور کے ضلع کچہری میں ہیڈ نقل نویس تھے۔ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی اور خوب مزے سے گذر اوقات ہو رہی تھی۔ ایک دن اپنے ہندو افسر سے کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ یہ تھے طبیعت کے تیز اور بہت غصیل۔ بلکہ یوں کہیئے کہ غصہ ان کی ناک کی چونچ پر بیٹھا رہتا تھا جھٹ استعفیٰ لکھ کر دیدیا اور گھر آ گئے۔ داغ کی ایک غزل ہے جس کا ایک شعر یہ ہے

ملاتے ہو اُسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
میری جان چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

حسن صاحب نے بھی جو بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔
اسی زمین میں کچھ اشعار کہے ہیں جن میں سے ایک شعر یہ ہے۔
اور پھر فرماتے ہیں۔

رخ روشن تیرا مانامہ کامل سے ملتا ہے
تمازت میں دُرِ تاباں حسنؔ کے دل سے ملتا ہے
کچھ ایسا بے حس وحرکت کیا ہے اک مصیبت نے
درونِ گور بیرون کفن معلوم ہوتا ہے
خدا کی شان جو گھر کل گلابستان تھا وہ بھی
خزاں کے ہاتھ سے اُجڑا چمن معلوم ہوتا ہے

وہ مصیبت حسن صاحب کی اہلیہ تھی جنکا نام گوہراں بی بی تھا۔ بڑی پکی غیر احمدی۔ اسی نے گھر کو تباہ کیا۔ حسن صاحب کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بیوی سے ناچاقی بڑھتی گئی اور کتنے ہی برس گذر گئے۔ یہ لاہور سے قادیان آ گئے مگر یہاں ٹھکانہ کوئی نہ تھا۔ دن کہیں صبح کہیں۔ رات کہیں شام کہیں والا معاملہ تھا۔ خود کہتے ہیں۔

صبح کٹتی ہے تیر تکّے پر
رات بُبّل کے گرم تھّے پر

یعنی مولانا بسمل صاحب کی بیٹھک میں لیٹ رہتے تھے۔ مزید لکھتے ہیں۔

کوٹ پتلون ہے کالر ہے نہ ٹائی اپنی
گولڈن واچ سے واقف نہ کلائی اپنی
بستر اپنا ہے نہ تکیہ نہ رضائی اپنی
چند اشعار زبان پر ہیں کمائی اپنی

آخر میں نے ان کو اپنے ہاں مستقل طور پر آجانے کی دعوت دی۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی علیحدہ تھی وہ انہوں نے پسند کی۔ دفتر پرائیوٹ سیکرٹری سے ایک رضائی تو ملی مگر اسکی شان میں بھی راتوں رات قصیدہ کہدیا جس کی وجہ سے اسکے بدلہ میں ایک اور اچھی رضائی مل گئی۔

قادیان میں ایک معزز سیّد خاندان سیّد محمد علی شاہ صاحب کا تھا جو حضرت حکیم مرزا غلام مرتضٰی صاحب کے ہمعصر تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بھی دوست تھے۔ ان کے فرزند سیّد منظور علی شاہ صاحب کو اکثر احباب جانتے ہوں گے۔ سیّد محمد علی صاحب کے برادر نسبتی سیّد چراغ شاہ صاحب اچھے حکیم تھے ان کی ایک باغیچی قادیان میں بہشتی مقبرہ کے جانب مشرق تھی جس کے آم بڑے شیریں ہوتے تھے وہ ایک دن حسن صاحب کو اپنے گھر لے گئے اور خوب خاطر مدارات کی۔ بوقت رخصت حکیم صاحب نے کہا۔ حسن صاحب کوئی اور خدمت؟ حسن صاحب کو مطب میں ایک شیشی نظر آگئی۔ جس پر لکھا تھا ”کشتہ شنگرف“ اُسی پر ریجھ گئے اور کہا تھوڑا سا دیدیں۔ حکیم صاحب نے از راہ مروّت شیشی اُن کی طرف بڑھادی کہ جسقدر ضرورت ہو لے لیں۔ انہوں نے کافی مقدار میں لے لیا۔ بہت دنوں کے بعد جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ چھ سات ماشے سے کیا کم ہوگا۔ حکیم صاحب نے یہ بھی بتادیا تھا کہ اس کی خوراک ایک چاول ہوتی ہے وہ بھی مکھن اور دودھ کے ساتھ۔ اب حسن صاحب کو مکھن کہاں سے میسّر آتا جو شنگرف استعمال کرتے۔ پگڑی میں باندھے لئے پھرتے تھے۔ ایک دن دیکھا تو وہ کاغذ کچھ پھٹ گیا تھا۔ اور کچھ مقدار ضائع ہوگئی تھی۔ آخر ایک گھر سے کوئی آدھ سیر کے قریب مکھن لے ہی آئے اور وہ تمام شنگرف اس میں حل کر کے ایک دم کھا گئے۔

اس رات حسن صاحب دیر تک گھر نہ آئے۔ وسط جنوری ۱۹۳۱ء تھی۔ قادیان کی سردی چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ میں انتظار کر کر کے سو گیا۔ آدھی رات کو جو حاجت کیلئے صحن میں نکلا تو وہاں گھاس پر دیکھا کہ ایک شخص لیٹا ہوا ہے۔ میرا تو دم ہی نکل گیا کہ لو چور سے واسطہ پڑ گیا۔ خوف کے مارے خون بھی گردش سے رُک گیا ہوگا۔ میرے پڑوس میں حضرت میاں معراج الدین صاحب عمر لاہوری حضرت اقدس کے مشہور صحابی رہتے تھے۔ چاہا کہ اُن کو آواز دوں۔ لیکن میری آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ پھر سوچا کہ یونہی میرا وہم ہے۔ اتنے میں اس جسم میں حرکت ہوئی تو میں نے ساری طاقت جمع کر کے کہا۔ کون؟ جواب ملا ”حسن“ تب جسم میں خون نے دوبارہ حرکت

شروع کی ۔ میں آگے بڑھا اور کہا۔ حسن صاحب کیا آپ میاں صاحب کے فارم کے کھاد والے گڑھے میں گر گئے تھے جو یہ گوبر لگا ہوا ہے؟ کہنے لگے نہیں ۔ میں نے جسم پر مہندی لگائی ہوئی ہے ۔ میں حیران ہوا ۔ کہ جنوری کا مہینہ شبنم پر گھاس میں پڑے ہیں اور مہندی لگائے ہوئے ہیں ۔ یہ کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ تم کنویں میں سے پانی نکال کر مجھے نہلاؤ ان کے کے حکم کی خلاف ورزی کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے جلدی جلدی تعمیل شروع کردی ۔ جب مہندی اُتر چکی تو میں نے ایک چادر دی جو لپیٹ کر اندر آ گئے اور سارا واقعہ سُنایا کہ سارا کرشمہ شنگرف کا ہے۔ پھر روزانہ مہندی لگانے لگے ۔ سر، ڈاڑھی، کندھوں پر، سینے پر۔ رانوں پر۔ غرض تمام جسم پر مہندی لگاتے مگر تسکین نہ ہوتی ۔ کیونکہ ان کے اندر تو اٹامک انرجی سنٹر جاری تھا اسی عالم میں مہندی کے متعلق بھی یہ شعر کہا ۔

کٹی، کچلی گئی، چھنی، بھیگی، گندھی مہندی
جب اتنے دکھ سہے تب اسکے پاؤں میں لگی مہندی

مہندی نواب صاحب کے باغ سے آیا کرتی تھی ایک تو پہلے ہی رنگت حسنِ ملیح کا اچھا نمونہ تھی اُوپر سے شنگرف نے خون جلا کر اور بھی تیرگی بڑھا دی اور یہ رنگ آخر تک رہا۔

ایک دن اچھے موڈ میں تھے ۔ میں نے یہ شعر پڑھ دیئے ۔

تمہارے چہرے کو رنگ شب وصال ملا
نہ مٹ سکے وہ تمہیں حسن لازوال ملا
تمام حسن ہو تم وہ تمہیں جمال ملا
جہاں میں اور حسینوں کو خال خال ملا
حسین چہرے کے اک تل پہ دم نکلتا ہے
یہاں تو سر سے قدم تک وہ حسن اُبلتا ہے

کہنے لگے تم بڑے شریر ہو۔ پھر ذرا ناراضگی سے کہا یہ تو بار یش بابا ہم بازی ہے اب ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ ع

تمازت میں دُرِ تاباں حسنؔ کے دل سے ملتا ہے۔

کا باعث اور پس منظر کیا تھا

(ماہنامہ مصباح مئی ۱۹۷۳ء)

مولوی کرم دین سکنہ بھیں سے ایک ملاقات

۱۔ مولوی کرم دین صاحب سلسلہ احمدیہ کے مشہور مخالف موضع بھیں تحصیل چکوال ضلع جہلم کے ایک معزز علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مزروعہ زمین بھی کافی تھی۔ علمی لحاظ سے بھی اپنے علاقہ میں ممتاز تھے۔ اور علاقہ بھر میں ان کی خوب مانتا تھی۔ کوئی معمولی یا غیر معروف آدمی نہ تھے۔

۲۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کو سیشن جج امرتسر مسٹر اے۔ ای ہیری (A.E.Herry) نے کہا تھا کہ

''اب جبکہ آپ کا جھوٹ بالکل ظاہر ہو گیا ہے اور آپ کو مرزا صاحب نے کذاب لکھا ہے تو کیا ہرج ہوا؟''

مولوی صاحب نے جواب دیا کہ جناب یہ جھوٹ نہیں ہوتا اس کو پالیسی کہتے ہیں۔ اس قسم کا جھوٹ تو مسیح ناصری نے بھی بولا ہے اور پولوس نے بھی بولا ہے۔

جج نے کہا کہ

''میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ کس کس نے جھوٹ بولا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ نے جھوٹ بولا تھا کہ نہیں؟''

مولوی صاحب نے کہا کہ جناب زیادہ سے زیادہ وہ مجھے کاذب کہہ سکتے تھے مگر مجھے کذاب (بہت بڑا جھوٹا) کہا گیا ہے۔

تو سیشن جج نے کہا کہ

''اچھا آپ کے خیال میں چھوٹے اُلو اور بڑے اُلو میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

اس پر مولوی صاحب نادم ہو کر چپ ہو گئے اور جج نے ان کا جرمانہ ۵۰ روپے قائم رکھا تھا۔

دیکھو وہ بھیں کا شخص کرم دین ہے جس کا نام
لڑنے میں جس نے نیند بھی اپنے پہ کی حرام
جس کی مدد کے واسطے لوگوں میں جوش تھا
جسکا ہر ایک دشمن حق عیب پوش تھا
جس کا رفیق ہو گیا ہر ظالم و غوی
جس کی مدد کے واسطے آئے تھے مولوی
ان میں سے ایسے تھے کہ جو بڑھ بڑھ کے آتے تھے
اپنا بیاں لکھانے میں کرتب دکھاتے تھے
ہشیاری مستغیث بھی اپنی دکھاتا تھا

سو سو خلافِ واقعہ باتیں بناتا تھا
پر اپنے بد عمل کی سزا وہ پا گیا
ساتھ اسکے یہ کہ نام بھی کاذب رکھا گیا
کذاب نام اسکا دفاتر میں رہ گیا
چالاکیوں کا فخر جو رکھتا تھا بہ گیا

(درثمین اردو)

۳۔۱۹۳۴ء۔۱۹۳۵ء میں عالی جناب ملک صاحب خاں نون صاحب احمدی چکوال میں ایس۔ڈی۔او تھے۔اور راقم الحروف ملک صاحب کا سٹینوگرافر تھا۔دورہ کرتے ہوئے ایک دن ہمارا مقام ڈومن میں تھا جو جہلم چکوال روڈ پر ایک مشہور تھانہ ہے۔وہاں سے ہم نے اگلے دن موضع بھیں میں جانا تھا۔

مجھے بڑا ہی شوق تھا کہ وہاں پر مولوی کرم دین سلسلہ احمدیہ کے مشہور معاند کو دیکھوں گا۔۱۷ فروری ۳۵ء کا دن تھا۔۱۲ بجے دوپہر کو جب عدالتی کام ختم ہو گیا تو میں نے جناب ملک صاحب موصوف سے اجازت چاہی کہ ابھی بھیں چلا جاؤں۔وہ فرمانے لگے کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ کرم دین تمہارے ساتھ وہاں پر کوئی شرارت نہ کرے۔بہتر یہ ہے کہ تم ابھی نہ جاؤ صبح میرے ساتھ ہی چلنا۔مگر میرے بے حد اصرار پر اجازت مل گئی (میرے ہمراہ برادرم مکرم ملک فتح محمدؐ صاحب ساکن توچھ ضلع جہلم حال کارکن تحریک جدید ربوہ) بھی تھے۔

۴۔دو بجے دوپہر کے قریب ہم دونو موضع بھیں میں پہنچ گئے۔پٹواری کو اپنی آمد سے اطلاع دے کر ہم مولوی صاحب کے مکان پر گئے۔مکان بہت اچھا اور نیا ہی تھا۔دروازہ پر جا کر میں نے دستک دی تو مولوی صاحب نے چوبارہ سے جھانکا اور کہا کہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ جناب مولوی صاحب نیچے تشریف لائیے۔دو مہمان دور سے آئے ہیں۔مولوی صاحب نیچے آئے اور ہم کو بجی سجائی بیٹھک میں بٹھا دیا۔میں نے اپنا اور ملک فتح محمدؐ صاحب کا تعارف کرایا اور کہا کہ ہمارے لئے آپ کی شخصیت تاریخی ہے اس لئے آپ کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔مولوی صاحب بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ میں ذرا آپ کے لئے چائے تیار کرنے کے لئے کہہ آؤں۔مگر میں نے ان کو روک دیا اور کہا کہ

''اگر حضرت نبی کریم ﷺ کا زمانہ ہوتا اور آپ حضور ﷺ کے ماننے والے ہوتے اور ابوجہل آپ کی دعوت کرتا تو آپ اس وقت کیا کرتے؟ افسوس ہے کہ ان حالات میں ہم آپ کی دعوت نہیں کھا سکتے۔''

اس پر مولوی صاحب خاموش ہو گئے۔کچھ وقفے کے بعد کہنے لگے کہ آپ کے سلسلہ سے تو میرے تعلقات بہت قدیمی ہیں۔جناب مرزا صاحب تو میرے مہربان تھے۔اس میں کیا حرج ہے؟ کچھ طنز کچھ تعلق کی باتیں کرنے لگے۔پھر پوچھنے لگے کہ ایس۔ڈی۔او صاحب کب آئیں گے؟ میں نے بتایا کہ کل صبح سویرے آئیں گے۔اور آپ

سے مل کر خوش ہونگے۔اس پر پھر ایک دفعہ مولوی صاحب پر سکوت طاری ہوا۔

۵۔ پھر مولوی صاحب اُٹھے اور ایک الماری سے جو کتب سے بھری ہوئی تھی ایک کتاب نکالی اور لا کر میرے ہاتھ میں تھمادی۔اس کا نام تھا ''تازیانۂ عبرت معروف بہ متنبّیء قادیاں قانونی شکنجہ میں''۔ میں نے اس کی یونہی ورق گردانی کر کے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ مولوی صاحب مجھے کہنے لگے کہ اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ جناب عالی مہمانوں سے کون قیمت لیا کرتا ہے؟ میں قیمت ادا نہیں کروں گا۔

۶۔ کچھ اور متفرق باتیں بھی ہوئیں جواب ۲۴ برس گزر جانے پر یاد نہیں اور ہم رخصت لے کر چلے آئے۔

۷۔ پٹوار خانے میں آکر ہم لیٹ گئے۔کھانے میں ابھی دیر تھی۔گاؤں کا میراثی پکار رہا تھا۔ چند اور آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ملک صاحب کی عدالت کا ایک اردلی جس کا نام فیروز خان تھا وہ بھی ہمارے بعد آگیا تھا۔ میں نے سردی کی وجہ سے اپنا کمبل اوڑھا ہوا تھا۔ میں نے میراثی سے پوچھا کہ بھئی تمہارے گاؤں میں جو مشہور مولوی کرم دین صاحب ہیں ان کی تو کچھ باتیں سناؤ۔سنا ہے کہ وہ بہت بزرگ آدمی ہیں۔وہ میراثی زیرِ لب ہنسا اور کہنے لگا کہ واہ کیا کہنے ہیں ہمارے مولوی صاحب کے۔مولوی صاحب کے متعلق یہ دو شعر آپ یاد رکھیں ؎

مولوی کرم دین بھیاں دا
نہ پتراں دا نہ دھیاں دا
نہ سُنّیاں دا نہ شیعّاں دا
صرف روپے دیہاں[۲۰] دا

اور ایک اور شخص جو وہیں بیٹھا تھا کہنے لگا کہ جناب ہمارے مولوی صاحب صرف جھوٹ بول لیا کرتے ہیں، نکاح پر نکاح پڑھ دیا کرتے ہیں...... باقی رہی بزرگی تو وہ تو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔[1]

اس کے بعد وہ لوگ آپس میں کچھ لوکل واقعات بیان کر کے ہنستے رہے جن میں مولوی کرم دین صاحب کی ذات ہی ہدف تھی، میں کچھ سمجھ نہ سکا۔[2]

۸۔ یہ کتاب جیسا کہ آگے چل کر عرض کروں گا سلسلہ کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔

۹۔اسی وقت پٹواری نے ملک صاحب سے عرض کیا کہ مولوی کرم دین صاحب آج تڑکے ہی گھوڑی پر سوار ہو کر چکوال کو چلے گئے ہیں۔

---

[1] میں عبدالرحمٰن شاکر خدا تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ میراثی اور دوسرے شخص کے الفاظ بالکل یہی تھے۔ میں نے اپنے پاس سے اس میں کچھ نہیں ملایا۔ یہ بالکل سچ ہے۔جھوٹے پر خدا کی لعنت ہو۔

[2] ۱۸ فروری ۳۵ء کی صبح کو جب ملک صاحب تشریف لائے تو ہنستے ہوئے مجھ سے فرمانے لگے کہ سناؤ زیارت ہوگئی؟ میں نے تمام حال عرض کیا اور کتاب بھی دکھائی۔جس کا نام پڑھتے ہی ملک صاحب نے مجھے واپس کردی اور خاموش ہوگئے۔

۱۰۔اس کے بعد ایک دن احاطہ عدالت میں مولوی کرم دین کو میں نے پہچان لیا اور گلہ کیا کہ اس دن آپ چکوال کو چلے آئے حالانکہ ملک صاحب بھی آپ کی زیارت کے خواہش مند تھے۔مولوی صاحب کہنے لگے واہ جی واہ! حاکمِ وقت احمدی تھا یونہی دل میں آجاتا اور مجھے قید کرسکتا تھا یا تا برخاستِ عدالت ہی بٹھا چھوڑتا! میں پہلے ہی کھسک آیا تھا۔ پھر مجھے کہنے لگے وہ ڈیڑھ ۸؍ روپیہ کتاب کی قیمت ادا کرو۔ میں نے مذاقاً کہا آؤ ملک صاحب کے سامنے چل کر ادا کردیتا ہوں (اس پر مولوی صاحب بھی ہنسنے لگے اور میں بھی ہنستا رہا۔)

۱۱۔اب اس کتاب نے کیا کام دیا۔اس کی داستان بھی سنیئے۔

مئی ۳۵ء میں جناب ملک صاحب بطور ڈپٹی کمشنر مظفر گڑھ تبدیل ہو گئے اور بندہ وہاں سے فارغ ہو کر قادیاں آ گیا اور صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت میں منسلک ہو گیا۔۱۹۳۶ء میں نظارت تعلیم وتربیت میں کام کرتا تھا میں نے یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ناظر تعلیم وتربیت کی خدمت میں ایک سکیم پیش کی کہ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش پر سوسال گذر چکا ہے لہٰذا حضور علیہ السلام کی صد سالہ جوبلی منائی جائے حضرت میاں صاحب نے فرمایا کہ ابھی تو حضرت اقدسؑ کی پیدائش کی صحیح تاریخ کی بھی تعین نہیں ہوئی۔ اس سکیم پر غور کیا جائے گا اور خوشنودی کا اظہار فرمایا کہ تم نے ادھر توجہ دلائی ہے۔

ساتھ ہی مجھے فرمایا کہ حکیم غلام حسن صاحب لائبریرین سے کہہ دوں کہ حضرت اقدسؑ کی پیدائش سے متعلق ضروری حوالے اور کتب وغیرہ پیش کریں۔

۱۲۔آخر کار حضرت میاں صاحب نے حضرت اقدسؑ کی صحیح تاریخ پیدائش متعین کردی جو ۱۳؍فروری ۱۸۳۵ء ہے۔

۱۳۔صد سالہ جوبلی کی سکیم پر غور ہوا اور وہ ترمیم ہو کر ۲۵ سال خلافت جوبلی میں تبدیل ہوئی۔

۱۴۔میرے تجویز کردہ پروگرام میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے تمام مقدمات کی اصل مسل کی نقول یا حضورؑ کے اصل بیان بطور ریکارڈ محفوظ کر لئے جائیں۔ چنانچہ حضرت صاحبزادہ صاحب نے یہ اہم کام مکرم محترم قریشی ضیاء الدین احمد صاحب ایڈووکیٹ کے سپرد کیا۔ جوانہوں نے بڑے احسن طریق پر اور محنت اور محبت سے سرانجام دیا۔ مگر مقدمہ انکم ٹیکس کی مسل کہیں سے بھی دستیاب نہ ہوسکی۔ کیونکہ عرصہ ہوا وہ محکمہ والوں نے غیر ضروری سمجھ کر تلف کردی ہوئی تھی

۱۵۔جس وقت قریشی صاحب موصوف یہ بات حضرت میاں صاحب کی خدمت میں عرض کررہے تھے کہ وہ مسل تلف ہو چکی ہے۔ میں حضرت میاں صاحب کی خدمت میں دفتر کی ڈاک پیش کر رہا تھا۔ میں نے جو یہ سنا کہ انکم ٹیکس والے مقدمہ کی مسل نہیں ملتی تو میں نے عرض کیا کہ وہ مسل مولوی کرم دین نے اپنی ایک کتاب تازیانہ عبرت میں نقل کی ہوئی ہے۔ حضرت میاں صاحب فرمانے لگے۔ جاؤ ابھی لاؤ۔ کتاب لائی گئی۔ دیکھا تو وہی چیز جس کی

قریشی صاحب کو اس قدر تلاش تھی بجنسہٖ اس میں موجود تھی اور ہماری گم شدہ کڑی مل گئی۔

۱۶۔قریشی صاحب نے وہ کتاب مجھ سے لے لی تا کہ اصل بیان حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلیفہ اولؓ کا نقل کر سکیں۔کافی عرصہ تک وہ کتاب قریشی صاحب کے پاس ہی رہی جب تقسیم ملکی کے وقت ہم بورڈنگ ہاؤس میں قید تھے تو اس وقت میں نے وہ کتاب ان سے لی جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔جو چاہے دیکھ سکتا ہے۔

۱۷۔کچھ عرصہ بعد چکوال میں (غالباً ۱۹۳۸ء۔۱۹۴۱ء میں) مسٹر کے۔سی چوہدری آئی۔سی۔ایس لاہور کے ایک قابل ہندو نوجوان ایس۔ڈی۔او مقرر ہوئے۔ان کی اہلیہ میڈیکل کالج لاہور کے ایک پروفیسر کی بیٹی تھی۔دونو میاں بیوی سرکاری دورہ پر ڈوہمن گئے۔گرمیوں کے دن تھے رات کو سرکاری ڈاک بنگلہ کے لان میں سوئے ہوئے تھے کہ کسی نے مسٹر چوہدری کو پستول سے ہلاک کر دیا۔تھانہ ڈوہمن چند قدم کے فاصلے پر ہے۔لوگ بھاگے آئے مگر قاتلوں کا کوئی نشان نہ ملا۔ڈوہمن کے اردگرد تمام Broken Land ہے یعنی زمین کٹی پھٹی ہے۔بڑی آسانی سے انسان وہاں چھپ سکتا ہے۔پولیس نے ہر چند کوشش کی مگر قاتلوں کا سراغ اس وقت نہ ہی لگا۔تقریباً ۲ سال کے بعد پولیس نے سراغ نکالا کہ قاتلوں میں سے ایک تو مولوی کرم دین صاحب ساکن بھیں کا بیٹا جس کا نام منظور احمد تھا اور دوسرا عبدلعزیز آف چکوال ہے مگر وہ روپوش ہو کر بنوں سے پرے قبائلی علاقہ میں رہائش پذیر تھے۔ایک دن وہ دونو اپنے کسی مقصد کے لئے بنوں شہر میں آئے تو پولیس نے ان کو چیلنج کیا۔انہوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں دیکھ کر پولیس پر گولی چلا دی مگر جوابی فائرنگ سے وہیں بازار میں ہی ڈھیر ہو کر رہ گئے۔یوں مولوی کرم دین کا گھرانہ تباہ و برباد ہوا۔

(غالباً) ۱۹۴۴ء میں مولوی کرم دین صاحب حافظ آباد میں مقیم تھے۔آنکھوں کی بینائی تقریباً جا چکی تھی۔رات کو جو کہیں اٹھے تو منڈیر سے لڑکھڑا کر نیچے گرے اور زخمی ہو کر بخواے آیت کریمہ اِنَّ اِلَیۡنَاۤ اِیَابَہُمۡ ۔ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا حِسَابَہُمۡ اپنی گستاخیوں اور بداعمالیوں کی جوابدہی کے لئے حاضرِ حضور ہو گئے۔فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(ماہنامہ مصباح اکتوبر ۱۹۵۹ء)

بابا فضلی

نام تو اُن کا عبدالکریم تھا مگر فضل کریم مشہور تھے اور بابا فضلی کے نام سے چھوٹوں بڑوں میں مقبول تھے۔ بابا اُن کو اس واسطے کہتے تھے کہ عمر رسیدہ بزرگ صحابی (حضرت مسیح موعود علیہ السلام) تھے اور سر داڑھی میں مہندی لگاتے تھے وگرنہ درحقیقت وہ نوجوانوں سے بھی زیادہ چست و چالاک اور تنومند تھے۔ قد بمشکل پانچ فٹ ہوگا آنکھوں میں ایک خاص چمک اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔

۱۹۱۹ء میں جب میں نے ان کو دیکھا تو وہ حضرت بابا اُروڑا صاحب کے ساتھ والی کوٹھڑی میں رہا کرتے تھے کھانا وہ لنگر خانہ سے کھایا کرتے تھے جو اُن دنوں ایک یا ڈیڑھ روپیہ ماہوار میں میّسر آجاتا تھا مگر تاہم سبز چائے کی دیگچی ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ سردیوں میں اپنے کمرے کے اندر فرش پر سورہتے اور گرمیوں میں مسجد اقصیٰ میں سویا کرتے تھے۔ بابا فضلی بڑے جہاں دیدہ آدمی تھے۔ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانیؓ ان کو 'لال تاجر' کہا کرتے تھے۔ یعنی ایسا تاجر جو حالات کے مطابق مختلف قسم کی تجارت کرے۔ مثلاً کبھی آم اچھے نظر آگئے تو مال خرید لیا۔ پیٹ بھر کر خود بھی کھائے کچھ چھوٹے بچوں میں تقسیم کردیئے اور باقی فروخت کر کے شام کو فارغ۔ کچھ نہ کچھ ضرور کما لیتے تھے۔ کبھی جُوتوں کی تجارت کرلی۔ کبھی کپڑا فروخت کرلیا اور پھر کبھی عطر بیچنا شروع کردیا کیونکہ بقول حضرت عمرؓ اس میں نفع ہی نفع ہے۔ کچھ عرصہ حضرت نواب محمد علی خاں صاحب کے ہاں بھی ملازمت اختیار کرلی۔ الغرض جس طرح کام بنتا بنا لیتے۔

بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کو چائے پلاتے کبھی کبھی موج میں آتے تو چینی کی سات آٹھ پیالیاں ایک قطار میں رکھ کر ایک لکڑی سے اُن کو اس طرح بجاتے کہ جلترنگ کا مزہ آجاتا ویسے بھی خدا نے اُن کو لحنِ داؤدی عطا کیا تھا۔ نہایت اچھا گاتے تھے مگر ہمیشہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا اُردو اور فارسی کلام سُناتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دن گرمیوں میں مسجد مبارک کے اُوپر عشاء کی نماز کیلئے بیٹھے تھے۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی کہ بابا فضلی نے حضرت صاحب کی برکات الدعا والی فارسی نظم۔

روئے دلبر از طلب گاراں نمی دارد حجاب

(یعنی محبوب کا چہرہ چاہنے والوں سے مخفی نہیں رہتا) پڑھنی شروع کردی۔ جو سمجھتے تھے اُن کا حال نہ پوچھئے اور جو فارسی نہ سمجھتے وہ ان کی سریلی آواز پر سر دُھنتے تھے۔ جونہی حضرت خلیفۃ المسیح نماز کیلئے تشریف لائے تو بابا فضلی نے جھٹ گانا بند کردیا۔

ایک دفعہ گرمی کے موسم میں جمعہ پڑھ کر جو آئے تو درزی خانہ قادیان کے قریبی کنوئیں کا 'بوکا' ندارد۔ بوکا رسّی

سمیت کنوئیں میں گر گیا تھا۔اتنے میں بابا فضلی آگئے جتنے لوگ کھڑے تھے اُن کو دیکھ کر کہنے لگے ''باباجی ذرا بوکا تو نکال دیں''۔یہ ہنس کر کہنے لگے ''تمہیں شرم نہیں آتی کہ بڑھے کو کنوئیں میں دھکیلنا چاہتے ہو! پھر کپڑے اُتار کر کنوئیں کے اندر اُترے اور چند منٹ میں بوکا اور رسّی نکال لائے۔لوگوں نے اُوپر نکالنا چاہا تو کہا ''ٹھہرو اور مال بھی ہے۔'' پھر غوطہ مار کر مختلف برتن جو لوگوں کے کنوئیں کے اندر گرے پڑے تھے سب نکال لائے۔غرضیکہ بڑی ہمت والے تھے۔تیراک غضب کے تھے برسات کے موسم میں جب ڈھاب پانی سے بھر جاتی تو گھنٹوں تیرتے رہتے۔کبھی کبھی درمیانی جزیروں پر کھڑے ہو کر گانے لگ جاتے۔اگر سلسلہ کے کسی بزرگ کو دُور سے دیکھ لیتے تو گانا بند کر کے غوطہ مار دُور جا نکلتے تھے۔

اُن دنوں مسجد مبارک قادیان میں ظہر کی نماز کے بعد حضرت قاضی امیر حسین صاحبؓ کا درس حدیث شریف بڑی پاکیزہ مجلس ہوتی تھی۔لوگ قادیان کے چاروں کونوں سے شریک ہوتے تھے۔ایک شخص حدیث کے الفاظ پڑھتا اور قاضی صاحبؓ بعد میں اسکی مناسب تشریح فرماتے۔کسی نے سوال کرنا ہوتا تو ساتھ ہی اس کو بھی جواب دے کر مطمئن کر دیتے۔بابا فضلی بھی اس مجلس کے خاموش شامل ہونے والوں میں سے تھے۔خاکسار بھی عرصہ تک اس مجلس میں شریک ہوتا رہا۔اب وہ پاکیزہ مجالس اور وہ درویشانہ چہرے یاد آتے ہیں تو دل کے اندر سے اک ہُوک نکلتی ہے۔

بابا فضلی جموں کے علاقہ کے رہنے والے تھے مگر عمر کا کافی حصہ سیالکوٹ میں بسر کیا اور پھر آخر عمر میں قادیان آگئے تھے اور اب بہشتی مقبرہ قادیان میں ہی ہمیشہ کے لئے آرام فرما ہیں ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(رسالہ تشحیذ الاذہان اپریل ۱۹۷۴ء)

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی نے نہایت ہی غربت میں پرورش پائی ۔ درگاہِ حضرت خواجہ نظام الدین صاحب دہلوی میں جوتیوں کی حفاظت کیا کرتے تھے ۔ مگر رفتہ رفتہ قلم سنبھالا ۔ تو لوگ ان کی تحریروں کے قائل ہو گئے ۔ ۱۹۱۱ء مین جب جارج پنجم نے دربار کیا ۔ تو اپنی تصنیفات کا گٹھڑ سر پر اُٹھا کر مختلف کیمپوں میں لے جاتے اور فروخت کرتے تھے ۔ لوگ پوچھتے کہ حسن نظامی کہاں رہتا ہے تو کہتے کہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے ۔

آپ حضرت خواجہ نظام الدین صاحب کی خواہر کی اولاد میں سے تھے ۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ایک بلند مرتبت ۔ صاحب اجازت صُوفی تھے ۔ اور ساتھ ہی نہایت اعلیٰ درجے کے اہلِ قلم ۔ خطیب ۔ صحافی ۔ اور بے شمار علمی اور ادبی کُتب کے مصنف بھی ، آپ کے مریدوں کی تعداد ہزاروں میں تھی ۔ جس میں ہر طبقے کے لوگ پائے جاتے تھے ۔ گورنمنٹ برطانیہ میں بھی اُن کا خاصہ رسوخ تھا ۔ نظام حیدر آباد اور اکثر نوابوں ۔ مہاراجوں سے اُن کے گہرے مراسم تھے ۔

آپ نے کئی رسائل مختلف وقتوں میں نکالے ۔ جن میں سے ''نظام المشائخ'' اور ''منادی'' بہت مشہور ہوئے ۔ منادی میں خواجہ صاحب کی ڈائری قابلِ مطالعہ چیز تھی ۔ اب اس کو ان کے بڑے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی چلاتے ہیں ۔

آپ کی مشہور تصنیفات میں ''بہادر شاہ کا مقدمہ'' ۔ ''بیگمات کے آنسو'' ۔ ''سات روحوں کے اعمال نامے'' ۔ ''نظامی بنسری'' ۔ ''محرم نامہ'' ۔ ''دہلی کی آخری شمع'' ۔ ''دہلی کی جانکنی'' وغیرہ بہت مشہور ہیں ۔

خواجہ صاحب کی طبیعت میں جدت بہت تھی ۔ ان کا تتبع کرنے والا ابھی تک کوئی پیدا نہیں ہوا ۔ بات ہی سے بات نکال کر ایسے فقرے چُست کر جاتے تھے کہ حیرانی ہوتی تھی ۔

ہر عید کے موقع پر خواجہ صاحب ، شرفاءِ شہر ، عمائدین حکومت اور سرکاری حکام کو اپنے ہاں بلواتے اور ان کی خاطر تواضع فرماتے حتیٰ کہ حضرت قائداعظم بھی جایا کرتے ۔ اور اہل دہلی کی طرح زمین پر آلتی پالتی مار کر کھانا بھی کھایا کرتے تھے ۔

۱۹۵۰ء میں ایک دفعہ خواجہ صاحب پاکستان بھی آئے ۔ جب قائداعظم کے مزار پر حاضر ہوئے تو ان کے مشہور مرید کشفی شاہ صاحب نظامی (ایس ۔ ایم ظفر صاحب سابق وزیر خارجہ پاکستان کے والد) بھی ہمراہ تھے ۔ فاتحہ خوانی کے وقت خواجہ صاحب زار زار روتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اور دیر تک یہی عالم رہا ۔ خواجہ صاحب مسلمانوں کے دل سے بہی خواہ تھے اور اتحاد بین المسلمین کے بہت قائل تھے ۔ نیز آپ نے مسلمانوں کو تجارت کی طرف لگانے میں بہت کام کیا ہے ۔

خاکسار راقم الحروف کو ۱۹۳۴ء میں دہلی میں متعدد بار خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ ان دنوں میں رسالہ ''پیشوا'' دہلی میں ملازم تھا۔ ایک دن خواجہ صاحب تشریف فرما تھے تو میں نے ایک کارڈ اردو میں لکھا۔ اور اس کا پتہ انگریزی میں لکھ مارا۔ خواجہ صاحب نے مجھے فرمایا ''میاں۔ آپ نے یہ کیا کیا؟ اچھا بھلا اردو لکھتے لکھتے یہ سطر انگریزی کا پیوند لگا دیا؟'' فرماتے تھے کہ ڈاک خانے والوں کو مجبور کرو کہ وہ اردو پڑھیں۔ میں سمجھ گیا اور آئندہ کے لئے کان ہوئے۔

جب ۷ راگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم کراچی کو روانہ ہوئے تو پالم ائرپورٹ پر قائداعظم کو الوداع کہنے والوں میں خواجہ صاحب پیش پیش تھے۔ قائداعظم نے اس وقت فرمایا۔ خواجہ صاحب! آپ پاکستان آجائیں۔ آپ نے جواب دیا کہ آتو جاتا۔ مگر حضرت محبوب الٰہی جانے نہیں دیتے۔ یہ کہہ کر پُرنم آنکھوں سے پاکستان کے آئندہ ہونے والے گورنر جنرل کو رخصت فرمایا۔ اکبرالہ آبادی نے تو بہت پہلے سے لکھ دیا تھا کہ

حضرت ابو ہریرہ سے بلی نہ چھٹ سکی
خواجہ حسن نظامی سے دلی نہ چھٹ سکی

آپ نے ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو دہلی میں وفات پائی۔ اور درگاہ شریف میں دفن ہوئے۔

(رسالہ لاہور ۲۸ راگست ۱۹۷۷ء)

مہاراجہ نابھہ کی فراست

تاریخ احمدیت کا ایک خوبصورت باب

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ہی مغلیہ حکومت میں زوال سلطنت کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔رفتہ رفتہ سکھ قوم نے اپنا تسلط قائم کرنا شروع کیا اوران پر سکھوں کو مسلط کر دیا۔جلد ہی یہ قوم ایک طاقت بنکر اُبھرنے لگی حتیٰ کہ رنجیت سنگھ (۱۷۸۰۔۱۸۳۹) نے پنجاب میں ایک باقاعدہ حکومت بنالی۔جب ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو وہ فوت ہو گیا تو اُس کے جانشینوں کی آپس میں ہی خوب جُوت پیزار ہوئی تا آنکہ انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کر کے سکھوں کے زور کو توڑا۔اُس وقت یہ لوگ بارہ مثلوں میں بٹ گئے۔اِس زمانہ کو سکھا شاہی کہتے ہیں۔

انگریزوں کی آمد سے کچھ سکون ہوا اور چار ریاستیں بن گئیں یعنی پٹیالہ،نابھہ،کپورتھلہ اور جیند اور ۱۹۴۷ء کی ملکی تقسیم کے بعد وہ بھی ختم ہو گئیں۔

۱۸۷۱ء میں نابھہ کے راجہ صاحب کا نام ہیرا سنگھ تھا۔یہ بہت شریف طبع اور نیک سیرت تھے گو خود سکھ تھے مگر دوسرے دو مذاہب کے لوگوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی قدر کرتے تھے۔

ایک دفعہ دربار کے موقعہ پر جبکہ تینوں فرقوں کے نمبردار حاضر تھے۔میاں کریم بخش صاحب نمبردار موضع رائے پور کو بلوایا اور فرمایا کہ میاں کریم بخش یہ جو اس وقت تینوں فرقوں کے تقریباً بارہ سولوگ جمع ہیں ان میں سے مجھے تمہارے اخلاق کیوں پسند ہیں؟ انہوں نے عرض کیا مجھے تو اپنے اندر ایسی کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔تاہم یہ ضرور ہے کہ میں حضرت مرزا غلام احمد صاحب کا مرید ہوں۔اور وہ چونکہ اس زمانہ کے اوتار یا گرو ہیں ان کی صحبت میں رہ کر میں یہ فیض حاصل کرتا ہوں۔

مہاراجہ صاحب نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ تھوڑی دیر ٹھہرو میں ابھی آیا اور میاں کریم بخش صاحب کو ہمراہ لیکر محل کے اندر چلے گئے۔فرمایا ”یہ جو تصویریں اس کمرہ میں لگی ہوئی ہیں ان کی طرف دیکھو وہ ساری تصویریں گوروؤں کی تھیں۔جس طرح اور گوروؤں کی تصاویر سنہری چوکٹھوں میں لگی ہوئی تھیں۔حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی قد آدم تصویر بھی سنہری چوکٹھے میں لگی ہوئی تھی اور فرمایا دیکھو میاں کریم بخش یہ تصویر پہلے سے ہمارے پاس موجود ہے“۔

پھر مسند پر بیٹھ گئے اور چوبدار کو باہر بھجوا دیا اور فرمایا کہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب کو میری طرف سے درخواست کرو اور حضور کو ہمراہ لیکر یہاں آؤ۔ان کے آمدورفت کے تمام اخراجات میں برداشت کرونگا۔میں ضعیف العمر ہوں وہاں نہیں جاسکتا۔میاں کریم بخش صاحب قادیان گئے اور مہاراجہ صاحب کی طرف سے درخواست بھی کردی۔حضرت اقدس نے فرمایا:۔

''اُن سے جا کر عرض کردیں کہ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا بلکہ پیاسا خود کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔''

چوہدری کریم بخش صاحب نے راجہ صاحب کی خدمت میں حضرت صاحب کا یہ جواب عرض کردیا تو راجہ صاحب نے کہا کہ ''اگر ہم وہاں جائیں تو یہ انگریز ہم کو فوراً گدی سے اُتار دینگے''۔

مہاراجہ ہیرا سنگھ نے ۲۵ دسمبر ۱۹۱۱ء کو وفات پائی اور انکے جانشین اُن کے بیٹے مہاراجہ رُپ دمن سنگھ گدی نشین ہوئے۔ یہ صاحب انگریزوں سے سخت متنفر تھے۔ ان کا کچھ بس نہ چلتا تھا ورنہ وہ آزاد ہونا پسند کرتے تھے۔

اپنے والد کی حیات میں ٹکا صاحب رُپ دمن سنگھ نے ایک دفعہ ایک لڑکے کو دُونی (دو آنے) انعام دیا اور یہ بات مہاراجہ ہیرا سنگھ تک پہنچ گئی تو اُن کو بہت تکلیف ہوئی اور اُن کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔

''یہ ٹکہ صاحب اگر نابھہ کی گدی پر بیٹھے تو اپنی کنجوسی کے باعث گدی پر نہ رہ سکیں گے۔''

مہاراجہ رُپ دمن سنگھ نے گدی پر بیٹھتے ہی اپنے گرد کچھ ایسے لوگ جمع کر لئے جو انگریز ریذیڈنٹ کو پسند نہ تھے۔ اُن میں سے ایک سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ہفت روزہ اخبار ''ریاست'' بھی تھے۔ ریذیڈنٹ کے اشارے سے ان کو بھی وہاں سے نکال دیا گیا۔

اُدھر ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے تمام ہندوستان میں ترک موالات کا پرچار شروع کیا۔ کاریں۔ ولائتی کپڑے اور تمام اشیاء جو انگلستان سے درآمد کی جاتی تھیں لوگوں کو استعمال کرنے سے منع کردیا۔ مگر یہ سکیم جلد ہی ختم ہوگئی وائسرائے کے حکم سے گاندھی جی کو قید کردیا گیا اور اب کوئی لیڈر ایسا نہ تھا جو اس کو چلائے۔ نہ کوئی پروگرام تھا۔ اس زمانہ میں سکھ گایا کرتے تھے ؎

آپی گاندھی قید ہو گیا

سانوں دے گیا کھدر دا بانا

یعنی خود گاندھی قید ہوگیا ہے اور ہم کو کھدر کا لباس دے گیا ہے۔ ایسے حالات میں مہاراجہ رُپ دمن سنگھ نے اخبارات میں ایک مضمون لکھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی عوام کے ہم نوا ہیں یہ باتیں ریذیڈنٹ کو بہت بُری لگیں اور اُس نے مہاراجہ صاحب کے خلاف جی بھر کر رپورٹ کردی۔ مختلف مراحل سے ہوکر نتیجہ یہ نکلا کہ مہاراجہ صاحب کو نابھہ سے نکال دیا گیا۔ میسوری میں نظر بند کردیا گیا۔ وہاں انہوں نے اپنے پرانے دوستوں سے ملنا شروع کردیا اور حالات بدتر ہوگئے تو حکم ملا کہ مہاراجہ صاحب کو فوراً کوڈے کنال ریاست میسور جنوبی ہند میں بھجوا دیا جائے اور رانی صاحبہ اور بچے ہمراہ نہیں رکھ سکیں گے۔ ۱۹۲۸ء میں وہیں انتقال ہوا۔

یہ نوٹ لکھنے کیلئے دیوان سنگھ مفتون کی کتاب ''ناقابل فراموش''

۲۔ ''ہنگاموں میں زندگی'' از مشتاق احمد وجدی صفحہ ۳۲۔ اور

۳۔ رپورٹ شاہی دربار ۱۹۱۱ء اور میرے اپنے چشم دید حالات سے مدد لی ہے۔

(الفضل 21 فروری 1989ء)

بہادر شاہ ظفر

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

جو عظیم مسلمان سلطنت بابر سے شروع ہوئی۔ وہ آخر کار ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر پر ختم ہوئی۔ یوں تو مغل سلطنت شہنشاہ اورنگزیب کے بعد ہی تیزی سے زوال کی طرف جارہی تھی اسے شاہ عالم ثانی نے لارڈ کلائیو کو دیوانی عطاء کر کے زوال کی رفتار کو تیز کر دیا تھا۔

بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۶ء میں تخت نشین ہوئے تو انگریز جنرل نے ملاقات کے لئے یہ شرط پیش کی کہ ہم بادشاہ کی خدمت میں حسبِ سابق دستور کے مطابق نذر پیش نہ کریں گے حالانکہ آج تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام ملازمین بادشاہ دہلی کو نذر پیش کرنے کے پابند تھے۔ مجبوراً بادشاہ نے یہ شرط مان لی۔

ساٹھ سال کی عمر میں ابوظفر بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے تو انگریزوں نے ان کو صاف صاف سمجھا دیا کہ ان کے بعد ان کے خاندان میں سے کوئی تخت نشین نہ ہوگا اور اس بادشاہت کا خاتمہ سمجھیں۔ نیز آپ کے بعد آپ کی اولاد کو لال قلعہ خالی کرنا ہوگا۔ عملاً بادشاہ کی حکومت صرف لال قلعہ کے اندر تک محدود تھی۔ قلعہ میں ہر قسم کے فسق وفجور کا بازار گرم تھا۔ جگہ جگہ شہزادے لہوولعب میں غرق نظر آتے تھے۔ مُجرے ہوتے تھے۔ تانیں اُڑتی تھیں اور عیاشی کے اڈے قائم تھے۔ استاد ذوق نے کہا تھا کہ

جن کو اسلام کا اس وقت میں دعویٰ ہے کمال
دیکھتا ہوں میں اسے ذوق یہ ان کا احوال
جس طرح سے کہ ہنسا دینے کو بے دینوں کے
نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال [1]

---

[1] جب بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے تو استاد ذوق نے بڑے معرکے کا قصیدہ لکھا۔

روکش ترے رخ سے ہوا نورِ سحر رنگ شفق
ہے ذرہ تیرے نور کا نورِ سحر رنگ شفق

تو بادشاہ نے استاد سے دریافت کیا کہ جب ہم گذر جائیں گے تو کیا ہمارے جانشین کی تعریف بھی یونہی لکھو گے؟ استاد نے جواب دیا۔ ''حضور جب خیمہ گرتا ہے تو طنابیں پہلے ہی گر جاتی ہیں اس وقت ہم کہاں ہوں گے؟ بادشاہ کے سامنے استاد ذوق فوت ہوئے تو بہادر شاہ نے خود تاریخ وفات کہی۔

ویسے سراج الدین ظفر بہادر شاہ ثانی ذاتی طور پر نیک نمازی۔ تہجد گذار غریب پرور سخاوت کا بادل اور بہت معقول آدمی تھے مگر قلعہ کی اصل حالت سے اہلِ غرض انہیں بالکل بیخبر رکھتے تھے۔ اوپر سے آزادی کی لہر نے رہی سہی کسر نکال دی۔ غدر کے ہنگامے میں ہندو فوج اور ان کے مسلمان کمانڈر جنرل بخت خان نے اور کام بگاڑ دیا۔ انگریزوں کو قتل کرنے لگے۔ ان کے بنگلے لوٹ لئے گئے۔ خود بادشاہ کے سمدھی حکیم الٰہی بخش انگریزوں کے جاسوس ثابت ہوئے۔ اسی نے بادشاہ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ قلعہ سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں پناہ لیں اور ساتھ ہی میجر ہڈسن سے کہہ دیا کہ بادشاہ تو وہاں پر ہے۔ بادشاہ اگر ذرا ہمت کرتا تو وہاں سے بھاگ کر جان بچا سکتا تھا مگر میجر ہڈسن نے آن پکڑا۔ کسی نے بعد میں پوچھا کہ آپ بھاگ کیوں نہ گئے تو جواب دیا کہ ''جوتا پہنانے والا کوئی نہ تھا''۔

میجر ہڈسن نے بادشاہ کو تو جان بخشی کا وعدہ دے دیا مگر لڑکے اور پوتے سات اشخاص کو کوٹلہ فیروز شاہ کے متصل دہلی دروازے میں پستول سے ہلاک کر دیا اور ستم یہ کہ ان کا سر کاٹ کر طشت میں رکھ کر بادشاہ کے سامنے جا رکھے۔ بادشاہ نے دیکھ کر ایک سرد آہ بھری اور خاموش ہی رہ گئے۔ ہڈسن نے انہیں یہ بھی وعدہ دیا تھا کہ شہزادہ جواں بخت کو بھی امان دی جائے گی۔

کورٹ مارشل کے ماتحت لال قلعہ میں بادشاہ پر مقدمہ قائم ہوا۔ جب معتمد ہی خلاف گواہیاں دینے لگے تو بادشاہ کے بیان کی کیا وقعت ہو سکتی تھی۔ انگریزوں کو تو صرف بہانہ چاہیئے تھا کہ کسی طرح سلطنت کو ختم کریں فیصلہ ہوا کہ بادشاہ۔ ملکہ زینت محل۔ شہزادہ جواں بخت۔ اس کی بیوی۔ اس کی ایک بچی اور چند جان نثار ملازمین کو رنگون میں جلاوطن کیا جاتا ہے۔

ناظرین ذرا اس وقت کا تصور فرمائیں جب ۱۷/اکتوبر ۱۸۵۸ء بروز جمعہ بادشاہ بہادر شاہ ثانی ڈولی میں سوار ہو کر لال قلعہ سے نکلے۔ گوروں کا سخت پہرہ تھا۔ بادشاہ کی ڈولی کے پردے اُٹھا دیئے گئے تھے آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ سفید ڈاڑھی پر آنسو گر رہے تھے۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے ہوئے تھے۔ اور اس طرح جلاوطن بادشاہ دہلی کو خدا کے سپرد کر رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر گاڑی میں سوار ہو کر کلکتہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نواب سر محمد یامین خان میرٹھی اپنی ڈائری ''نامہ اعمال'' صفحہ ۱۳۳۷ پر لکھتے ہیں:۔

بقیہ حاشیہ:۔

شب	چار	شنبہ	بماہ	صفر
بحکم	خداوند	جاں	داد	ذوق
ظفر	روئے	اُردو	ناخن	زِغم
خراشید	و	فرمود	''استاد	ذوق''

استاد ذوق ۱۲۷۱ھ

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ قدیم شہر میں کلّو کے تکیہ میں ذوق کے مدفن کو بھارت سرکار نے ہموار کرا کر وہاں پر بیت الخلاء بنوا دیئے ہیں اور مسلمانوں کے احتجاج کی ذرا پرواہ کی۔

''بہادر شاہ ظفر کو فرسٹ کلاس کی ایک گاڑی میں دہلی سے کلکتہ بھجوایا گیا۔ وہ اصل گاڑی اجمیر کے ریلوے شیڈ میں موجود ہے۔''

کلکتہ میں پہلے ہی انگریزوں کے کشتۂ ستم واجد علی شاہ معزول شاہِ اودھ موجود تھے۔ انہوں نے شاہِ دہلی کے منصب اور بزرگی کا پورا پورا احساس کرکے درخواست کی کہ قدم بوسی کی اجازت دی جائے جو منظور ہوئی۔ دونوں بادشاہوں میں اس وقت کیا کیا باتیں ہوئیں اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ واجد علی شاہ نے باوجود انگریزوں کے اسیر ہونے کے بہادر شاہ ظفر کی خدمتِ میں کچھ تحائف پیش کئے مگر بیچارہ بہادر شاہ اس حالتِ اسیری میں کیا دیتا۔ اپنی تسبیح خاص عنایت کردی۔ انگریز گورنر جنرل نے بھی بہادر شاہ سے ملاقات کے لئے عرض کیا مگر غیور بادشاہ نے درخواست ٹھکرادی۔

رنگون میں زندگی کے دن جوں توں کرکے بسر ہوتے رہے۔ چھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر رہوا۔ اکثر اوقات یاد خدا۔ تسبیح وتہلیل۔ استغفار میں گذرتے تھے۔ وظیفہ میں سے ایک کثیر رقم صدقہ وخیرات

واجد علی شاہ نے جھک کر اکیس ۲۱ مرتبہ سلام کیا۔ دونوں دیر تک اشکبار رہے۔ برٹش حکام نے اس طریق سلام کو حیرت سے دیکھا۔

میں صرف ہوتی۔ جب بھی گزشتہ دنوں کی یاد۔ لال قلعہ کی شان وشوکت کی زندگی۔ عزیزوں اور رفیقوں کی کی یاد آتی ہوگی تو نہ جانے کیا کیا خیالات دل میں آتے ہوں گے اور خون کے آنسو بن کر نکلتے ہوں گے۔ رنگون میں یہاں تک حالت ہوگئی کہ ماش کی دال بھی ہضم ہونے لگی تھی۔

آخر کار غریب بہادر شاہ کے مصائب بھی ۷ نومبر ۱۸۶۳ء کو ختم ہوگئے ۔ ملکہ زینت محل ۲۳ برس بعد مورخہ ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو محلاتی عیش کا غم واندوہ سے کفارہ ادا کرکے بادشاہ کے پہلو میں دفن ہوئیں۔ اس سے دو سال قبل ۱۸۸۴ء میں شہزادہ جواں بخت بمقام مولمین فوت ہوچکا تھا۔ قبر کا نشان بھی نہیں ملتا۔

مفتی صدر الدین صاحب آزردہ جو صدر الصدور دہلی تھے نے بجا طور پر لکھا ہے:۔

ہوا اچھا جو مٹا نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

داغ دہلوی۔ ظہیر دہلوی اور بے شمار شاعروں نے دہلی کے مرثیے لکھے ہیں جو بیحد متاثر کرتے ہیں۔ مگر آخر کار خدا تعالیٰ کے رحم وکرم نے جوش مارا۔ انسان خود ہی خدا کے غضب کا مورد بن جاتا ہے مگر توبہ واستغفار کرنے سے رحمتِ الٰہی میں سے حصہ پاسکتا ہے یہی حال بہادر شاہ ظفر کا ہوا۔ اس قدر مصائب دیکھے۔ بچوں کے قتل پر صبر کیا۔ ذلت گوارا کی وطن سے جُدا ہوئے آخر کار خدا نے انہیں مغفرت کی چادر پہنائی۔

حضرت مولانا حکیم نورالدین خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے اپنی قلمی بیاض میں حسبِ ذیل واقعہ قلمِ خاص

سے نقل فرمایا ہے کہ:۔

''حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دربار میں علی محمد خواجہ ساکن وزیر آباد نے اپنا رؤیا عرض کیا کہ میں دیکھتا ہوں بہادر شاہ بادشاہِ دہلی قبر سے زندہ ہوگئے ہیں۔ پوچھا آپ تو مر گئے تھے آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ تو اس نے کہا کہ مجھ پر فضل ہوا۔''

حضرت بیدم وارثی نے سچ لکھا ہے کہ ؎

اس کی کیا شرم نہ ہو گی تجھے اے شانِ کرم
تیرا بندہ جو تیرے سامنے رسوا ہو جائے

اس مضمون کے ماخذ:۔(۱) تاریخ ہند (ذکاء اللہ) (۲) غدرِ دہلی کے افسانے (حسن نظامی) (۳) نامہء اعمال (نواب سر محمد یامین خان) (۴) بہادر شاہ ظفر کا عہد (رئیس احمد جعفری) (۵) بہادر شاہ کا مقدمہ (حسن نظامی)

(ماہنامہ خالد جون ۱۹۷۵ء)

ایک عبرت آموز سچّا واقعہ

مکرم چوہدری محمد ابراہیم صاحب ویئس کارکن نظارت بہشتی مقبرہ ربوہ نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا جو ہدیہ احباب کرتا ہوں ممکن ہے کوئی سعید روح اس سے فائدہ اُٹھائے۔

''جون ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے کہ موضع بھامبڑی نزد قادیان کا اک شخص نواب دین جو ہمارے رشتہ داروں میں سے تھا ایک ضروری کام کے لئے ہمارے گاؤں بھینی بانگر متصل قادیان آیا دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میرے چچا چوہدری الہٰ دین صاحب احمدی صحابی اسے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ آپ لوگ جو ہمارے رشتہ دار ہیں حضرت مرزا غلام احمدؑ صاحبؑ کے دعویٰ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ نواب دین کہنے لگا کہ مرزا صاحب ہمارے نزدیک جھوٹے ہیں۔ کم از کم ہمارے گاؤں بھامبڑی کے لوگ تو مرزا صاحب کو اِسی صورت میں سچا مان سکتے ہیں اگر آج سے تین دن کے اندر میری موت واقع ہو جائے۔ اِس شرط کے ساتھ کہ نہ تو مجھے بخار ہو، نہ مجھے کوئی درد اُٹھے اور نہ مجھ پر کوئی حملہ آور ہو۔

میرے چچا صاحب نے یہ قول سُن کر کہا کہ ہاں اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر ہے اور گفتگو ختم ہوئی اور تیسرے پہر وہ وہاں سے چلا گیا۔

تیسرے دن بھامبڑی سے ایک برات موضع تلونڈی جھنگلاں میں جانی تھی۔ وہ شخص نواب دین بھی براتی تھا۔ میرے والد صاحب مرحوم چوہدری کرم دین صاحب احمدی صحابی اور میں نے بھی اِسی برات میں شمولیت کرنی تھی۔ اتفاق کی بات کہ برات کا اکثر حصّہ تو آگے چلا گیا صرف میں اور میرے والد صاحب اور نواب دین مذکور اور ایک لڑکا عبدالرحمٰن گھوڑیوں پر سوار تمام برات سے پیچھے جا رہے تھے۔ جب ہم شہر قادیان سے گزر کر ناتھ پور (عیدگاہ کے قریب سکھوں کا گاؤں) پہنچے تو چند سکھ جو ہمارے واقف تھے، ملے اور پوچھا کہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟ والد صاحب نے بتایا کہ ہم برات میں شمولیت کے لئے تلونڈی جا رہے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ وہ دیکھو شمال مغرب کی طرف سے غبار سا اُٹھا ہوا ہے غالباً یہ آندھی ہے۔ بہتر ہوگا آپ کچھ دیر رک جائیں جب یہ طوفان گزر جائے تو آپ آگے روانہ ہوں، اتنا عرصہ آپ ہمارے پاس ٹھہریں مگر والد صاحب نے کہا کہ نہیں، ہم برات میں جلد شامل ہو جائیں گے۔

جس وقت ہم موضع رسول پور کے قریبی تھہ کے اوپر سے گزر کر تھہ اور نہر کے درمیان گئے تو ہمیں اک حادثہ پیش آیا۔

حادثہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو زمین پر پایا اور موٹر کی طرح آواز آئی جس سے میں اُٹھ بیٹھا لیکن مجھے یوں معلوم ہوا کہ آنکھوں میں بینائی نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد رفتہ رفتہ میری آنکھوں میں نور پیدا ہونے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میرے والد صاحب زمیں پر سیدھے لیٹے ہوئے ہیں۔ ہماری گھوڑی بھی زمین پر پڑی ہے مجھے کچھ سمجھ نہ آتا تھا

کہ ہم پر کیا گزری ہے۔

جب میں نے دوسری طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ تقریباً ۴۰ فٹ کے فاصلے پر نواب دین مذکور اوندھے مُنہ پڑا ہے۔ اُس کے بدن اور کپڑوں میں آگ لگی ہوئی ہے اور وہ جل رہا ہے۔ اس کے سینے میں شگاف ہے اور اس زخم میں سے سیاہ رنگ کا خون بہہ رہا ہے اَور تو اَور اس کی گھوڑی بھی آگ میں جل رہی ہے اور آگ کے شعلے بلند اُٹھ رہے ہیں۔

نواب دین کے پیچھے جولڑ کا عبدالرحمٰن بیٹھا تھا اس کی ٹانگیں اور بازو جل چکے تھے اور وہ تڑپ رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے سہارا دے کر اٹھایا اور جہاں میرے والد صاحب لیٹے ہوئے تھے لے آیا۔

مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ سب معاملہ آخر تھا کیا۔ وہ غبار جو کہ شمال مغرب کی طرف دکھائی دے رہا تھا اب بالکل ہمارے اوپر آ پہنچا اور چشم زدن میں بگولے کی صورت میں ہمارے سروں پر سے گزر گیا اور معاً بعد اولے گرنے شروع ہو گئے۔ میں نے فوراً اپنی گھوڑی پر سے کھیس اُتار کر اپنے والد صاحب کے اوپر پھیلا دیا تا کہ وہ بھیگ نہ جائیں اور اپنے تولیہ سے ان کے چہرے پر سایہ سا کر دیا کہ اولوں کی ضرب سے بچ جائیں۔ تھوڑی دیر میں اولے شدید بارش میں تبدیل ہو گئے جو متواتر تین گھنٹے تک برستی رہی۔ ہم بالکل بھیگ گئے۔ جائے واردات پر میں اور زخمی لڑکا غروبِ آفتاب تک بیٹھے رہے۔ ابھی سورج بالکل غروب نہ ہوا تھا کہ بادل چھٹ گیا اور مطلع صاف ہو گیا۔

اس وقت قریبی گاؤں رسول پور کے بعض سکھ ہمارے پاس آئے اور حال پوچھنے لگے۔ ان کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے اوپر آسمانی بجلی گری ہے۔ جس سے نواب دین تو اپنی مُنہ مانگی موت مر گیا اور اپنی ہی عاید کردہ شرطوں کے مطابق ہلاک ہوا مگر میرے والد صاحب، میں اور ہماری گھوڑی بجلی کے صدمہ سے ہی زمین پر گر گئے تھے۔ میں نے ہر چند والد صاحب کو آوازیں دیں مگر وہ نہ سنتے تھے اور نہ حرکت کرتے تھے۔ تب میں نے سمجھ لیا کہ وہ صدمہ سے سخت بے ہوش پڑے ہیں۔ ہماری گھوڑی صدمہ سے مر چکی تھی۔

غالباً ان تین پیدل آنیوالے براتیوں نے جو ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اور جن میں دولہا کا والد بھی تھا تلونڈی اور ہمارے گاؤں خبر پہنچائی۔ چنانچہ کچھ رات گئے ہمارے عزیز ایک چھکڑا لے کر آئے اور میرے والد صاحب اور نواب دین کو اس میں ڈال کر لے گئے۔ جب ہم گھر پہنچے تو آدھی رات کا عمل تھا۔

حضرت منشی سکندر علی رضی اللہ عنہ نے میرے والد صاحب کی نبض دیکھی اور فرمایا کہ میرے علم کی رُو سے چوہدری کرم دین ابھی زندہ ہیں۔ اس بات سے ہمیں بڑی تسلّی ہوئی اور یہ طے پایا کہ ان کو جلد تر قادیان لے چلیں۔ قادیان تو ہم لے آئے مگر اُس وقت کسی ڈاکٹر کا ملنا بڑا محال تھا۔ ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کے ہمراہ پہاڑ پر گئے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا کہ ڈاکٹر فضل کریم صاحب کو دکھا لیتے ہیں اُن کو دکھایا گیا۔ باہر

آئے۔ میرے والد صاحب کو بڑی توجہ سے دیکھا اور بڑے افسوس بھرے لہجے میں کہا کہ یہ تقریباً ایک گھنٹہ ہوا فوت ہو چکے ہیں اگر اس سے پہلے لے آتے تو ضرور سعی کرتا کہ بچ جائیں اب تو معاملہ ختم ہے۔ ع

پھیر دی ہے نگہِ یاس نے جھاڑو دل میں

اس سانحہ عظیمہ کے بعد میری تعلیم کا سلسلہ بند ہو گیا اور گھر کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر آن پڑا۔ اُدھر بھامبڑی والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کیا ہوا اگر ہمارا ایک آدمی گیا ان کا بھی تو ایک ساتھ ہی گیا ہے۔ اس بات سے مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا اور میں بہت سرگرداں رہتا کہ میرے والد تو بڑے نیک اور صحابی تھے یہ کیوں حادثہ کی نظر ہو گئے۔ آخر میں نے حضرت مولانا شیر علی صاحبؓ سے تمام واقعہ عرض کر کے دریافت کیا تو فرمایا کہ آپ کے چچا صاحب نے غالباً آپ کے والد صاحب کو اس گفتگو سے مطلع نہ کیا ہو گا ورنہ آپ کے والد صاحب ضرور ایسے شخص کی صحبت سے پرہیز کرتے اور اس کے ہمراہ ہرگز سفر نہ کرتے۔ ان کو علم ہی نہ تھا کہ اس شخص نے خود ہلاکت کی خواہش کی ہے ورنہ اس کی صحبت سے دُور رہتے۔ اس بات سے میری تسلی ہو گئی۔"

خاکسار راقم الحروف نے چوہدری محمدؐ ابراہیم سے یہ واقعہ سن کر کہا کہ آپ کے والد صاحب کے پیشِ نظر اگر یہ آیہ کریمہ لا ترکنو الی الّذین ظلمو افتمسکم النار ہوتی تو ان کو یہ حادثہ پیش نہ آتا اور یوں صدمہ نہ اُٹھانا پڑتا۔

بھامبڑی کے ذکر سے میرے ذہن میں ایک واقعہ آ گیا ہے وہ بھی سُن لیں۔ اِس گاؤں کے لوگوں کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ انہوں نے احمدیت کی دل کھول کر مخالفت کی جگہ نہ چھوڑی جائے۔ ہر ممکن کوشش کی کہ اپنے مُنہ کی پھونکوں سے اس نور کو بجھا دیں۔ ایک مرتبہ جماعت احمدیہ کے چند افراد نے ان لوگوں پر اتمام حجت کی غرض سے گاؤں میں جلسہ منعقد کر کے ان کو پیغامِ حق سنایا تو ان لوگوں نے خشت باری کر کے متعدد احمدیوں کو شدید زخمی کیا اور پولیس میں دعویٰ بھی کر دیا اور کافی عرصہ تک قادیان کے معززین کو ایک فوجداری مقدمہ میں ملوث رکھا۔ آخر کار یہ لوگ خائب و خاسر ہوئے اور تمام احمدی باعزت طور پر بَری ہوئے تھے۔

مگر خدا تعالیٰ نے ان کے لئے ذلّت مقدر کر دی تھی۔ جب تقسیم ملک کے وقت سکھوں نے ضلع گورداسپور کی مسلم آبادی کو از راہِ ظلم و ستم تنگ کرنا شروع کیا تو بھامبڑی کی تمام مسلم آبادی اپنے گھر بار چھوڑ کر قادیان میں پناہ لینے کے لئے آ گئے۔ ان لوگوں نے "بادیاں والے باغ" میں ڈیرہ لگا لیا۔ غالباً ۲۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کی وہ قیامت خیز رات اکثر اہلِ قادیان کو یاد ہو گی جب متواتر دس گھنٹے بڑی سخت موسلا دھار بارش ہوئی تھی اور اس کے ساتھ تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ محلہ دار العلوم میں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ باہر دریا بہہ رہا ہے ہائی سکول کی گراؤنڈ میں کم از کم اڑھائی فٹ تک پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ بھامبڑی کے لوگوں نے یہ تمام ہولناک رات درختوں تلے گزاری۔ چند عورتیں گڈوں تلے بیٹھی تھیں مگر ان کے پاؤں پانی میں ڈوبے تھے۔ کسی نے کھیس کا سائبان بنایا ہوا تھا۔ کسی نے چٹائی اوڑھی ہوئی تھی۔ غرضیکہ ان کی حالت کا تصور بیان سے باہر ہے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ ایندھن تھا۔ آٹا دانہ اُن کے

پاس تھا تو سہی مگر پکاتے کہاں ۔طوفانِ نوحؑ نے ان کو گھیرا ہوا تھا۔اسی طرح بھوکے باغ میں پڑے ہوئے تھے۔یہ خاکسار ان دنوں ہائی سکول میں کلرک تھا۔

صبح کے قریب جب بارش تھم گئی تو مجھے بورڈنگ کا چپراسی مرحوم سیّد محمود اللہ شاہ صاحب کا رقعہ دینے آیا جس میں لکھا تھا کہ تم فوراً جا کر بھامبڑی کے لوگوں کو کہو کہ تمہارے لئے ہم نے اپنے ہائی سکول کے کمرے صاف کروا دیئے ہیں ۔بال بچوں سمیت وہاں آجاؤ اور موسم کی سختی سے بچ جاؤ۔ میں وہاں بصد مشکل پانی میں سے گزرتا ہوا گیا۔ چند معتبر سے لوگوں کو جمع کر کے بات کی ۔ان میں سے تین مرد اور ایک بوڑھی عورت میرے ہمراہ ہائی سکول میں آئے ۔کمرے دیکھے۔پھر ایک طرف جا کر انہوں نے کچھ مشورہ کیا اور مجھے کہنے لگے کہ:۔

''ہم مرزائیوں کے کوٹھوں میں رہنا پسند نہیں کرتے''

میں نے ہر چند ان کو سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور واپس چلے گئے ۔میں نے جا کر تمام واقعہ جناب شاہ صاحب کے گوش گزار کر دیا۔وہ بار بار پوچھتے کہ واقعی انہوں نے یہ الفاظ کہے ہیں؟

میں یہ لکھنا بھول گیا۔شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان لوگوں کے لئے دوسو تازہ خمیری روٹیاں بورڈنگ کے تنور سے پکوا کر ان میں تقسیم کرا دو ۔رات بھر کے بھوکے ہیں بطور ناشتہ کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ان نمائندوں نے مجھے کہا کہ تکلیف نہ کریں آٹا دانہ ہمارے پاس موجود ہے اور واپس چلے گئے۔

مگر خدا کی قدرت دو تین گھنٹے کے بعد تمام قافلہ خود بخود ہائی سکول میں آ گیا اور کہا کہ ہمیں کمرے کھلوا دو۔ میں نے شاہ صاحب سے جا کر کہا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ انہیں فوراً جگہ دو۔وہ تین آدمی جو پہلے انکار کر گئے تھے بڑے شرمندہ تھے اور میرے سامنے نہ آتے تھے۔غرضیکہ ہم نے ان کی ہر ممکن خدمت کی ....ان لوگوں کے ہائی سکول میں آنے کے غالباً تیسرے دن قادیان کے سکھ تھانیدار ہزارہ سنگھ نے ایک سپاہی کی زبانی مجھے سکول میں پیغام بھیجا کہ وہ سکول کے معائنہ کے لئے آ رہا ہے میں نے سپاہی کو کہا کہ جب چاہو آجاؤ یہاں کیا دھرا ہے ؟سکول کی روشوں پر اہلِ بھامبڑی نے کپڑے پھیلا کر دُور تک تمبا کو دھوپ میں ڈالا ہوا تھا جو کہ بارش میں بھیگ گیا تھا۔میں نے ان کو مشورہ دیا کہ اس کو اٹھا کر فوراً اندر لے جاؤ اور جب ہزارہ سنگھ چلا جائے تو پھر دھوپ میں ڈال دینا مگر میری بات کسی نے نہ سنی نتیجہ یہ ہوا کہ ہزارہ سنگھ نے جو دور تک تمبا کو کی نمائش لگی دیکھی تو جو مرد سامنے آتا اس کو دو تین ہنٹر جڑ دیتا، کسی کو چانٹا رسید کرتا، کسی کو ٹھوکر ہی لگا دیتا اور زبانی جو پنجابی میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے ان کا کیا کہنا۔بعد میں سنا گیا تھا کہ اُن میں سے بعض نے حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ سے بیعت کی درخواست کی تھی جو منظور نہ ہوئی ۔

(ماہنامہ مصباح جولائی ۱۹۶۰ء)

''مرزا صاحب کی سفارش''

وسط ۱۹۵۷ء میں میری بڑی لڑکی نے امتحان ایف۔اے پاس کرلیا تو بزرگوں کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ اسے لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور میں داخل کرایا جائے۔۲۴۔ستمبر ہم بغرض انٹرویو وہاں گئے۔

لاہور پہنچ کر میں نے ایک محترم دوست سے ذکر کیا کہ آجکل سفارش کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔آپ بھی ہمیں کسی بڑے آدمی کی سفارش لے دیں۔وہ فرمانے لگے کہ لیڈی میکلیگن ہائی سکول میں (جو کالج سے ملحق ہے) شیخ عبدالرحمٰن صاحب مصری کی صاحبزادی ہیڈ مسٹریس ہیں اُن سے ملنا وہ پرنسپل صاحب سے سفارش کرکے کام بنوادیں گی۔میں نے ان کو حیران ہو کر کہا کہ واہ! آپ نے مجھے یہ کیا کہہ دیا؟ اُن سے میرا کیا واسطہ؟ میرا کام ہو یا نہ ہو میں اُن کی سفارش نہیں چاہتا۔ہم ان کی سفارش کے بغیر ہی اچھے ہیں اور یہ شعر پڑھا

حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان کے فقروں سے سخت اذیت ہوئی اور ہم بغیر کسی سفارش کے وقتِ مقررہ پر کالج پہنچ گئے۔

اے خوش آں جوئے تُنک مایہ کہ ازذوقِ خودی
دردلِ خاکِ فرد رفت و بدریانہ رسید

وہاں پر ایک جمِ غفیر موجود تھا۔بعض لوگ کاروں میں آئے ہوئے تھے۔بعض خوب سوٹ بوٹ پہن کر آئے ہوئے تھے اور ادھر اُدھر یوں ٹہل رہے تھے گویا کہ ان کو کوئی خاص بلاوا گیا ہے۔کالج والوں نے لڑکیوں کے لئے قناتیں لگوا کر پردہ کرادیا ہوا تھا۔اور اندر کرسیاں بچھوادی تھیں تاکہ لڑکیاں آرام سے بیٹھ سکیں۔میں نے بھی اپنی لڑکی کو اندر بھجوادیا اور خود ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

چونکہ میں سب سے بعد میں آیا تھا۔مجھے دیکھ کر جو لوگ پہلے آئے ہوئے تھے پوچھنے لگے کہ کیوں جی! آپ کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے بتایا کہ میں ربوہ سے آیا ہوں۔بس پھر کیا تھا گفتگو کا دھارا میری طرف مڑ گیا۔ہر طرف سے سوال ہونے لگے ''سناؤ ربوہ کا کیا حال ہے؟''۔''وہاں پر درخت اُگے ہیں کہ نہیں؟''''سنا ہے وہاں پانی نہیں ملتا؟''''وہاں پر کوئی دکان بھی ہے یا نہیں یا سودا چنیوٹ سے لاتے ہو؟''۔''میرا تو یہ تجربہ ہے کہ جہاں ایک مرزائی ہو وہاں بہت جلد دو ہو جاتے ہیں۔''''ان میں بڑا اتحاد ہوتا ہے۔یہ بڑے مالدار لوگ ہوتے ہیں''''انہوں نے جنگل میں منگل بنادیا ہوا ہے۔''غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں ہونے لگیں

ایک صاحب جو بہت بڑی سفید ریش کے مالک تھے مجھے طنز سے کہنے لگے کہ''آپ تو مرزا صاحب کی سفارش لے کر آئے ہوں گے؟''

یہ بات مجھے کاٹ گئی۔ میں نے ان کو کہا کہ اس میں مرزا صاحب کا کیا دخل ہے؟ یہ تو میرا پرائیوٹ معاملہ ہے۔ مگر وہ دوسرے احباب کو مخاطب کر کے یہی کہتے رہے کہ ''جناب ہم کو خوب معلوم ہے کہ آپ کے مرزا صاحب کی سفارش ہر جگہ چلتی ہے۔ ان کی سفارش کو بھلا کون رد کر سکتا ہے؟'' (میں دل میں کہہ رہا تھا کہ خدا کرے ایسا ہی ہو) اُن کے ہاتھ میں سفارشی خطوط دیکھ کر میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کس کس کی سفارش لائے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ ایک تو ایک وزیر صاحب کی ہے، دوسری ایک ایم ایل اے کی ہے اور تیسری ایک پرنسپل صاحب کی۔

میں نے دل میں کہا کہ میں بھی اگر کوشش کرتا تو کسی نہ کسی سے سفارش لے ہی آتا مگر اب تو وقت گزر چکا ہے۔ اسی حالت میں ایک طرف جا کر علیحدگی میں دعا کی کہ ''خدایا یہاں تو معاملہ بے ڈھب آ پھنسا ہے۔ اب ہماری لاج تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔'' خدایا اب تو حضرت مرزا صاحبؑ کی عزت و حرمت جو تیری بارگاہ میں ہے اسی کا واسطہ دیتا ہوں کہ خواہ کچھ ہو میری لڑکی کو داخلہ مل جائے۔ ان لوگوں نے دراصل حضرت مرزا صاحب کو مذاق کیا ہے جو یقیناً تجھے کسی صورت میں منظور نہیں ؎

ہیں ایک وہ[1] بھی کہ جن سے ہیں[1] تم کو راز و نیاز
اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

اس کے بعد وہ خاص حالت دعا والی جاتی رہی۔ اور میں آ کر پھر اُسی گروہ میں کھڑا ہو گیا۔ وہی لمبی داڑھی والے ملتانی سٹیشن ماسٹر صاحب مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ ''مرزا صاحب! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ مگر میں خاموش رہا۔

کالج والوں نے ہر ضلع کا کوٹا مقرر کیا ہوا تھا۔ اور اعلیٰ نمبروں کے لحاظ سے انتخاب ہونا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ مرزا صاحب کی سفارش اپنا عمل دکھائے۔ جب لڑکیاں ضلع وار ترتیب سے کھڑی ہو گئیں تو پرنسپل صاحبہ نے نظر دوڑائی۔ دیکھا کہ ضلع جھنگ سے صرف میری ہی لڑکی درخواست کنندہ تھی۔ اسے پرنسپل صاحبہ نے وہیں کہہ دیا کہ تم کو میں نے رکھ لیا ہے۔ تم گھر جا سکتی ہو۔

خلافِ توقع جب میری لڑکی اندر سے نکل کر میری طرف بڑھی اور مجھے کہا کہ آؤ چلیں، تو میں گھبرا گیا۔ میں نے سمجھا کہ شاید اسے نکال دیا ہے۔ مگر اس نے مجھے بتایا کہ اُسے رکھ لیا گیا ہے تو میری تسلی ہو گئی۔

اب جو ہم وہاں سے چلنے لگے تو وہی سٹیشن ماسٹر صاحب میری طرف لپکے اور کہنے لگے کہ ''جناب مرزا صاحب! ذرا بتا تو جائیے اندر کیا کیا سوالات ہوئے؟'' میں نے کہا۔ میری لڑکی سے انہوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کے کاغذات دیکھ کر اُسے رکھنا منظور کر لیا ہے اور بس۔ اس پر وہ دوسرے احباب کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ ''دیکھ لو جناب! میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ان کے مرزا صاحب کی سفارش چل جائے گی۔ چنانچہ وہی ہوا ہے۔'' اس پر تمام گروہ میں ہمارے متعلق کچھ باتیں ہونے لگیں اور ہم چلے آئے۔

---

[1] پہلے مصرع سے میری مراد وہ لوگ تھے جو سفارشیں لے کر پہنچے تھے اور دوسرا مصرع تو تھا ہی میرے حسبِ حال جب میں سکول سیکرٹریٹ کے پاس سے انارکلی کے مقبرے کے نیچے سے گزر کر سنت نگر کو جا رہا تھا اور اس واقعہ

پر غور کررہا تھا کہ کس طرح خداتعالیٰ نے اپنے ایک کمزور اور عاجز بندے کیلئے اپنے تصرف سے سامان پیدا کر دیا تو یکا یک میری نظروں سے حضرت صاحب کا چہرہ گزر گیا اور میں نے قدرے بلند آواز سے کہا۔ ''واہ واہ!

جان ڈالی ہے ترے نام نے افسانے میں''

قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ سالانہ امتحان ہوا تو فیل شدگان میں اُنہی سٹیشن ماسٹر صاحب کی صاحبزادی بھی تھی جس کا ہمیں افسوس ہوا۔ کیونکہ کالج میں میری لڑکی اور وہ بہت گھل مل کر رہا کرتی تھیں۔

(ماہنامہ خالد جولائی ۱۹۶۰ء)

نربَل کے بَل رَام

عنوان مشہور ہندی شاعر تلسی داس کے ایک شعر سے لیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

رام بجھو تو سکھ پاؤ گے پورن ہونگے کام
تلسی داس کو ایک بھروسہ نربَل کے بَل رَام

(یعنی اگر ہم اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں گے تو ہمارے تمام کام درست ہو جائیں گے۔ تُلسی داس کو یہی ایک بھروسہ ہے۔ کہ کمزور کا اللہ حامی ہے۔ (نربل جس کے اندر بل یعنی طاقت نہ ہو)

یُوں تو یہ دنیا دارالحوادث ہے روزانہ سینکڑوں حادثات کی خبر آتی ہے سینکڑوں خونِ ناحق ہوتے ہیں۔ اور بعض جگہ اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت کے عجیب عجیب رنگ دکھاتا ہے۔ اُن میں سے ایک سوفی صدی سچا واقعہ عرض ہے۔

ضلع امرتسر کے گاؤں میں آج سے ۷۵ سال قبل ایک نوجوان بچہ میراں بخش نام تھا۔ وہ گھر سے کسی وجہ سے نکل بھاگا اور پھرتے پھراتے انبالہ شہر چلا گیا۔ وہاں وہ اپنی محنت مزدوری کرتا اور گزارہ کرتا رہا۔ چند سالوں میں اتنا پس انداز کر لیا کہ چمڑے کی دکان کھول لی۔

محترم بابو عبدالرحمٰن صاحب انبالوی (جو ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہوتے تھے) کی تبلیغ سے میراں بخش صاحب کو حضرت مہدی علیہ السلام کی خبر ملی اور آپ نے ۱۹۰۴ء میں حضور علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ حضرت اقدسؑ کی دعاؤں کے طفیل ۱۹۱۲ء میں ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ ان پر حج بیت اللہ فرض ہو گیا اور آپ حاجی میراں بخش لیدر مرچنٹ مشہور ہو گئے آپ کی دکان کے متصل کافی وسیع مکان اور دکانیں تھیں اور اللہ تعالیٰ کا دیا سب کچھ تھا انبالہ شہر میں محلّہ پکا باغ میں بابو عبدالرحمٰن صاحب کی کچھ سفید زمین پڑی تھی اس پر حاجی صاحب نے احمدیہ مسجد بنوائی۔ بجلی لگوائی پنکھے لگوائے۔

چودہ اور پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کو حاجی صاحب کے دشمنوں نے سازش کر کے ان کے مکان پر حملہ کر دیا اور آپ کو قتل کر دیا۔

آپ کی اہلیہ مریم بیگم اپنے اکلوتے لڑکے بشارت احمد کو لے کر لیٹی ہوئی تھی اسکے پیچھے بھی بھاگے۔ وہ بے چاری اپنی گود کی لڑکی کو لے کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگی مگر ظالموں نے اُسے بھی وہیں ڈھیر کر دیا۔ ننھی سی لڑکی جو گود سے گری تو زخمی ہو گئی اور دوسرے دن فوت ہو گئی۔

والدین کے قریب لیٹے ہوئے بشارت احمد کو کسی نے کچھ نہ کہا اور یہی قاتلوں کی سکیم تھی کہ بچے کو زندہ رکھا جائے تا کہ گارڈین بن کر تمام جائیداد اور نقدی وغیرہ قبضہ میں لے لیں۔ حتیٰ کہ بشارت احمد کے غیر احمدی نانا نے

بڑی کوشش کی کہ بچہ اسکی کفالت میں دیا جائے۔

اب حاجی صاحب مرحوم کے تعلق دار احمدیوں کے سوا کون تھا؟ بابو عبدالرحمٰن صاحب اور بابو محمد بخش صاحب احمدی اور ملک محمد مستقیم صاحب ایڈووکیٹ (حال ساہی وال منٹگمری) نے نچلی عدالتوں میں بڑی محنت اور جانفشانی سے مقدمہ لڑا۔ آخر کار مقدمہ ہائیکورٹ میں جسٹس محمد منیر صاحب کے سامنے پیش ہوا حضرت خلیفہ ثانیؓ کے حکم سے شیخ بشیر احمد صاحب نے بحث کی اور جج صاحب نے فیصلہ فرمایا کہ چونکہ نابالغ بچہ بشارت احمد صاحب جماعت احمدیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کی گارڈین جماعت احمدیہ قادیان ہوگی۔

مجلس مشاورت ۱۹۴۱ء کے موقعہ پر جماعت احمدیہ انبالہ نے بشارت احمد کو قادیان میں بھجوا دیا اور حضرت صاحب کے حکم سے اسے بورڈنگ میں داخل کرایا گیا۔ اس کے متعلق حضور کی ایک ہدایت تھی کہ یہ کسی صورت میں بھی اکیلا نہ رہے کوئی نہ کوئی نگران موجود ہو۔

بشارت احمد کے والدین کے قاتلوں نے یہاں بھی اُس کا پیچھا کیا۔ ایک دن نماز فجر ہو رہی تھی کہ کسی اجنبی شخص نے نماز کی حالت میں اُسے پکڑنا چاہا۔ مگر بچے نے شور مچا دیا اور وہ شخص بھاگ گیا (بعد میں وہ پکڑا گیا۔ وہ بشارت احمد کا ماموں تھا)

بابو بخش صاحب نے نہایت دیانتداری سے بچے کی جائیداد کی نگرانی کی۔

۴۷-۱۹۴۶ء میں خاکسار قادیان کے تعلیم الاسلام ہائی سکول میں کلرک تھا۔ ایک دن عصر کے بعد بورڈنگ کے قریب ہی ایک میچ ہو رہا تھا۔ جم غفیر موجود تھا۔ میرے قریب ہی کسی لڑکے نے بشارت احمد کو بیدردی سے مارا۔ میں نے فوراً اُسے چھڑا دیا اور اُسے پیار کیا کہ وہ چپ ہو جائے۔ کسی لڑکے نے مجھے آہستہ سے بتا دیا کہ یہ لڑکا یتیم ہے اس کے ماں باپ قتل ہو گئے ہیں اور اس کو خواہ مخواہ مارا گیا ہے۔ مجھے فوراً سعدی شیرازی کا شعر یاد آ گیا

الا تا نہ گرید کہ عرشِ عظیم
بلرزد ہمی چوں بگرید یتیم

خبردار یتیم نہ روئے کیونکہ اس کے رونے سے عرش عظیم بھی لرزنے لگتا ہے۔

مجھے بشارت پر بڑا ہی ترس آیا۔ اُسے بہت پیار کیا۔ جوں جوں میں اُس کو پچکارتا وہ رونے میں اور تیز ہوتا جائے۔ کیونکہ اُسے اپنا ایک ہمدرد مل گیا تھا حتیٰ کہ میں خود بھی رونے لگ گیا۔ تب میں اُسے لے کر اپنے گھر آیا جو بورڈنگ کے بالکل قریب ہی تھا اور پنی بیوی سے اُس کا تعارف کرایا اور کہا کہ آئندہ اپنے بچوں کے ساتھ رکھا کرے۔ اُدھر محترم صوفی غلام محمد صاحب (جو اُن دنوں بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ تھے) سے اجازت لے لی کہ بشارت ہمارے گھر آیا جایا کرے گا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اجازت دیدی۔ بشارت خوش کہ کوئی پُرسان حال ہوا۔ اور ہم خوش کہ ایک یتیم کی خدمت کا موقعہ ملا۔

تقسیم مُلکی کے وقت ہم جب بورڈنگ میں قید تھے تو ایک دن بشارت میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''اب میرا کیا بنے گا''میں نے اُسے تسلی دی کہ تم میری بیوی کے پاس رہو جو حشر ہمارے بچوں کا ہوگا وہی تمہارا۔ عورتیں بچے تو قافلے میں لاہور بھجوا دیئے گئے۔ اُس کے بعد مجھے سکول کے ضروری رجسٹر دیکر بھجوا دیا گیا۔

بشارت اور بورڈنگ کے لاوارث بچے بھی لاہور بھجوا دیئے گئے۔ وہاں سید محمود اللہ شاہ صاحب ہیڈ ماسٹر نے ایسے بچوں کو اپنی حفاظت میں رکھا۔

آخر کار ہائی سکول کا عملہ ۲۰ کس اور ۶ یتیم لاوارث بچے (جن میں سے ایک کا والد ایسٹ افریقہ میں تھا) ۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو چینوٹ آ گئے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حضرت اقدس نے ربوہ شہر کا سنگ بنیاد رکھا۔ چینوٹ سے سب احمدی دوست آ گئے۔ صرف بشارت احمد وہاں رہ گیا۔ اُس کے پاس پیسے نہیں تھے کہ وہ اپنے خرچ پر چلا جاتا۔ بعد میں مجھے بھی بہت افسوس ہوا کہ وہ میرے بچوں کے ساتھ کیوں نہ گیا۔ مگر اس میں کچھ خدائی حکمت تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ؎

جس کا کوئی بھی نہیں اُسکا خدا ہوتا ہے۔

بورڈنگ میں بشارت اکیلا غمگین بیٹھا تھا۔ ایسا تاریخی موقعہ اور وہ محروم رہا جاتا تھا۔

اتنے میں افریقہ سے ایک احمدی دوست وہاں آ گئے اور پوچھا کہ کیا یہی بورڈنگ احمدیہ ہے۔ بشارت نے جواب دیا کہ یہی ہے۔ پوچھا کہ لڑکے وغیرہ کدھر ہیں تو اس نے بتایا کہ سب لوگ ربوہ گئے ہیں جو یہاں سے ۶ میل پر دریائے چناب کے اُس پار شہر بننے لگا ہے۔ انہوں نے اپنے لڑکے کا نام لے کر پوچھا کہ کیا وہ بھی گیا ہے۔ بشارت نے کہا کہ جی ہاں وہ بھی گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ تم کیوں نہیں گئے تو یہ رونے کے قریب ہو گیا اور صرف یہی کہا کہ یونہی نہیں گیا۔

وہ افریقی دوست کہنے لگے تم میرے ہمراہ چلو ہم دونوں ابھی چلتے ہیں۔ اور اس طرح خدا تعالیٰ نے اس بے آسرا بچے کیلئے غیب سے سامان سفر پیدا کر دیا۔ یہاں پہنچ کر بشارت نے اُن صاحب کے بچے کو تلاش کر کے ملوا دیا۔ اور وہ بڑے ممنون ہوئے لمبی دُعا کے بعد حضرت صاحب نے حکم دیا کہ تمام حاضرین کے نام لکھ لئے جائیں تا یادگار رہے۔ بشارت احمد کا نام نمبر ۶۷ پر درج ہے۔

(ملاحظہ ہو تاریخ احمدیت جلد ۱۲ آخری فہرست)

واپسی پر میں نے بشارت کو دیکھ لیا اور اُسے اپنے ہمراہ لے آیا۔

۱۹۵۲ء میں بشارت نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ مرحوم چوہدری عطاء اللہ رانجھا صاحب نے اُسے بسوں کا حساب رکھنا سمجھا دیا اور آجکل وہ فیصل آباد میں یہی کام بطور خود کر رہا ہے۔

بابو محمد بخش صاحب نے اُس کی شادی بھی حکیم محمد شریف صاحب آف مدینہ ضلع گجرات کی لڑکی امتیاز بیگم سے

کرادی ۔ وہ بھاگوان ایسی آئی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے گھر میں سوئی سے لیکر ٹی ۔ وی تک موجود ہے ۔ اپنا مکان دارالرحمت وسطی میں ہے خدا نے تین لڑکے اور دو لڑکیاں عنایت فرمائی ہیں۔

حضرات یہ ہوتا ہے جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے ؟ بشارت احمد بہت معقول شریف آدمی ہے نماز روزہ تو خیر فرض ہے چندے با قاعدہ دیتا ہے حضرت مسیح موعودؑ کی کتب کے مطالعے کا شوق ہے ہر کسی کا ادب کرتا ہے ۔ کسی کا دینا نہیں کسی سے لینا ہی ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے ۔ آمین

(تشحیذ الاذہان اگست ۱۹۷۸ء)

یادوں کے بنک میں سے کچھ

چٹکیاں لینے لگی دل میں نشاطِ طفلی
آج یاد آگئے بھولے ہوئے افسانے چند

(۱) خلافت ثانیہ کے ابتداء میں حضرت صاحبؓ ڈاک اورانتظامی امورخود ہی سرانجام دیا کرتے تھے۔ تاہم حضور نے اپنی امداد کے لئے میرے چھوٹے چچا مولوی عطامحمد صاحب کو بطور معاون رکھا ہوا تھا۔ وہی پرسنل اسسٹنٹ وہی کلرک وہی مددگار کارکن تھے اور دفتر ہوتا تھا گول کمرہ۔

مجھے خوب یاد ہے عیدالفطر آئی تو میری اماں نے مجھے بھجوایا کہ جا کر اپنے چچا کو بلا لاؤ۔ کھانا کھالیں تاہم لوگ عیدگاہ جاسکیں۔ میری عمر ۷/۶ سال کی تھی مسجد اقصیٰ کی طرف سے سرپٹ بھاگتا ہوا آیا اور گول کمرہ کے اُس دروازے سے جو تنگ سیڑھیوں میں ہے زور سے ٹکرایا۔ دروازہ بڑے تڑاق سے کھلا اور میں نے دیکھا کہ حضرت صاحبؓ میز پر کچھ کاغذات دیکھ رہے ہیں۔ میں نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں اسی میں خیر جانی کہ حضور کی میز کے نیچے چھپ جاؤں۔ حضرت صاحبؓ نے مولوی عطامحمد صاحب سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو انہوں نے بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔ میز کے نیچے میرا دل زورزور سے دھک دھک کر رہا تھا اور پسینہ آ رہا تھا۔ غلطی بھی مجھ سے بڑی فاش سرزد ہوئی تھی۔ حضور نے تبسم فرماتے ہوئے مجھے باہر آجانے کا حکم دیا۔ میں مجرموں کی طرح آنکھیں جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ خوف کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی تھی حضور نے پوچھا کیسے آئے ہو۔ میں نے پہلے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ اُن کا اشارہ پا کر جواب عرض کیا کہ مولوی صاحب نے ابھی کھانا کھانا ہے ان کو بلانے آیا ہوں۔ اس پر حضرت صاحبؓ نے کچھ حیران ہو کر مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ انہوں نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ انہوں نے کہا نہیں۔ تب حضورؓ نے مجھے تو رخصت کر دیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ یہ کھانا یہاں ہی کھائیں گے۔ پھر آپ اُٹھے اور اندر جا کر سینی میں کھانا لگوایا اور اٹھا کر تشریف لائے۔ پھر دونوں نے مل کر یہ کھانا کھایا۔

(۲) ۱۹۱۶ء میں حضور بیمار ہوگئے اور ڈاکٹری مشورہ کے ماتحت بمبئی جانا تھا۔ حضور نے مولوی عطامحمد صاحب کو حکم دیا کہ بمبئی جاؤ اور حضرت سیٹھ اسمٰعیل آدم سے مل کر کوئی موزوں مکان کرایہ پر لے لو۔ پھر جب تم تار دو گے تو ہم روانہ ہوں گے۔

ان دنوں میرے والد مولوی نعمت اللہ صاحب گوہر بی اے مزنگ میں ہیڈ ماسٹر ہوتے تھے۔ والد صاحب اور ڈاکٹر عبدالغنی کڑک مرحوم اور میں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہنے والوں میں تھے۔ رات کی گاڑی سے حضور سوار ہوئے اور بمبئی پہنچے وہاں مولوی عطاء محمد صاحب کو یاد فرمایا مگر وہ سٹیشن پر موجود نہ تھے۔ یہ سمجھا گیا کہ وہ

ضروری انتظامات کے لئے گھر پرٹھہر گئے ہوں گے۔گھر پہنچ کر بھی مولوی صاحب کہیں نظر نہ آئے۔اِدھر اُدھر دریافت کیا گیا مگر پھر بھی مولوی صاحب نہ ملے۔حضور کو بڑا فکر ہوا اور پولیس میں رپورٹ درج کرانیکی سوچنے لگے۔

اتنے میں کسی نے مکان کے اندر کا ایک کمرہ جو کھولا تو کیا دیکھا کہ مولوی صاحب گہری نیند سو رہے ہیں۔اُن کو جگایا وہ آنکھیں ملتے ہوئے ہڑ بڑا کر اُٹھے۔تو حضور نے ہنستے ہوئے فرمایا آپ کہاں چھپ گئے تھے؟انہوں نے بے ساختہ جواب عرض کیا کہ دو دن گاڑی میں سفر کیا اور دو دن مکان تلاش کر کے اسے جھاڑ اپھونکا اب میں سوتا بھی نہ؟اس پر حضور بہت ہنسے۔

(۳) قادیان کی برسات بہت مشہور تھی۔نواحی علاقہ کا پانی جمع ہو کر قادیان کو جزیرہ بنا دیتا تھا۔حضرت میر محمد اسحاق صاحبؓ کی عادت تھی کہ برسات میں ۷/۶ لکڑی کی گیلیاں منگوا کر اُن کے سرے مضبوطی سے بندھوا کر کشتی سی بنا لیتے تھے اور سیر کیا کرتے تھے۔کبھی کبھی میر صاحب کی غیر حاضری میں لڑکے اُسے بغیر اجازت بھی لے جایا کرتا تھے۔

ایک دن عشاء کے بعد کا وقت تھا۔میں حضرت میر صاحب کے ساتھ ڈھاب کے کنارے کھڑا تھا۔چاندنی خوب چٹکی ہوئی تھی اور ہوا میں خنکی تھی۔یکا یک سطح آب پر بڑی canoe کشتی آ کر رُکی اور آواز آئی ''ماموں جان السلام علیکم''۔یہ حضرت خلیفہ ثانیؓ اور حضرت مرزا شریف احمد صاحبؓ تھے۔میر صاحب کچھ باتیں کرتے رہے۔اس کے بعد حضورؓ نے میر صاحب سے فرمایا کہ آپ اپنی بھاری بھر کم کشتی کا مقابلہ canoe سے کریں۔حضرت میر صاحب نے مجھ سے پوچھا کیا تم تیار ہو۔میں نے اپنے آپ کو اس مجلس کا چوتھا مگر کم سن رکن خیال کرتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔یہ تو خرگوش اور کچھوے کی ریس ہوگی اس پر سب ہنسنے لگے مگر حضور نے جھٹ فرمایا کہ ہم سے جس قدر چاہو سٹارٹ لے لو۔اسپر میر صاحب نے پھر میری طرف دیکھا۔میں نے کہا منظور ہے۔چنانچہ میں نے اور میر صاحب نے لمبے لمبے بانس سنبھال لئے اور جس قدر ممکن تھا اپنی کشتی کو تیز کر لیا۔جب ریتی چھلہ والے بڑ کے درخت سے آگے گزر گئے تو میر صاحب نے کہا آواز دیدو آ جائیں۔میں نے بلند آواز سے کہا'' آجائیں'' ابھی ہم اس جگہ نہ پہنچے تھے جہاں سرکاری پرائمری سکول واقع ہے کہ canoe تیر کی طرح سے ہمارے پاس سے گزر کر آگے نکل گئی۔اس کے بعد canoe واپس آئی۔اور ہم بھی تھک کر ٹھہر گئے تھے۔حضرت صاحبؓ کینو میں ہمارے اردگرد چکر لگاتے رہے اور میر صاحب سے کچھ دیر باتیں کر کے السلام علیکم کہہ کر تشریف لے گئے۔

(۴) ۲۲ فروری ۱۹۲۱ء کو پرنس آف ویلز (موجودہ ڈیوک آف ونڈسر) لاہور آ گئے۔حضور نے شہزادے کو جماعت کی طرف سے تحفہ دینے کے لئے ایک کتاب تصنیف فرمائی جسے مسجد مبارک میں نماز فجر کے بعد سنایا کرتے تھے۔اسمیں تقریباً ۲۲ ہزار احمدیوں نے ایک ایک آنہ چندہ دیکر ثواب میں حصہ لیا تھا۔اس کتاب

کاانگریزی ترجمہ طبع کرایا گیااورحضرت مولانا شیرعلی صاحب بمبئی سے چاندی کاایک casket تیار کرواکے لائے۔اُسے کشتی میں رکھکر وہ کتاب شہزادے کو بمقام گورنمنٹ ہاؤس لاہور پیش کی گئی۔ casket

شہزادے سے حضور کی ملاقات کا وقت مقرر تھااوروہ کتاب جوخاص اُسی موقعہ کے لئے تصنیف ہوئی تھی پیش کرنی تھی۔حضور چوہدری ظفراللہ خان صاحب کی کوٹھی سے (جودیال سنگھ کالج کے پہلو میں تھی) باہرتشریف لائے۔ آپ نے دیکھا کہ سواری کیلئے جو موٹرکار مہیا کی گئی تھی اس کے دونوں طرف انگریزی سنہری حروف میں Hazrat Khalifa.tul.Masih2 of Qadian منقش تھا۔حضور نے اظہارِناپسندیدگی فرمایا کہ یہ تو نمائش ہوگئی۔اورساتھ ہی مولوی عطامحمد صاحب کوفرمایا کہ ان حروف پر کاغذ چسپاں کردو۔کاغذتو چوہدری صاحب اپنے دفتر سے لے آئے مگرگھبراہٹ میں گوندنہ ملی۔مولوی صاحب نے مجھے کہا کہ نسبت روڈ پر دیکھوکسی انگریز کی دوکان ہوگی اُس سے تھوڑی سی لیوی لے آؤ۔تھوڑے فاصلے پر ہی ایک شخص کی دکان تھی میں نے اس سے لیوی مانگی اوراُس نے کافی مقدار میں دیدی۔مولوی صاحب اورمیں نے مل کر کاغذ چسپاں کردیئے اورحضور چودھری صاحب کی معیت میں گورنمنٹ ہاؤس ملاقات کیلئے تشریف لے گئے۔

اخبارالفضل میں جورپورٹ حضور کے دورہ لاہور کی شائع ہوئی وہ مولانا عبدالرحیم نیر صاحب کی لکھی ہوئی تھی۔ اوراُس رپورٹ میں کاغذلگانے کاذکر نہ تھا۔معلوم ہوتا ہے کہ نیر صاحب نے حضور کی آمد سے پہلے موٹرکودیکھا۔مگرامرواقعہ وہی ہے جومیں نے درج کیا ہے۔

(ماہنامہ مصباح مئی ۱۹۷۲ء)

لاہور میں احمدیوں کے لئے قابلِ دید مقامات (1)

اگر جماعت احمدیہ بھی سکھ صاحبان کی طرح اپنے مرشدوں کی یادگاریں قائم کرنے والی ہوتی تو آج لاہور کے بہت سے مقامات پر ہمارا ہی قبضہ ہوتا۔ حضرت باوا نانک نے جہاں بھول کر بھی قدم رکھ دیا سکھوں نے وہیں ان کی یاد میں گردوارے تعمیر کر دیئے ہیں اور جس جگہ امام الزمان مہدیٔ دوراں کا قیام رہا ہو۔ وہ جگہ بھلا کیسے نہ متبرک ہوگی۔

(۱) حضور علیہ السلام پہلی مرتبہ لاہور ۱۸۵۷ء میں اپنے والد محترم حکیم مرزا غلام مرتضےٰ صاحب کے ہمراہ تشریف لائے تو لاٹ صاحب پنجاب نے تمام رؤسائے پنجاب کو بمع ان کے لڑکوں کے طلب فرمایا تھا۔ آپ نے لاہور کے مشہور ٹھیکیدار میاں سلطان (جنہوں نے لاہور کا سٹیشن تعمیر کروایا تھا اور تمام لنڈے بازار کے مالک تھے) کے مہمانخانہ میں قیام فرمایا تھا۔ وہ مکان تو اب نہیں رہا۔ وہاں پر (ریلوے سٹیشن کے سامنے) برگانزا ہوٹل قائم ہے۔

(۲) دوسری مرتبہ آپ اپنے والد صاحب کے مقدمات میں بطور ان کے مختار کے چیف کورٹ میں آئے اور قادیان کے باشندہ سید محمد علی شاہ صاحب کے ہاں قیام فرمایا جو محکمہ جنگلات میں ملازم تھے۔ جون ۱۸۷۶ء میں بھی آپ انہی سید صاحب کے ہاں قیام فرما تھے کہ بذریعہ خواب آپ کو علم دیا گیا کہ آپ کے والد صاحب کی وفات کا وقت (۲ جون ۱۸۷۶ء) قریب ہے۔ تو آپ فوراً قادیان چلے گئے۔ نیز تصنیف براہین احمدیہ کے سلسلہ میں بھی اکثر حضور کی آمد ورفت لاہور میں رہا کرتی تھی۔

(۳) دعویٰ مہدویت کے بعد جون ۱۸۹۲ء میں بھی حضور لاہور تشریف لائے تا کہ پنجاب کے پیروں۔ گدی نشینوں اور علماء وغیرہ سے بحث کریں اس وقت حضور نے منشی میراں بخش صاحب کی کوٹھی واقع چونہ منڈی میں قیام فرمایا تھا۔ ۳۱ جنوری کو وہیں پر حضور نے ایک تقریر فرمائی (حیات احمد جلد سوم ص ۲۰۸ شیخ یعقوب علی صاحب) حضرت مولانا حکیم نورالدین صاحب نے بھی حضور کے بعد ایک تقریر فرمائی تھی۔

(۴) ہندو کھتریوں میں ایک ذات رائے ہے ان میں سے ایک شخص محبوب رائے علاقہ جموں وکشمیر میں کسی معزز عہدہ پر فائز تھا۔ چونکہ حضرت مولانا نورالدین صاحب بھی مہاراجہ کشمیر کے طبیب تھے ان سے خوب واقفیت تھی۔ اسی وساطت سے حضور علیہ السلام نے ان کے مکان واقع سید مٹھا بازار لاہور میں قیام فرمایا۔ وہاں پر حضور سے ملاقات کے لئے لوگ کثرت سے آتے جاتے تھے۔ لہٰذا لوگوں کا ہجوم دیکھ کر آپ منشی صاحب کے مکان سے محبوب رایوں کے مکان میں تشریف لے گئے جو زیادہ وسیع تھا۔ اسی جگہ ایک شخص آیا اور حضور کے سامنے کھڑے ہو کر بے حد وحساب گالیاں دیں۔ جس پر ایک بنگالی افسر نے جو اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم تھا۔ یہ نظارہ دیکھ

کر کہا کہ حضرت مسیحؑ کی بردباری کے واقعات تو بہت سنے تھے۔آج ہم نے آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

(۵) مسجد واقع لنگے منڈی (جہاں حضرت کے ایک مرید مولوی رحیم اللہ صاحب امامت کرایا کرتے تھے) سے حضرت نکل رہے تھے کہ ایک شخص نے (جو پہلے سکھ تھا اور مسلمان ہو گیا تھا اور اپنے آپ کو مہدی خیال کرتا تھا) حضور کو کمر سے پکڑ کر گرانا چاہا۔مگر گرا نہ سکا۔سید امیر علی شاہ صاحب سیالکوٹی (جو پولیس میں ملازم تھے) نے اس کو مارنا چاہا۔مگر حضرت نے ان کو منع کر دیا اور فرمایا کہ ''یہ سمجھتا ہے ہم نے اس کا عہدہ سنبھال لیا ہے''۔اس کا بھائی پیغمبرا سنگھ احمدی تھا۔اس نے حضور سے معافی چاہی اور حضور پر پھول نچھاور کئے۔

مولوی عبدالحکیم صاحب کلانوری سے حضور کی جو گفتگو ہوئی تھی (۳ فروری ۱۸۹۲ء وہ بھی اسی مکان میں ہوئی۔

(۶) لاہور سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۵ پر عرصہ دراز گزرا کہ ایک پختہ تھڑا ہوتا تھا جہاں مسافر نماز ادا کیا کرتے تھے۔۱۴۔دسمبر ۱۸۹۳ء کو حضور وہاں پر وضو فرما رہے تھے کہ کہیں سے پھرتا پھراتا لیکھرام وہیں آ گیا۔اس نے حضرت اقدس کو سلام کیا مگر حضور نے رُخ مبارک دوسری طرف کر لیا۔اس نے سمجھا کہ مرزا صاحب نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔ دوسری طرف سے ہو کر سلام کیا مگر حضرت نے پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔اس پر حضرت شیخ یعقوب علی صاحب نے عرض کیا کہ

''حضور پنڈت لیکھرام صاحب سلام کرتے ہیں''

حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

''میرے آقا کو تو گالیاں دیتے ہیں اور مجھے سلام کرتے ہیں''

اس پر لیکھرام شرمندہ ہو کر چلا گیا:۔

(۷) مشہور جلسہ مذاہب میں حضور نے اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے جو مضمون لکھا اور جس کو حضرت مولوی عبدالکریم صاحبؓ سیالکوٹی نے پڑھ کر سنایا تھا۔اس کے متعلق حضور نے خدا تعالیٰ سے خبر پا کر قبل از وقت اشتہار دے دیا تھا کہ یہ مضمون سب پر غالب رہے گا۔یہ مضمون نہایت اطمینان سے سنایا گیا اور جلسہ کا ایک دن بھی بڑھا دیا گیا تھا۔یہ مضمون ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' کے نام سے دنیا میں مقبول ہو چکا ہے۔حتیٰ کہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے بھی کہا کہ اس لیکچر کی وجہ سے آج اسلام کو نمایاں فتح ہوئی ہے۔

یہ مضمون اس وقت کے اسلامیہ کالج اور آج کل کے اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ کے ہال کمرہ میں سنایا گیا تھا جو داتا گنج بخش صاحب کے مزار کے قریب سرکلر روڈ پر واقع ہے۔

(۸) اسی شہر لاہور میں شاہ عالمی دروازے کے اندر ایک محلّہ وچھووالی ہے۔اس میں آریوں کے مشہور لیڈر لیکھرام کا مکان بھی تھا۔جہاں وہ خدا تعالےٰ کے نشان کے مطابق ۶ / مارچ ۱۸۹۷ء کو شام کے ۶ بجے اپنے گھر کے اندر مارا گیا تھا اور میو ہسپتال لاہور میں کرنل ایف ایف پیری سرجن نے اس کا اپریشن کیا تھا۔مگر خدا کا مارا

ہوا کشتہ کیسے جانبر ہو سکتا تھا مشہور واقعہ ہے تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

(۹) ترکی کا قونصل حسین کامی بمبئی سے لاہور آیا تو یہاں سے ہی حضرت اقدس کی خدمت میں قادیان حاضر ہوا تھا۔ حضور نے کشفی رنگ میں اس کی اندرونی حالت دیکھ کر اسے علیحدگی میں بتایا تھا کہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔ ویسے ہی ظہور میں آیا اس نے مظلومان کریٹ کے لئے چندہ کی جمع شدہ رقم غبن کر لی تھی جو بعد میں سخت رسوائی کا باعث ہوئی۔

(۱۰) لاہور میں عیسائیوں کے مشہور کالج فورمین کرسچن کالج کے ایک پروفیسر سراج الدین نامی تھے مگر بدبختی کی وجہ سے وہ تثلیث کی دلدل میں پھنس گئے۔ انہوں نے حضرت اقدس کی خدمت میں سوالات بھجوائے جن کا تسلی بخش جواب ''سراج الدین عیسائی کے چار سوالات کے جواب'' رسالہ کی صورت میں موجود ہے۔ یہ رسالہ ۲۲۔ جون ۱۸۹۷ء کو شائع ہوا۔

(۱۱) اکتوبر ۱۸۹۷ء میں حضور کو سفر ملتان پیش آیا واپسی پر حضور نے جناب شیخ رحمت اللہ صاحب گجراتی تاجر لاہور کے مکان پر قیام فرمایا۔ ان دنوں ان کی دکان کا نام ''بمبئے ہاوس'' تھا اور موجودہ پنجاب ریلجس بک سوسائٹی انار کلی کے متصل واقع تھی۔ اس کے عقب میں ہی مکان تھا اس موقعہ پر شیخ صاحب کے مکان کے عقب میں ایک کھڑکی میں بیٹھ کر حضور نے مختصری تقریر فرمائی اور بعض لوگوں کے سوالات کے جواب دیئے۔ عیسائیوں کی طرف سے سوال کیا گیا کہ قرآن مجید میں جو قصے درج ہیں۔ یہ بائیبل سے لئے گئے ہیں حضور نے بہت سے دلائل دے کر فرمایا:۔

''جس طرح گھاس پھوس اور چارہ گائے کے پیٹ میں جا کر لہو اور تھنوں میں جا کر دودھ بن جاتا ہے۔ اسی طرح تورات اور انجیل کی کہانیاں اور داستانیں قرآن کریم میں آ کر نور اور حکمت بن گئیں''

تو تمام حاضرین عش عش کر اٹھے۔ (مجدد اعظم جلد اول ص ۲۶۱)

(۱۲) لاہوری گیٹ سے سرکلر روڈ عبور کر کے انارکلی کی طرف چلیں تو سیدھے ہاتھ پر عیسائیوں کا ایک گرجا ''فورمین چیپل'' ہے۔ اس جگہ لاہور کے بشپ جارج اے لیفرائے نے ۱۸۔ مئی ۱۹۰۰ء کو ''معصوم نبی'' کے عنوان سے لیکچر دیا اور اس کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیا۔ حضرت مفتی محمد صادق صاحب وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بشپ صاحب سے اجازت لے کر جواب دیا کہ اناجیل کے لکھے کو ہم نہیں مانتے۔ ہاں خدا تعالیٰ نے نبی معصوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے قرآن مجید کی آیت واللہ یعصمک من الناس سے استنباط کیا تو مسلمان جو پادری کی تقریر سن کر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اب خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ اور مفتی صاحب کو کندھوں پر اٹھالیا۔

یہ جواب سن کر پادری صاحب بہت گھبرائے تو ایک دیسی عیسائی نے ان کو بتایا کہ یہ ترجمہ اس سے مختلف ہے جو عام طور پر قرآنوں میں پایا جاتا ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ بشپ صاحب نے کہا مترجم قرآن میں جہاں یہ آیت

واللّٰہُ یعصمک والی آئی ہے نکال کردے۔اس نے حوالہ نکال کرانگلی رکھ دی۔جلدی میں جو قرآن بشپ صاحب نے ہاتھ میں لیا۔تو انگلی اس حوالہ سے نکل گئی۔اور قرآن کھولنے پر کوئی اور حوالہ جس پر بھی نشان لگا ہوا تھا نکل آیا۔بشپ صاحب نے سمجھا کہ یہی وہ حوالہ ہے جو مطلوب ہے جھٹ اسے پڑھنا شروع کر دیا۔جب پتہ لگا کہ اس حوالہ کا نفس مضمون سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے تو جلسہ میں بڑی ہنسی ہوئی اور بشپ صاحب خفیف ہوئے گھبرا کر اس دیسی پادری کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ ''اس بھائی نے مجھے دھوکہ دیا ہے''

(۱۳) جب حضور علیہ السلام کو اس مباحثہ کی روئداد مفتی صاحب نے جا کر سنائی تو حضور نے ایک اشتہار بنام ''بشپ صاحب لاہور سے ایک سچے فیصلے کی درخواست'' کے عنوان سے ۲۵ مئی ۱۹۰۰ء کو چھپوا کر تقسیم کیا۔جس میں لکھا کہ حضرت عیسیٰ اور آنحضرت صلعم کا علمی اور عملی اور اخلاقی اور تقدسی اور برکاتی اور تاثیراتی اور ایمانی اور عرفانی اور افاضۂ خیر وشر اور طریق معاشرت وغیرہ وجوہ فضائل میں باہم موازنہ ومقابلہ کیا جاوے۔پادری صاحب نے مقابلہ سے انکار کر دیا۔ویسے اسی دن انہوں نے رنگ محل مشن ہائی سکول اندرون شاہ عالمی گیٹ میں ''نبی معصوم'' پر لیکچر دیا اور لاہور کے مسلمانوں کو بڑے زور سے چیلنج کیا۔لاہور کی اسلامی انجمنوں کو جب لاہور میں کوئی مولوی نہ مل سکا۔جو بشپ صاحب کے مقابل ہوتا۔تو امرتسر سے مولوی ثناء اللہ صاحب سے درخواست کی۔ان کی ہمت نے جواب دے دیا صرف یہ کہا کہ ایسے جلسہ میں شامل نہیں ہونا چاہیئے۔مگر لاہور کے اہل الرائے اصحاب نے کہا کہ ضرور شامل ہونا چاہیئے ورنہ بشپ صاحب کے مقابلہ میں فرار اسلام کی ذلت ہے۔سب نے اقرار کیا کہ سوائے حضرت مرزا صاحب اور ان کے مریدوں کے کوئی موزوں آدمی نہ ملے گا۔وقت بہت تنگ تھا مگر حضور نے دو گھنٹے میں زندہ رسول پر لیکچر لکھ دیا۔جس کا کمال اس وقت نظر آیا جب مفتی محمد صادق صاحب نے اسے پڑھ کر پادری صاحب کی تقریر کے بعد سنایا۔پادری صاحب کی تقریر کا حرف بحرف جواب موجود تھا۔چونکہ بشپ صاحب مفتی صاحب کو مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم کر چکے تھے۔اس لئے ان کو روک بھی نہ سکتے تھے گھبرا کر کہنے لگے کہ ہم نے مباحثہ مسلمانوں سے کیا تھا نہ کہ مرزائیوں سے۔اس پر مسلمانوں نے یک زبان ہو کر کہا

''ہم ان کو مسلمان سمجھتے ہیں اور یہ ہمارے نمائندہ ہیں مضمون جاری رہنا چاہیئے''

حضور نے لکھا کہ:۔

''انسان کامل کی شناخت کے لئے کسب خیر کا پہلو دیکھنا چاہیئے یعنی کیا کیا حقیقی نیکیاں اس سے ظہور میں آئیں۔پھر حضرت مسیح اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات اور خیرات کو ہر ایک پہلو سے جانچنا چاہیئے۔مثلاً سخاوت۔فتوت۔مواسات۔حقیقی حلم۔حقیقی عفو۔حقیقی شجاعت۔حقیقی عدل۔حقیقی رحم۔اعلیٰ درجہ کی زیرکی۔اعلیٰ درجہ کا حافظہ۔اعلیٰ درجہ کی فیض رسانی اور اعلیٰ درجہ کی استقامت اور اعلیٰ درجہ کا احسان کے نمونے شرط ہیں نہ کہ صرف ترک شر جس کا نام بشپ صاحب معصومیت رکھتے ہیں۔کیونکہ نبیوں کی نسبت یہ کہنا بھی ایک گناہ ہے کہ انہوں نے چوری

ڈاکہ وغیرہ کا موقعہ پا کر اپنے تئیں بچالیا بلکہ حضرت مسیح کا یہ فرمانا کہ ''مجھے نیک مت کہو'' یہ ایک ایسی وصیت تھی جس پر پادری صاحبان کو عمل کرنا چاہیئے تھا''۔

جلسے میں لیکچر سنکر مسلمانوں کے چہرے دمک پڑے اور عیسائیوں کے چہرے سیاہ پڑ گئے۔صرف یہ کہا کہ میں نے یہ باتیں آج نئی سنی ہیں۔اس سے پہلے کبھی نہیں سنیں۔ میں ان کا کیا جواب دوں۔ میں مسلمانوں میں اختلاف بڑھانا نہیں چاہتا۔اسلام کی اس فتح اور عیسائیت کی شکست کو دوست دشمن سب نے محسوس کیا۔

اب حضرتؓ نے پادری صاحب کا پیچھا کیا۔اوران کو آخری فیصلہ کے لئے ایک مباحثہ کے لئے کہا تو انہوں نے کہہ دیا کہ وہ شملہ جارہے ہیں۔حضرت میاں معراج الدین صاحب عمر نے کہا ہم وہیں آجائیں گے۔مگر پادری صاحب نے ایک نہ مانی اور کچھ دنوں کے بعد تبدیلی کرا کے ایران چلے گئے۔

میں نے حضرت مفتی صاحب سے پوچھا تھا کہ آپ کا مباحثہ انگریزی میں ہوا تھا یا اردو میں؟ تو مفتی صاحب نے مجھے بتایا کہ لیفرائے صاحب ۱۱ برس دہلی میں رہے۔وہ نہایت شستہ اردو جانتے تھے۔

(۱۴) شاہ عالمی گیٹ کے اندر آریوں کا محلہ وچھووالی تھا۔۲۔۳۔۴ دسمبر ۱۹۰۷ء کو وہاں پر آریوں نے ایک جلسہ کرایا۔جس میں مسلمانوں کی نمائندگی حضرت مولانا نورالدین صاحبؓ نے کی آپ کے ہمراہ مولوی محمد احسن صاحبؓ امروہی۔حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ۔حضرت میر ناصر نوابؓ بھی تھے۔جب آریوں کے نمائندوں نے لیکچر سنایا تو انہوں نے اپنی فطرت کے مطابق اسلام اور حضرت بانی اسلام پر نہایت رکیک حملے کئے۔

جس سے لازماً مسلمانوں کو تکلیف ہوئی مگر صبر کر کے سنتے رہے۔

جب وفد قادیان واپس آیا تو حضرت اقدس سخت ناراض ہوئے کہ آپ کی غیرت نے کس طرح برداشت کیا۔اور وہاں ٹھہرے رہے۔فوراً اٹھ کر چلے آنا تھا۔حضرت مولوی نورالدین صاحب تو شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھے رہے۔مگر مولانا محمد احسن صاحب نے جواب دیا کہ حضرت ذہول ہو گیا ذہول۔تب حضرت نے کتاب چشمۂ معرفت لکھی جو قابل مطالعہ ہے۔

(۱۵) موجودہ برانڈرتھ روڈ جسے آج سے ۶۰ سال پہلے کیلیاں والی سڑک کہتے تھے۔اس کے ایک طرف اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کی عظیم الشان عمارت ہے اور ایک طرف احمدیہ بلڈنگز ہیں۔یہاں پر خواجہ کمال الدین صاحب مرزا یعقوب بیگ صاحب وغیرہ نے رہائشی مکان بنائے تھے ہمارے لئے یہ مقام بھی بہت تاریخی ہے۔کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ۲۸ دن یہاں بسر کئے۔

(۱۶) حسب دستور سابق حضرت نے قادیان سے ۲۹ راپریل کو تشریف لا کر حضرت میاں چراغ الدین صاحب کے مکان ''مبارک منزل'' بیرون دہلی دروازہ قیام فرمایا۔ایک دن خواجہ کمال الدین صاحب نے عرض

کیا کہ ہم نے کھلی فضا میں مکانات تعمیر کرائے ہیں وہاں تشریف لے چلیں اور ہمیں بھی خدمت کا موقعہ عنایت فرمائیں۔آپ نے فرمایا ہم تو میاں چراغ الدین صاحب کے گھر کو ہی اپنا گھر سمجھتے ہیں۔اگر وہ اجازت دے دیں تو ہم وہاں چلے جائیں گے۔خواجہ صاحب نے میاں صاحب سے منوالیا۔اور حضور خواجہ صاحب کے مکان پر تشریف لے آئے۔ادھر حضور کو پے در پے اپنی وفات کی خبریں مل رہی تھیں۔۹ مئی ۱۹۰۸ء کو الہام ہوا ''الرحیل ثم الرحیل'' ادھر ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب نے بھی عرض کیا کہ حضور کچھ دنوں میرے مکان میں (جو گلی کے پار تھا) قیام فرمائیں۔تو حضرت ان کے ہاں منتقل ہو گئے۔

(۱۷) خواجہ صاحب اور شاہ صاحب کے مکان کے درمیان جو گلی ہے ۱۵ مئی ۱۹۰۸ء کو اس میں چار پائیاں بچھادی گئیں۔میاں فضل حسین صاحب بٹالوی بیرسٹر اور میاں شاہ نواز صاحب بیرسٹر (جو سر محمد شفیع کے داماد تھے) اور ایک اور دہلوی صاحب نے حضور سے ملاقات کی۔بات چل پڑی کفر و اسلام کے مسئلہ پر۔حضور نے فرمایا:۔

''ہم کسی کلمہ گو کو کافر نہیں کہتے جب تک کہ وہ ہمیں کافر کہہ کر خود کافر نہ بن جائے یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے کہ جو مومن کو کافر کہے وہ کافر ہوتا ہے۔آپ لوگ خود ہی کہہ دیں کہ ان حالات میں ہمارے لئے کیا راہ ہے۔ہم نے ان پر پہلے کوئی فتوے' نہیں دیا اب جو انہیں کافر کہا جاتا ہے۔تو یہ انہی کے کافر بنانے کا نتیجہ ہے۔''

انہی دنوں حضور نے Professer clement Ragg سے جو سائنس وغیرہ پر لیکچر دیتا پھرتا تھا ملاقات فرمائی۔وہ حضور کی گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔آخری عمر تک اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا رہا۔نیوزی لینڈ میں فوت ہوا تھا۔احمدیہ بلڈنگز کے میدان میں ہی حضرت مولانا نورالدین صاحب درس القرآن دیا کرتے تھے۔اب تو یہ جگہ گنجان آباد ہے۔

دوسری طرف اسلامیہ کالج کے کھیل کے میدان میں مخالفین نے اڈہ جمایا ہوا تھا اور حضرت کے خلاف دل کھول کر بکواس کیا کرتے تھے۔مولوی اصغر علی روحی پیر جماعت علی شاہ اور مولوی غلام احمد قصوری پیش پیش تھے۔

(۱۸) حضرت چاہتے تھے کہ روسائے لاہور کو تبلیغ فرمائیں۔اس کے لئے خواجہ کمال الدین صاحب نے اپنی طرف سے اکابرین لاہور کو ۱۷ مئی کو دوپہر کے وقت کھانے پر مدعو کیا اور حضرت اقدس کا تعارف کرایا۔یہ تقریر بھی ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ صاحب کے مکان کے صحن میں ہوئی۔جہاں شامیانے لگے ہوئے تھے۔بارہ بجے تقریر ختم ہوئی تو کھانا کھایا گیا۔مکمل تقریر اخبار بدر میں شائع ہو چکی ہے۔آخر میں حضور نے فرمایا:۔

''اب میں تقریر ختم کرتا ہوں۔صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ خدا نے ہمیں تجدید دین کے لئے بھیجا ہے۔تاہم تازہ نشانوں کے ساتھ دین کو تازہ کریں۔اگر خدا مجھے نہ بھیجتا تو آخر یہ دین بھی دیگر ادیان کی طرح قصوں کے رنگ میں رہ جاتا......مجھے افسوس آتا ہے کہ میں نے ان لوگوں کا (مکفر مولویوں کا) کیا بگاڑا ہے۔یہی کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ ہی زندہ نبی ہیں۔ان کا فیض نبوت قیامت تک جاری ہے۔آپ ذرا اپنے بھائیوں سے دریافت کریں کہ

میں نے کیا گناہ کیا ہے جو ہم سے اس قدر سختی کی جاتی ہے........وغیرہ

(۱۹) حضور کی وفات کے بعد جب لاہور کے سٹیشن پر آپ کا جسدِ خاکی پہنچا تا قادیان لے جایا جائے تو مخالفین نے پہلے ہی سٹیشن ماسٹر لاہور کو جو انگریز تھا یہ سمجھایا کہ چونکہ مرزا صاحب وبائی ہیضہ سے فوت ہوئے ہیں اور یہ سخت متعدی مرض ہے۔ لہٰذا نعش کو گاڑی میں نہ لے جانے دیا جائے مگر جناب شیخ رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب نے حضور علیہ السلام کے آخری معالج ڈاکٹر کرنل سدر لینڈ (جو مہاراجہ دلیپ سنگھ کا داماد تھا) پرنسپل میڈیکل کالج لاہور کی تصدیق پر ڈاکٹر کننگھم سول سرجن لاہور کا سرٹیفکیٹ پیش کیا کہ حضرت مرزا صاحب Neuristhinia سے فوت ہوئے ہیں ہیضہ سے نہیں تو خوشی سے اجازت دے دی۔ سول سرجن کا دفتر آج بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے سامنے موجود ہے۔

(۲۰) حضور علیہ السلام عرصہ دراز تک میاں چراغ الدین صاحب کے مکان مبارک منزل بیرون دہلی دروازہ میں قیام فرماتے رہے ہیں۔ حضور کے ہمراہ دیگر اکابرین سلسلہ بھی وہیں مقیم ہوتے۔ نچلی منزل میں خلافت ثانیہ کے وقت میں مولانا غلام رسول صاحب راجیکی نمازیں پڑھایا کرتے تھے اور درس قرآن دیا کرتے تھے۔ مہمان خانہ بھی وہیں ہوتا تھا۔ وہ واقعی مبارک منزل ہے۔

(ماہنامہ خالد جنوری ۱۹۷۵ء قسط نمبر ۱)

لاہور میں احمدیوں کیلئے قابل دید مقامات (2)

امیر المومنین حضرت حاجی حکیم حافظ مولانا نور الدینؓ صاحب لاہور میں

(۱) مرقاۃ الیقین میں حضورؓ نے لکھا ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں لاہور آتے رہے ان کے ایک بھائی کا چھاپہ خانہ یہاں تھا۔ نیز مسجد چینیاں والی چونکہ جماعت اہل حدیث کا مرکز ہے آپ یہاں بھی نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ابھی حضرت مولانا بیعت نہیں ہوئے تھے (لاہور تاریخ احمدیت صفحہ ۴۳) حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام بھی اس مسجد میں اوائل زمانہ میں نمازیں ادا کرتے رہے ہیں۔ نیز حضرت اقدسؑ اور حضرت خلیفہ اولؓ نے مسجد مولوی رحیم اللہ صاحب اور گمٹی بازار والی مسجد میں بھی نمازیں ادا کی ہیں۔ حضرت شہزادہ عبداللطیف صاحب شہیدؓ کابل نے بھی اپنے قیام لاہور کے دوران انھیں دو مساجد میں نمازیں ادا کی تھیں۔ یہ مسجد لوہاری دروازے کے اندر قدرے بلندی پر واقع ہے۔

(۲) حضرت مولاناؓ جب خلیفہ بن گئے تو بعض احباب کی طرف سے خلافت پر اعتراض ہونے لگے تو حضور نے احمدیہ بلڈنگز میں جا کر اپنی مشہور تقریر فرمائی

(دیکھئے اخبار بدر ۲۰ جون ۱۹۱۲ء)

اس میں حضورؓ نے ایک فقرہ فرمایا جس کے متعلق وضاحت نہایت ضروری ہے حضورؓ نے فرمایا۔

''خلافت کیسری کی دکان کا سوڈا واٹر نہیں ہے''

اس کا پس منظر یہ ہے کہ لاہور میں ان دنوں لالہ کیسری داس کی سوڈا واٹر کی دکان تھی جو تقسیم ملک تک رہی۔ وہ نہایت عمدہ قسم کا سوڈا مہیا کرتا تھا۔ دکان کے دو حصے ہوتے تھے خود وہ مرکز میں ایک بلندسی جگہ پر بیٹھتا۔ ایک طرف مسلمانوں کیلئے کرسیاں میزیں بچھی ہوتی تھیں اور دوسری طرف ہندوؤں کیلئے۔ جو گاہک آتا تو لالہ صاحب ہندوانہ طور پر نہایت عاجزی اور انکساری سے ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے اور نوکر کو اشارہ کرتے وہ آرڈر لے کر پانی لاتا۔ جب گاہک واپس جانے لگتا تو پھر وہ اسی طریق سے شکریہ ادا کرتا۔ اس کا کاروبار بہت چلا کرتا تھا۔

یہ دکان اب بھی موجود ہے۔ لوہاری گیٹ سے انار کلی کو آئیں تو بائیں ہاتھ پر جہاں سے گنپت روڈ کو سڑک نکلتی ہے دو حصوں میں چھوٹی چھوٹی تین محرابوں والی دکان ہے۔

مطلب حضورؓ کا یہ تھا کہ خلافت کوئی آسانی سے ہل جانے والی چیز نہیں ہے۔ جس طرح تم جا کر کیسری کا سوڈا پی لیتے ہو۔ یہ تو خدا کا عطیہ ہے جس کو چاہے عطا فرمائے۔ بہر حال کیسری کی دکان کا محل وقوع یہ تھا۔ یہ تقریر دو حصوں میں ۱۶ اور ۱۷ جون ۱۹۱۲ء کو احمدیہ بلڈنگز میں ہوئی تھی۔

جناب شیخ رحمت اللہ صاحب کی دکان انارکلی میں ہوا کرتی تھی بعد میں انھوں نے اپنی دکان انگلش ویئر ہاؤس کے نام سے مال روڈ پر بنالی جواب بھی موجود ہے اسکے برامدے میں جا کر ملاحظہ فرمائیں ۔سنگ مرمر کا کتبہ لگا ہوا ہے۔

ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ جس کا سنگ بنیاد حضرت خلیفۃ المسیح مولوی حکیم نورالدین صاحب نے ۱۵ جون ۱۹۱۲ء بمطابق ۲۸ جمادی الثانی ۱۳۳۰ ھجری رکھا۔

سنگِ بنیاد کے رکھنے کے موقعہ پر خاندان حضرت مسیح موعودؑ کے اکثر اصحاب وہاں موجود تھے ۔ یہ بھی ایک خاص یادگار مقام ہے۔ دیال سنگھ مینشنز کے بالکل سامنے یہ عمارت ہے۔

۲۴ جولائی ۱۹۱۰ء کو حضرت مولانا ایک شہادت کے سلسلہ میں ملتان تشریف لے گئے اور ۲۸۔ کو واپس لاہور آئے ۲۹ کو جمعہ پڑھایا اور ۳۱ کو صبح احمدیہ بلڈنگز میں اسلام اور دیگر مذاہب، پر تقریر فرمائی۔ اسی شب واپس قادیان چلے گئے۔

حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانیؓ لاہور میں

یوں تو حضورؓ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہمراہ کئی دفعہ لاہور تشریف لائے ہوں گے۔ مگر بہر حال حضورؑ کی وفات کے وقت ۲۶ ۔مئی ۱۹۰۸ء کو بھی حضورؑ کے سرہانے موجود تھے ۔اس کے بعد خلافتِ اولیٰ میں کئی مرتبہ لاہور آئے ہوں گے اور جب آپ خود سریر آرائے خلافت ہوئے تو اس کا مختصر سا احوال درج ذیل ہے۔

لوہاری اور بھاٹی گیٹ کے درمیان ہندوؤں کا تعمیر کردہ بریڈ لاء ہال اب بھی موجود ہے یہ ہمارے لئے بہت تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی زمانہ میں یہ لاہور کی علمی وادبی وسیاسی مجالس کا مرکز ہوتا تھا۔ آج کل تو خستہ حالت میں ہے ۔۲۳ فروری ۱۹۱۹ء کو وہاں پر حضور نے ''اسلام اور تعلقاتِ بین الاقوام'' پر تقریر فرمائی ۔محترم چوہدری ظفر اللہ خان صاحب صدر تھے۔

دوسری تقریر اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں پروفیسر سید عبدالقادر صاحب (جو تاریخ کے استاد تھے) کی زیر صدارت ''اسلام میں اختلافات کا آغاز'' پر فرمائی۔ یہ تقریر اس موضوع پر بہترین تقریر ہے۔

اسی طرح ۱۵۔فروری ۱۹۲۰ء کو بریڈ لاء ہال میں مولوی ذوالفقار علی خان صاحب گوہر کی زیر صدارت حضور نے ایک تقریر فرمائی اس میں حضور نے وزیر اعظم انگلستان ڈیوڈ لائیڈ جارج کے اس ادّعا کو غلط ثابت فرمایا کہ آئندہ دنیا کا امن عیسائیت سے وابستہ ہے۔ بلکہ دلائل سے ثابت فرمایا کہ آئندہ دنیا کا امن اسلام سے وابستہ ہے۔
(الفضل ۲۶۔فروری ۱۹۲۰ء)

ایک اور تقریر ''واقعات خلافت علوی'' پر شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر ''مخزن'' کی زیر صدارت حبیبیہ ہال میں تین گھنٹے ہوئی اور پبلک کو مسحور کر دیا تھا۔

ایک تقریر احمدیہ ہوسٹل میں ۱۸۔فروری ۱۹۲۰ء کو ''مذہب اور اس کی ضرورت'' پر فرمائی

چوتھی تقریر ۱۹۔فروری کو احاطہ میاں چراغدین صاحب بیرون دہلی دروازہ فرمائی یہ تبلیغی تقریر تھی جس میں احمدیت کو نہایت اچھوتے رنگ میں پیش کیا گیا۔

پانچویں تقریر ۲۴۔فروری کو ہوئی جس میں صرف جماعت احمدیہ کو مخاطب فرمایا۔انہی دنوں مسٹر رچرڈسن پرنسپل اسلامیہ کالج بھی ملاقات کے لئے آئے اور بہت متاثر ہوئے۔

۴۔مارچ ۱۹۲۱ء کو حضورؓ ایک مقدمہ میں شہادت کے لئے آئے تو ''مذہب کی ضرورت'' پر تقریر فرمائی۔

جب پرنس آف ویلز ۱۹۲۲ء میں ہندوستان آئے تو موقعہ سے تبلیغی فائدہ اٹھانے کے لئے حضورؓ نے ایک رسالہ ''تحفہء پرنس آف ویلز'' لکھا۔اس کا انگریزی ترجمہ نہایت خوبصورت طبع کرا کے چاندی کی ایک طشتری میں رکھ کر جب وہ لاہور آئے تو پیش کیا گیا۔یہ چاندی کا Casket ۵۲۲۰۸۔احمدیوں نے ایک ایک آنہ جمع کر کے بنوایا تھا۔اس موقعہ پر حضورؓ نے چوہدری صاحب کی کوٹھی مجیٹھہ ہاؤس نزد دیال سنگھ کالج پر قیام فرمایا تھا۔وہاں پر آج کل لکڑی اور کوئلے کا ٹال ہے۔

یہاں ضمناً یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۲۵۔فروری ۱۹۲۲ء کو شہزادہ ویلز کی آمد پر ایک لیکچر میں فرمایا:۔

''ہم کوئی خوشامد نہیں کر رہے نہ کچھ لینے کے لئے کرتے ہیں۔ہمارا یقین ہے کہ سب بادشاہ خدا کی مٹھی میں ہیں۔'' (الفضل ۲۷۔فروری ۱۹۲۲ء صفحہ ۲)

الفضل نے انہی دنوں ایک نوٹ میں یہ بھی لکھا کہ:۔

''شہزادہ نے سلام قبول کیا۔خدا اسلام قبول کرنے کی بھی توفیق دے۔''

(ایضاً)

۲۶ فروری کو حضور مسجد احمدیہ گنج مغلپورہ میں تشریف لے گئے یہ مسجد میاں محمد موسیٰ صاحب نے تعمیر کرائی تھی. حضورؓ نے وہاں دو نفل پڑھائے۔

۲۵۔فروری کو احمدیہ انٹر کالجئیٹ ایسوسی ایشن کے اجلاس میں ''روح کی نشاۃ ثانیہ'' پر تقریر فرمائی۔

۱۴ نومبر ۱۹۲۳ء کو بریڈلاء ہال میں شیخ عبدالقادر صاحب کی صدارت میں تقریر فرمائی جس میں مسلمانوں کو خود حفاظتی کی طرف توجہ فرمائی۔

۱۵۔نومبر کو حضور نے میاں سر فضل حسین صاحب کی زیر صدارت بریڈلاء ہال میں ''اسلام پر مغربی علما کی نکتہ

چینی‘‘ پر تقریر فرمائی۔

اب تک جماعت احمدیہ کے پاس اپنی مسجد لاہور میں کوئی نہ تھی صرف میاں چراغدین صاحب کے مکان کی نچلی منزل میں نماز ادا کرتے تھے۔ قریب ہی ایک جگہ چمڑہ منڈی تھی وہ جگہ ساڑھے گیارہ ہزار روپے سے خرید لی گئی کیونکہ چمڑہ منڈی شہر کے باہر چلی گئی تھی۔ یہ وہ مسجد ہے جو آج کل شاہ محمد غوث صاحب کے مزار کے قریب ایک گلی میں واقع ہے جس میں سلسلہ کے مربی کے لئے مکان اور مہمان خانہ اور لائبریری موجود ہے۔ اس کا نقشہ میاں محمد صاحب احمدی اوورسیر میوسکول آف آرٹس نے تیار کیا تھا۔ اس کی تعمیر کے لئے حضرت قریشی محمد حسین صاحب نے بے حد تگ و دو کی یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں سے روڑی کوٹا کرتے تھے۔ ایسی پر جوش تقریر چندہ کے لئے کرتے تھے کہ اکثر نمازی خالی جیب گھر جایا کرتے تھے۔

پہلے ایک مسجد کوچہ سیٹھاں لنگے منڈی میں میاں چراغدین صاحب کی ہوتی تھی جس میں مولوی رحیم اللہ صاحب امام تھے۔ بعد میں جب میاں صاحب نے مکان دہلی دروازے میں بنوالیا تو بوجہ احمدی نمازی نہ ہونے کے وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ دوسری مسجد چینیاں والی کے متولی سید دلاور شاہ صاحب احمدی کے نانا ملاّ محمد غوث صاحب تھے وہ بھی ہمارے پاس تھی۔ گو عدالت کا فیصلہ ہمارے حق میں تھا مگر غیر احمدیوں کو بھی الگ جماعت کرانے کا حق دے دیا گیا بلکہ بعد میں اس احتیاط کی وجہ سے کہ کہیں تصادم نہ ہو جائے احمدیوں نے یہ مسجد بھی غیر احمدیوں کو دے دی تھی۔

اسی طرح مزنگ میں حضرت مولوی محمد صاحبؓ نو مسلم حضرت کے مخلص مریدوں میں سے تھے یہ صاحب مولوی محمد حسین بٹالوی کے بہنوئی تھے (سیرۃ المہدی حصہ سوم صفحہ ۲۱۶) اور ان کا بڑا اثر تھا اسی اثر کی وجہ سے سید برکت علی شاہ صاحب رئیس مزنگ نے جو مسجد تعمیر کرائی تھی۔ وہ احمدیوں کو دے دی تھی مگر ۱۲/۱۰ سال بعد غیر احمدیوں کے دباؤ کی وجہ سے سید صاحب کے بچوں نے وہ مسجد جماعت سے واپس لے لی۔

۱۹۵۴ء میں حضرت امیر المومنین کے ارشاد کے ماتحت ایک اور مسجد کے لئے جگہ تلاش کی گئی اور ۱۶،۰۰۰ روپے میں موجودہ مسجد ’’دارالذکر‘‘ کی زمین خریدی گئی جو بہت وسیع اور عظیم الشان مسجد ہے۔

مساجد کے ذکر میں مضمون ترتیب کے حساب سے آگے نکل گیا ہے۔

۲۶۔ فروری ۱۹۲۷ء کو حضور تشریف لائے تو شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی صاحب۔ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار۔ سید عبدالقادر صاحب اور سر شہاب الدین صاحب اسپیکر اسمبلی نے ملاقاتیں کیں۔ مولوی غلام محی الدین صاحب قصوری (جن کا نام ۳۱۳ صحابہ کی لسٹ میں نمبر ۱۶۲ پر درج ہے۔ مگر بعد میں احمدیت کے بارے میں خاموش ہو گئے۔) اور سر شہاب الدین صاحب نے حضور کے اعزاز میں دعوتیں بھی کیں۔

۲۔ مارچ ۱۹۲۷ء کو سر محمد شفیع صاحب کی زیر صدارت حضور نے بریڈلاء ہال میں ’’ہندو مسلم فسادات ان کا علاج

اور مسلمانوں کا آئندہ طریق عمل'' پر سیر کن بحث فرمائی

۳۔ مارچ کو حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج میں ڈاکٹر اقبال کی زیر صدارت ''مذہب اور سائنس'' پر ایک پر مغز تقریر فرمائی ڈاکٹر صاحب نے صدارتی ریمارکس میں کہا:۔

''ایسی پُر از معلومات تقریر بہت عرصہ کے بعد لاہور میں سننے میں آئی ہے اور خاص کر جو قرآن آیات سے مرزا صاحب نے استنباط کیا ہے وہ تو نہایت عمدہ ہے۔''

۱۲ جنوری ۱۹۲۸ء کو حضور پھر لاہور آئے تو اس مرتبہ اپنے برادر نسبتی ڈاکٹر'' خلیفہ تقی الدین احمد صاحب کے ہاں لاہور چھاؤنی میں قیام فرمایا۔ ایک نہایت مصروف ہفتہ گزار کر ۱۸۔ جنوری کو واپس گئے۔

۲۵۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو حضور علاج کے سلسلہ میں آئے اسی طرح وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک تقریر ''ام الالسنہ'' پر حضور نے زیر صدارت پروفیسر برکت علی صاحب قریشی وائس پرنسپل اسلامیہ کالج فرمائی۔

۱۹۴۳ء میں سیدہ ام طاہر بہت بیمار ہو گئیں تو ان کو لیڈی ولنگڈن ہسپتال عقب شاہی مسجد لاہور میں داخل کرایا گیا۔ مگر بعض دقتوں کی وجہ سے آخر ان کو سر گنگا رام ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا وہاں وہ ۵۔ مارچ ۱۹۴۴ء کو ۱/۲، ۲ بجے دوپہر مولائے حقیقی سے جا ملیں۔ ان کی بیماری کے دوران حضور ۱۳ ٹمپل روڈ پر شیخ بشیر احمد صاحب ایڈووکیٹ کے ہاں مقیم رہے۔ حضورؓ کا قیام اس کوٹھی کے چوبارہ میں تھا۔

یہ کوٹھی نمبر ۱۳ ٹمپل روڈ جماعت احمدیہ کے لئے بہت ہی قابل دید جگہ ہے کیونکہ اسی کوٹھی میں حضرت کو ایک خواب کے ذریعہ انکشاف ہوا کہ مصلح موعود حضور ہی ہیں۔ چنانچہ حضور نے ۲۸۔ مئی جنوری ۱۹۴۴ء کو خطبہ جمعہ میں تفصیل سے بیان کیا۔

۲۵۔ فروری ۱۹۴۵ء کو حضور نے کمیونزم کے خلاف ۲/۱، ۲ گھنٹے تقریر کی جس کی صدارت رام چندر منچندا صاحب مشہور ایڈووکیٹ نے کی۔ یہ تقریر ''اسلام کا اقتصادی نظام'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

آخر کار تقسیم ملک کے بعد حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانیؓ جماعت کی بہتری کے لئے ۳۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کو قادیان سے ہجرت کر کے مستقل طور پر لاہور تشریف لے آئے۔ اور رتن باغ میں قیام فرمایا۔ باغ تو کسی زمانہ میں ہوتا تھا اب تو وہ نہایت اعلیٰ قسم کا محل ہے جو حضور کو الاٹ ہوا تھا۔ رتن باغ کے متصل رائے بہادر جودھامل صاحب کی عظیم بلڈنگ بھی جماعت کو مل گئی۔ جہاں عارضی طور پر صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر کھول دیئے گئے۔ رتن باغ میں تمام خاندان حضرت مسیح موعود کا قیام تھا۔ اور ان سب پر حضرت ام المومنینؓ صاحبہ کا سایہ تھا۔

اسی جگہ حضرت مولوی عبدالرحیم نیر رضی اللہ عنہ۔ حضرت مولانا شیر علی رضی اللہ عنہ اور حضرت صوفی غلام محمد رضی اللہ عنہ' کے جنازے ہوئے۔ رتن باغ کے نزدیک ایک چھوٹا سا میدان ہوتا تھا اب تو عمارتیں بن چکی ہیں وہاں پر جلسہ سالانہ قادیان کی طرز پر ۲۷۔ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو جلسہ ہوا۔

تعلیم الاسلام کالج قادیان کی عظیم الشان عمارت مع بے شمار ساز وسامان ۔سائنسی سامان اور نہایت قیمتی کتب خانہ کے چونکہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا تھا اس کے عوض گورنمنٹ نے گویا بڑا احسان کر کے جماعت کو دیا نندا ینگلو ورنیکلر کالج (متصل ڈسٹرکٹ کورٹس) جو خالص ہندوانہ طرز تعمیر کا نمونہ تھا دے تو دیا مگر اس میں نہ فرنیچر تھا نہ دروازے اور کھڑکیاں تھیں ۔ بڑی مشکل سے کافی رقم خرچ کر کے سامان مہیا کیا گیا۔ایک کانووکیشن بھی یہاں منعقد ہوئی تاہم حاسدین کی نظر لگ ہی گئی ۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ والوں نے سوال اٹھادیا کہ ڈی ۔اے ۔وی کالج کی عمارت ان کو دے دی جائے ۔آخر کار وہ عمارت بھی ہمارے ہاتھوں سے جاتی رہی مگر خدا تعالیٰ کی ذرّہ نوازی کے قربان جائیے کہ اس نے جماعت کو اپنے چندہ سے ربوہ میں عظیم الشان کالج مع ہوسٹل کے دے دیا اور اب تو اسے وسیع کر کے سائنس کالج بنایا جا چکا ہے۔

(ماہنامہ خالد اپریل ۱۹۷۵ء قسط نمبر ۲)

لاہور میں احمدیوں کیلئے قابلِ دید مقامات (3)

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب ایم اے رضی اللہ عنہٗ

حضرت صاحبزادہ صاحبؓ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال کے وقت لاہور میں ہی موجود تھے۔ حضرت خلیفة المسیح الاولؓ کے حکم سے آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ حضرت میاں صاحبؓ کی وفات ۳۔ ستمبر ۱۹۶۱ء کو کوٹھی نمبر ۲۳ ریس کورس روڈ میں ہوئی اور جنازہ ربوہ لایا گیا۔

قیام رتن باغ کے دوران میں یکم اپریل ۱۹۵۳ء کو مارشل لاء والوں نے حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحبؓ اور حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب۔ ایدہ اللہ کو بغیر کسی معقول وجہ کے گرفتار کیا اور ۲۸۔ مئی ۱۹۵۳ء کو رہائی ہوئی۔

یہاں پر احمدیہ ہوسٹل کا ذکر کرنا بھی نہائت ضروری ہے اس کا قیام تو ۱۹۱۵ء میں ہوا تھا۔ پہلے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے بالکل قریب ایک مکان کرایہ پر لیا گیا پھر حضرت نواب محمد علی خان صاحب کے ارشاد کے مطابق گوالمنڈی میں ایک مکان لیا گیا جس کے سپرنٹنڈنٹ بابو عبدالحمید صاحب ریلوے آڈیٹر تھے۔ کل طلباء ۱۵ تھے۔ مولانا غلام رسول صاحب راجیکیؓ درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ حضرت امیر المومنین جب بھی لاہور تشریف لاتے تو بچوں کی دلجوئی اور تربیت کے خیال سے وہیں قیام فرماتے۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں نسبت روڈ پر گندہ نالہ کے قریب دیال سنگھ کالج کے پہلو میں ایک کوٹھی لی گئی۔ اس کے ساتھ والی کوٹھی یعنی مجیٹھہ ہاؤس حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب مدظلہ کی ہوتی تھی۔ فروری ۱۹۲۲ء میں جب حضور پرنس آف ویلز سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تو اسی کوٹھی میں قیام فرمایا تھا۔

۱۹۲۵ء سے احمدیہ ہوسٹل ۳۶۔ ایمپرس روڈ کی کوٹھی میں چلا گیا۔ شیخ محمد علی صاحب سپرنٹنڈنٹ ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد کوٹھی ''الفیض''، لٹن روڈ پر کرایہ پر لی گئی جہاں شیخ فضل کریم صاحب پراچہ سپرنٹنڈنٹ تھے بعد میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب بھی سپرنٹنڈنٹ رہے۔ سب سے آخر میں احمدیہ ہوسٹل کوٹھی ۳۵ ڈیوس روڈ میں منتقل ہوا۔ تقسیم کے وقت یہ کوٹھی حضرت مولوی رحمت علی صاحب مبلغ انڈونیشیا کو الاٹ ہوئی اور اب تک ان کے فرزند چوہدری عطاء اللہ صاحب ایڈووکیٹ رہائش رکھتے ہیں۔

بعض متفرق اُمور

(۱) ڈاکٹر میجر شاہ نواز خان کے والد محترم چوہدری مولا بخش صاحب ریڈر سیشن کورٹ سیالکوٹ نے منارة المسیحؑ قادیان کے لئے ایک کتبہ سنگِ مرمر کا تیار کرایا جو دروازے کے عین اوپر نصب ہے۔ یہ پتھر ۱۹۱۵ء میں شاہ

عالمی گیٹ کے عین باہر ایک دوکان سے تیار کرایا گیا تھا۔ راقم الحروف کو خوب یاد ہے کہ جب چوہدری صاحب اور میرے والد صاحب اسے لینے کے لئے گئے تو میں بھی ہمراہ گیا تھا۔ مزنگ کے اڈہ سے شاہ عالمی تک دو پیسے فی کس ادا کئے گئے تھے۔

(۲) ۱۹۱۴۔۱۹۱۵ء میں بیڈن روڈ ساری خالی پڑی تھی۔ جہاں آج کل بیڈن روڈ اور کوپر روڈ کا چوک ہے اس کے قریب ہی حضرت قاضی حبیب اللہ صاحب صحابی کے کچے مکانات اور ٹال لکڑی و کوئلہ تھی۔ میرے والد صاحب اور ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کڑک دونوں حضرت قاضی صاحب کے ہاں جا کر تہجد ادا کیا کرتے تھے۔

(۳) گورنمنٹ کالج میں بے شمار احمدی طلبا تعلیم پاتے رہے ہیں۔ جن میں سے حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب (موجودہ خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز) صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب۔ اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب آج تمام دنیا میں شہرت پائے ہوئے ہیں۔ قاضی محمد اسلم صاحب گورنمنٹ کالج کے پرنسپل رہے ہیں۔ ان کے بھتیجے قاضی محمد رفیق صاحب میو کالج آف آرٹس کے وائس پرنسپل رہے ہیں۔

(۴) اسی طرح ہائی کورٹ کی عمارت میں خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے خاندانی مقدماتِ اراضی کے سلسلہ میں تشریف لاتے رہے ہیں۔ حکیم محمد حسین صاحب ''مرہم عیسیٰ'' کا تاریخی واقعہ بھی یہیں پر ہوا۔ (تفصیل کے لئے حکیم صاحب کی تصنیف ''طبی مائۃ عامل'' ملاحظہ فرمائیں)

(۵) تیسرا تاریخی مقدمہ انگریزی اخبار ''مسلم آؤٹ لک'' کا ہوا سید دلاور شاہ صاحب احمدی اس کے ایڈیٹر تھے مگر دراصل مضامین ایک عیسائی شخص لکھا کرتا تھا۔ ۱۴ جون ۱۹۲۷ء کے پرچے میں .Resign کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون لکھا گیا جس پر ہائی کورٹ نے اپنی ہتک محسوس کی۔ مقدمہ ہوا محترم چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب مدظلہ نے ایسی پیاری بحث کی کہ پانچوں جج لاجواب ہو گئے مگر تحکم کے طور پر اپنے اختیارات کو استعمال میں لا کر سید صاحب اور ان کے پرنٹر نور الحق صاحب کو سزا دے دی تھی

برطانیہ کے عدل کا نکلا جنازہ آج
دوشِ صبا پر آئی خبر یہ مزنگ سے

(۶) چوتھا تاریخی اہمیت کا مقدمہ منیر کمیشن کی تحقیقات تھی اس میں چونکہ ہدف دراصل جماعت احمدیہ تھی۔ تاہم حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور محترم چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کے تاریخی بیانات یہاں ہوئے۔ پھر اس پر جرح اور ہمارے وکلاء محترم شیخ بشیر احمد صاحب محترم چوہدری محمد اسد اللہ خان صاحب اور ملک عبدالرحمان خادم رضی اللہ عنہ کی نہایت فاضلانہ بحث ایک یادگار چیز تھی۔ مطبوعہ رپورٹ مطالعہ کرنی چاہیئے۔

(۷) موچی دروازے کے اندر داخل ہو کر چند قدم کے فاصلہ پر حضرت حافظ عبدالجلیل صاحب کا مشہور دواخانہ تھا آپ نے ۱۹۱۸ء سے کام شروع کیا اور ۱۹۷۳ء (تاوقتِ وفات) جاری رکھا۔ آپ حضرت شیخ غلام احمد

صاحب نومسلم کے برادرِ نسبتی تھے۔

(۸) حضرت ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نہایت مخلص صحابی تھے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے خسر تھے آپ اندرون موچی دروازہ کے رہنے والے تھے۔

(۹) ٹمپل روڈ چوک بھونڈ پورہ کے نزدیک ایک مخلص احمدی سردار فضل حق صاحب رہا کرتے تھے جو سکھوں میں سے قبول اسلام کر کے آئے تھے ہمارا گھر چونکہ وہیں قریب ہی تھا میں اپنے والد صاحب کے ہمراہ ان کے گھر اکثر جایا کرتا تھا۔

اسی شہر میں ریڈ کلف کمشن کے سامنے محترم چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے مسلم لیگ کی طرف سے وہ تاریخی بحث کی تھی جس پر مسلمانوں نے نعرہ ہائے تحسین لگائے تھے اور قائد اعظم کا دل خوش ہو گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ سر سائرل ریڈ کلف نے بددیانتی کی۔ چوہدری صاحب موصوف نے یہ کیس مفت پیش کیا تھا۔

(میں سمجھتا ہوں کہ یہ مضمون ابھی تشنہ تکمیل ہے اگر کوئی صاحب اس کو آگے بڑھائیں تو ممنون ہوں گا)

(ماہنامہ خالد مئی ۱۹۷۵ء قسط نمبر ۳)

ہمارا سالانہ جلسہ

سیدنا حضرت اقدس مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشادِ الٰہی کی بناء پر ۱۸۹۱ء میں قادیان میں سالانہ جلسہ کی بنیاد رکھی۔ پہلا جلسہ ۲۷۔۲۸۔۲۹ دسمبر ۱۸۹۱ء کو مسجد اقصیٰ قادیان میں ہوا جس میں ۷۵ آدمی شریک ہوئے۔

دوسرا جلسہ ۲۷۔دسمبر ۱۸۹۲ء کو ہوا اس میں ۳۲۵ احباب بیرون قادیان سے شریک ہوئے اور ۱۷۵ قادیان اور گردونواح کے تھے۔ اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرت اقدسؑ کے خسر جناب میر ناصر نواب دہلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ باقاعدہ بیعت کر کے داخل سلسلہ ہوئے۔

حضورؑ فرماتے ہیں۔

''اس جلسہ کو معمولی انسانی جلسوں کی طرح خیال نہ کریں یہ وہ امر ہے جس کی خالص تائیدِ حق اور اعلائے کلمۃ اللہ پر بنیاد ہے۔ اس سلسلہ کی بنیادی اینٹ خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے رکھی ہے اور اس کیلئے قومیں تیار کی ہیں جو عنقریب اس میں آملیں گی۔ یہ اُس قادر کا فعل ہے جسکے آگے کوئی بات انہونی نہیں ہے۔''

''دوستوں کو محض للہ ربانی باتوں کے سننے کیلئے اور دعا میں شریک ہونے کیلئے اس تاریخ پر آجانا چاہیئے اور اس جلسہ میں ایسے حقائق اور معارف کے سُنانے کا شغل رہے گا جو ایمان اور یقین اور معرفت کی ترقی دینے کیلئے ضروری ہیں اور نیز اُن دوستوں کیلئے خاص دعائیں اور خاص توجہ ہوگی۔ اور حتی الوسع بدرگاہِ ارحم الراحمین کوشش کی جائے گی کہ خدائے تعالیٰ اپنی طرف ان کو کھینچے اور اپنے لئے قبول کرے اور پاک تبدیلی اُن میں بخشے''

یہ جلسہ مرکز سلسلہ میں ہر سال ۲۶۔۲۷۔۲۸ دسمبر کو ہوتا ہے۔ یہ عام دنیاوی میلوں کی طرح نہیں ہے جو لوگ اپنے کاروبار چھوڑ کر آرام کو خیرباد کہہ کر کافی روپیہ خرچ کر کے اور راستے کی تکالیف اُٹھا کر آتے ہیں یہاں پہنچ کر ایک قسم کا روحانی سکون پاتے ہیں۔

ربوہ میں آنا مشکل نہیں ہے۔ اصل مسئلہ تو یہاں سے واپسی کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں سے واپس جانے کو دل مانتا ہی نہیں۔ اس قدر کشش ہوتی ہے کہ واپسی کیلئے دل آمادہ ہی نہیں ہوتا بہانے بہانے سے ٹھہرنے کو دل چاہتا ہے۔ حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات میں بے پناہ مقناطیسی کشش ہے۔ صحابہ اور صحابیات مسیح موعودؑ ہیں۔ مبلغین اسلام ہیں جو دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کی تبلیغ کر کے لوٹے ہیں۔ ان کی پُر معرفت باتیں اور ایمان پرور واقعات سنکر ایک سعید انسان کا خدا تعالیٰ کی ذات پر اور پختہ یقین ہو جاتا ہے۔ اُن دنوں یہاں کی تمام مساجد نمازیوں سے پُر ہوتی ہیں جو نہایت انہماک سے تسبیح و درود میں محو ہوتے ہیں۔ لوگ مقامات مقدسہ

پر دعائیں کر کے سکون قلب پاتے ہیں۔ بہشتی مقبرہ میں بزرگان سلسلہ کے علاوہ اپنے عزیز واقارب، دوست اور واقف دفن ہوتے ہیں ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں۔ اسکے علاوہ دنیاوی تجارت، رشتے ناطے اور دیگر امور طے پاتے ہیں۔ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے احمدیوں سے تعارف ہوتا ہے اور مختلف مسائل اور تجارب سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ غرض یہاں آ کر بعض اوقات مرکز سلسلہ سے دُوری کے باعث جو دلوں پر ایک ہلکی سی تہ زنگ کی لگنے لگتی ہے فوراً دُور ہو جاتی ہے اور گناہوں سے زخمی قلوب مرہم حاصل کرتے ہیں۔

ان دنوں مہمانوں کی رہائش اور خصوصاً کھانے کا اس قدر اچھا انتظام ہوتا ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے۔ دو گھنٹے میں سب کو کھانا مہیا کر دیا جاتا ہے۔

اب آپ اگر ربوہ کی کشش سے دامن چھڑا سکتے ہیں تو چھڑا کر دیکھیں تو سہی ؎

جس کی فطرت نیک ہے آئے گا وہ انجام کار

ہمارے پیارے خلیفہ سیدنا حضرت مرزا ناصر احمد ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ایک خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ گزشتہ سالوں کی نسبت امسال جلسہ کی حاضری پہلے سے بڑھ کر ہوگی۔

گزشتہ سال جلسہ پر ایک لاکھ سے زیادہ افراد آئے تھے اور بڑی رونق تھی۔ اس سال تو ہمیں اللہ کے فضلوں پر بڑی امید ہے۔ بچے ابھی سے خود بھی تیار ہو جائیں اور اپنے امّی ابّا کو تیار کرنا شروع کر دیں اور جلسہ کی برکتوں سے اپنی جھولیاں بھر لیں۔

(تشحیذ الاذہان دسمبر ۱۹۷۴ء)

ہندوستان میں مذہبی آزادی

ہندوازم ایک غیر تبلیغی مذہب ہے۔ مسئلہ تناسخ ہندو مذہب کا ایک نمایاں اصول ہے۔ شدید قواعد کی رُو سے ایک ہندو ذات پات کی قیود کے اندر جکڑا رہتا ہے۔ یہ بندھن اس جنم میں توٹوٹ نہیں سکتے۔ ہندوؤں کی یہ راسخ العقیدگی اجازت نہیں دیتی کہ مرتد اشخاص کو پھر سے اپنے مذہب میں لوٹایا جائے۔ کوئی راسخ العقیدہ ہندو مبلغ نہیں ہوسکتا۔

تبلیغی رُوح ابتداء سے ہی اسلام اور عیسائیت کا نمایاں وصف رہا ہے۔ ان دونوں مذاہب اور ہندوازم میں یہی بیّن فرق ہے۔ تبلیغی مساعی کے پس پشت جو مقصد ہے وہ یہی ہے کہ دونوں ہی اس مضبوط عقیدہ پر قائم ہیں کہ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ رسولوں کے ذریعہ سلسلہء الہام جاری رہتا ہے۔ مسلمان اور عیسائی یہ مانتے ہیں کہ ان کے مذاہب ایک ابدی نور سے رہ نمائی کر سکتے ہیں۔ اپنی تبلیغی مساعی میں وہ اس بات سے سرشار نظر آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور خدمتِ خلق کریں گے۔

اسلام نسلی مذہب نہیں اس لئے اس کی بنیاد ہی تبلیغ پر ہے۔ مگر عیسائیت اسرائیل کے گھرانے کا مذہب ہے اس لئے اصل عیسائیت کا دائرہ تبلیغ تو یہودی قبائل تھے۔ ہاں بعد ازاں عیسائیت نے دیگر مصلحتوں کی بناء پر ساری قوموں کو عیسائیت کی دعوت دینی شروع کر دی۔

مندرجہ بالا ذہنیت کے پیش نظر ہر مہذب گورنمنٹ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ تمام مذاہب کے پرستاروں کو جواُن کے جھنڈے تلے بستے ہوں مکمل طور پر مذہبی آزادی دے۔ اسکا یہ مطلب ہے کہ ہر ملک کی رعایا کو اُس کی گورنمنٹ کی حمایت حاصل ہو تا وہ اپنے رسم ورواج کے مطابق اپنے مذہب پر عامل ہو سکے، یا یہ کہ جب وہ صدق دل سے اپنے پسند کردہ مذہب کی حقانیت کے قائل ہو جائیں تو اس مذہب میں داخل ہو سکیں۔ نیز اس بات کا یقین دلایا جائے کہ وہ اپنے طریق پر خالص مذہبی زندگی بسر کر سکیں۔

جس طرح اوپر بیان ہوا ہے اسی کے مطابق اسلام نے ملکی آزادی دی ہوئی ہے۔ قرآن مجید نے یہ اصول مقرر فرمائے ہیں اور حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے اپنی مثال سے ثابت کر دکھلایا ہے۔ ”لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن“۔ یعنی تم اپنے مذہب پر قائم رہو اور میرے لئے میرا مذہب کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف بلاؤ عقلمندی سے اور نرمی سے اور دلیل سے۔ اور نرم طریق اختیار کرو۔

مدینہ میں آنحضرت ﷺ نے یہود کو ایک سند عطا فرمائی تھی جس کی رو سے

(۱) مسلم اور یہود کو مکمل آزادی حاصل تھی۔

(۲) دیوانی اور فوجداری مقدمات جو مدینہ میں ہوتے وہ ہر فرد کے مذہب کے مطابق طے کیئے جاتے تھے۔

تاریخ بیان کرتی ہے کہ کس طرح آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں نجران کے عیسائیوں سے مذہبی گفتگو کی اور ان کو اجازت دی کہ وہ اپنی مذہبی رسوم مسجد نبوی میں ادا کرسکیں۔ اُس دن سے لے کر آج تک جہاں بھی حقیقی اسلام پہنچا ہے زبردستی مذہب تبدیل کرنا اور عدم رواداری غائب ہوگئی ہے۔ اُوپر بیان کردہ اصولوں پر عمل ہندوستان میں مسلم حکومت پیش کرتی ہے۔ مسلمانوں کی قریباً ایک ہزار برس تک مسلسل اور شاندار حکومت کے دوران میں برصغیر کی اکثریت ہندو رہی ہے۔ دہلی اور آگرہ جو مسلم گورنمنٹ کے دارالحکومت تھے اور ان کے گردونواح کا علاقہ جہاں انہوں نے آرٹ تعمیر اور انسانی زندگی کے ہر شعبے میں زندہ یادگاریں چھوڑی ہیں وہاں مسلم صرف خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی تبلیغی جدّ وجہد پُرامن طریقوں سے، مسلمان تجار کے ذریعہ اور مسلمان صوفیاء کے ذریعہ جاری رکھی اور یہ صوفیاء۔۔۔۔ہی اصل معنوں میں اصل مبلغ تھے اور اب تک ہندو ان کی عظمت تسلیم کرتے ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ہر مسلمان جو باہر نکلتا ہے وہ مبلّغ ہوتا ہے۔ یہ بات بھارت اور دیگر ممالک میں خوب ثابت ہے۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے ہندو یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتے کہ مذہب تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ وہ علانیہ کہتے ہیں کہ ہندوازم بہت ہی رواداری کا عقیدہ ہے کیونکہ یہ دوسرے مذاہب سے آمدہ لوگوں کو قبول نہیں کرتا۔ وہ اپنے مذہب کی رواداری کا بہت ڈھول پیٹتے ہیں کہ وہ دوسرے عقیدہ رکھنے والوں سے بہت زیادہ رواداری سے پیش آتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں کو ہندو مذہب میں لے لیا تھا اور ان کو مکمل مذہبی آزادی دے رکھی تھی کہ اپنے عقیدے کا پرچار کرسکیں۔

یہ بات اپنے نقطۂ عروج کو تب پہنچتی ہے جب تقسیم کے بعد کے زمانہ میں بھارت نے اپنے آپکو جمہوریت ظاہر کیا ہوا اور حکومت کو ایک غیر مذہبی حکومت ہونے کا اعلان کیا ہو؟ اس ضمن میں ایک لادینی حکومت کا تصوّر یہ ہوا کہ وہاں پر مذہبی آزادی اور رواداری ہوگی۔

موجودہ دور میں بعض ادارے ایسے پیدا ہوگئے ہیں۔ جن میں سے ہندو مہا سبھا ایک ہے۔ یہ بھارت میں ہندوازم کا عروج چاہتی ہے اور رواداری کی پالیسی کو مٹانا چاہتی ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کیلئے انہوں نے دو طریق تجویز کرلئے ہیں۔

(۱) انہوں نے بھارت کے چار کروڑ مسلمانوں کو خبردار کر دیا ہے کہ وہ (ہندو مہا سبھا) اُن کو شُدھ ......یعنی پاک صاف۔ ستھرا و مصفا....کرے گی اور ان کو ہندو دھرم میں واپس لیگی۔ حقیقت میں اس جدید عقیدہ کے علم برداروں نے پہلے ہی مسلمانوں کی ایک معقول تعداد کو جبری طور پر شدھ کرلیا ہے۔

(۲) انہوں نے مسیحی اور مسلم مبلّغین کے خلاف باقاعدہ مہم جاری کررکھی ہے۔ ان کا مطالبہ ہے ' عیسائی

مشنریوں کی سرگرمیاں بند کردی جائیں۔عیسائی مشنری اوروہ کمیٹیاں جوان کوآسٹریلیا، یورپ اورامریکہ سے بھجواتی ہیں وہ بھی اس خطرے سے آگاہ ہیں۔ان کو یقین ہے کہ آگے چل کرضرور کہیں بُحران پیدا ہوگا۔تبلیغی مساعی کے خلاف ان تمام سرگرمیوں کا مقصد محض یہ ہے کہ عیسائی مشنری بوریا بستر باندھ کر بھارت سے رخصت ہوجائیں۔ان کے سامنے چین کی مثال ہے۔یہاں آکر اصل سوال سے ہم دوبدو ہوتے ہیں۔آیئے ہم اسکی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

ا۔ ہندوازم کی مثال یوں ہے جیسے کہ ایک بہت بڑا اسفنج ہو جواپنے اندر تمام اجنبی عناصر جذب کرسکتا ہے۔ ہندو یہ سمجھتا ہے کہ مذہب اپنے آپ کو بے شمار طریقوں پر نمایاں ظاہر کرسکتا ہے۔جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے وہ اس بات کا سخت مخالف ہے کہ کوئی تبدیلی کی جائے:۔

عیسائی مبلغ اسبارے میں اپنی بات یوں پیش کرتا ہے۔

''ہمارے مذاہب مخالف محوروں پر گھومتے ہیں۔بھارتی عیسائی کچھ ہندوازم کو جذب کریں اور ہندو کچھ مسیحی اصولوں کو جذب کریں۔مگر یہ بات کہ ہندوازم اور عیسائیت کا اتحاد ہوجائے ناممکن ہے۔''

(کرسچن سنچری ۱۶ جون ۵۴ء)

ایک مسلمان بھی یہی بات دُہرائے گا مگر بہت زیادہ زور سے۔اسلام .... عالمگیر بھائی چارہ اسکا سب سے نمایاں وصف ہے۔مسلمان اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ قبر کے بعد ایک ابدی زندگی بھی ہے اور یوم القیامت بھی ہے۔شرک۔اونچ نیچ اور ذات پات مسلمانوں کے نزدیک لغو عقیدے ہیں۔لہذا مذہبی نقطہ نگاہ سے ہندوازم اور اسلام کے درمیان اتحاد ممکن نہیں۔

نظر تعمق سے اگر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مخالف تبلیغ اور مخالف تبدیل سرگرمیوں کی تہہ میں قومیت اور سیاسیات کارفرما نظر آئیگی۔ہندوؤں کو یہ خیال ہے کہ مسلم یا مسیحی اقوام میں بڑھوتی یا کسی بھی قوم میں ایزادی ہمارے سیاسی درجہ اور تمدنی ورثہ کے لئے خطرہ ثابت ہوگی۔ان کی شدید خواہش ہے کہ بھارت کے تمام باشندے خواہ وہ کسی نسل، رنگ یا عقیدہ کے ہوں وہ بہر حال اکثریت کے مذاہب اور تمدن پر چلیں یعنی ہندوازم پر ا وہ ادارے جوان خیالات کے علم بردار ہیں وہ بھی اعلان کردیں گے کہ بھارت ایک دینی حکومت ہے اور ہندوازم حکومت کا مذہب ہے اوراس حکومت کا صدر ہندو دھرم کا محافظ ہے۔

ایسے ہی سیاسی اور قومی نظریات کے ماتحت ہندوؤں نے بدھ مت کو بھارت سے نکال باہر کیا تھا۔چنانچہ ایچ۔ جی ویلز لکھتے ہیں کہ:۔

''کچھ عرصہ تک تو بدھ مت ہندوستان میں خوب پھیلا مگر برہمن مت جس کے کئی خداوند اور لاتمناہی عبادتیں ہیں وہ بھی اس کے پہلو بہ پہلو فروغ پاتا رہا۔برہمن مت اس قدر طاقت پکڑ گیا کہ آخر کار وہ اس قابل ہوگیا کہ اس ذات پات کے منکر مذہب کو ہندوستان سے کلیتہً باہر پھینک دے۔مظالم اوراس کا ردِعمل بھی ہوا مگر گیارھویں صدی

میں سوائے اڑیسہ کے بدھ تعلیمات ہندوستان سے معدوم ہوگئیں۔''

(آؤٹ لائن آف ہسٹری ص ۳۷۸)

۳۔ ہندو اپنے اس عقیدے میں بڑے پکّے ہیں کہ مذہب میں تبدیلی نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی عقیدہ کی علم برداری کرتے ہوئے ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا کہ:۔

''اگر میرے پاس طاقت ہوتی اور میں قانون مرتب کرسکتا تو تبدیلی مذہب کو بند کرادیتا۔''

تاہم وہ مشنریوں کو آنے تو دیتے تھے اور اُن کو خدمتِ خلق کا کام کرنے دیتے تھے۔ ایک مبلغ کے لئے یہ قبول کرنا نہایت ہی ناممکن سی بات ہے کہ محض بیماروں کو اچھا کرے، بھوکوں کو کھانا کھلائے، غریبوں کی امداد کرے اور اَن پڑھوں کو تعلیم دے۔ یہ تمام باتیں بھی تو خدمتِ خلق ہیں۔ پس اگر آپ اسے مذہب تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے اور اس طرح بیماروں کو بچانے نہ دینگے تو آپ اُس کے اندر سے اُس کی رُوح سلب کر لینگے جب تک آپ لوگوں کی رُوح نہیں بچاسکتے اور اُن کو ابدی راحت کے راستے پر نہیں ڈال دیتے۔ آپ کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی پودے کو پانی تو دے مگر ساتھ ہی اس کی جڑ بھی کاٹ رہا ہو۔ اور یہ ہر ایک مبلغ کا نقطۂ نگاہ ہے خواہ وہ کسی مذہب وملّت سے تعلق رکھتا ہو۔

یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو عیسائیوں سے اُن کے بعض اہم عقائد مثلاً الوہیت مسیحؑ، کفارہ اور تثلیث وغیرہ سے سخت اختلاف ہے۔ ہمارے لئے یہ اصولی بات ہے اور ہم اس کے شدید حامی ہیں کہ مذہبی آزادی ہر قوم کے ہر فرد کا پیدائشی حق ہے۔

اس بات کے پیش نظر کہ بھارت میں اس وقت کیا ہو رہا ہے، خاص طور پر مسلمانوں اور عیسائیوں پر کیا گذر رہی ہے، وہ لامذہبیت جس کا ڈھول عرصہ سے پیٹا جارہا تھا محض فریب ثابت ہوا ہے۔ اگر بہادر ہندو مہاسبھا کو ۱۹۵۶ء کے انتخابات میں اکثریت حاصل ہوگئی (اور اس کے حصول کیلئے وہ سرتوڑ کوشش کررہے ہیں) تو بھارت سے سیکولرازم عنقا ہوجائیگا۔ اور اس کی جگہ ہندو مذہبی حکومت لے لیگی۔ تب غیر ہندو مذہب کا مستقبل بھارت میں سخت تاریک ہوجائے گا۔

ہماری دلی خواہش ہے کہ وزیرِاعظم نہرو جو ایک جری بین الاقوامی شخصیت ہیں اور عالمگیر صلح کے حامی ہیں ان جدید اداروں کے شوروغوغا کے آگے نہیں جھکیں گے اور مذہبی آزادی کو ہاتھ سے نہ دیں گے جو صلح کیلئے بنیادی چیز ہے ورنہ بھارت پھر سے بربریت اور جاہلیت کے زمانہ میں جاپڑے گا اور تاریخ اسکے خلاف سخت فیصلہ دے گی۔

ایک قابلِ غور فطرتی شہادت

دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالیں۔ آپکو معلوم ہوگا کہ دُنیا کے کچھ ممالک عیسائیوں کے قبضہ میں ہیں اور یہ ممالک کافی

زیادہ ہیں، کچھ ممالک اشتراکیت کے چنگل میں ہیں اور کچھ ممالک میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہیں اور بعض ممالک ہنود اور یہود کے قبضہ میں ہیں۔غرض ساری دنیا مذہبی اور سیاسی لحاظ سے تین چار حصوں میں منقسم ہے۔اشتراکیت کا مطمحِ نظر تو صرف انسان کیلئے روٹی اور کپڑے کا سوال ہے اور وہ اسی سبز باغ سے عوام میں قبولیت حاصل کرنا چاہتی ہے اس لئے وہ اور اس کے ممالک اس وقت ہماری بحث سے خارج ہیں۔

باقی ممالک جو مذہبی یا نیم مذہبی تحریکات کے زیر اثر ہیں۔ان پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کسی آبادی میں کسی الہامی کتاب کی حکومت قائم کرنے اور اسکے آئین وقانون کو نافذ کرنے کیلئے اس کے پیرووٴں کی طرف سے شدت سے اور اس کثرت سے مطالبہ نہیں ہو رہا جتنا کہ مسلمان کہلانے والوں کی طرف سے قرآنی نظام کے نفاذ کا مطالبہ ہو رہا ہے۔یہ سچ ہے کہ بعض خود غرض لوگ اس فطرتی پکار کو اپنے دُنیاوی مفاد کیلئے استعمال کرنا چاہتے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دُنیا بھر میں صرف قرآن مجید کی حکومت کے قیام کا مطالبہ ہی ہمہ گیر حیثیت رکھتا ہے۔ وید۔تورات۔انجیل وغیرہ کتب میں سے کسی کتاب کے بارے میں اُن کے پیرووٴں کی طرف سے ایسا مطالبہ موجود نہیں۔اس سے ظاہر ہے کہ دراصل الہامی کتابوں کے پیرووٴں کے دلوں کی آواز بھی وہی کہہ رہی ہے جو کچھ عرصہ قبل حضرت بابا نانکؒ نے فرمایا تھا کہ۔

توریت زبور انجیل ترے پڑھ سُن ڈٹھے وید
رہی کتیب قرآن کلجگ میں پروار

(الفرقان ستمبر ۱۹۵۴ء)

۱۴۔اگست ۱۹۴۷ء

محمد بن قاسم کے زمانہ سے لے کر آج تک ہندو اور مسلم دونوں ایک ملک میں رہے مگر چونکہ دونوں کی تہذیب، تمدن، دین، رسم الخط، رسم ورواج اور نقطہ ہائے نظر الگ الگ تھے لہذا کبھی بھی گھل مل کر نہ رہ سکے۔ ہندو مذہب محض ایک سوشل سسٹم ہے جس میں روحانیت کا کوئی حصہ نہیں۔ اِس مذہب نے اسلام کے ساتھ تو کیا مل کر رہنا تھا یہ تو بدھ مذہب کے ساتھ بھی نہ چل سکا جو دراصل یہاں کی ہی پیداوار تھی اور آخر کار اسے دیس نکالا دیکر ہی دم لیا۔

ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھ لیں یہ دونوں مذاہب ہمیشہ الگ الگ روش پر گامزن رہے۔

البیرونی نے جو محمود غزنوی کے ہمراہ آیا تھا اپنی تصنیف ''کتاب الھند'' میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کے تمام مظاہرے ان لوگوں کے خلاف ہوتے ہیں جو اُن کے مذاہب کے پَیرو نہ ہوں۔ یہ لوگ تمام غیر ملکیوں کو ملیچھ یعنی ناپاک کہتے ہیں۔

دوسرے لوگوں سے نہ سوشل تعلقات رکھتے ہیں نہ شادی بیاہ کرتے ہیں۔ نہ نشست و برخاست۔ اگر اُن سے چُھو جائیں تو ان کی ہر چیز بھرشٹ ہو جاتی ہے۔

سر ویلنٹائن چیرل اپنی کتاب Indian Unrest میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں سیاسی اتفاق کبھی نہیں ہوا سوائے کسی غیر ملکی فاتح کے ماتحت ہونے کے۔

مسلمانوں نے یہاں ایک ہزار سال کے قریب حکومت کی اور پھر ازلی قانون کے تحت زوال پذیر ہو گئے۔ انگریز آئے تو تجارت کرنے تھے مگر حاکم بن بیٹھے۔ ہندو قوم پہلے ہی مسلمانوں سے متنفر تھی، انگریز بھی مسلمانوں کو پسند نہ کرتے تھے، گویا مسلمان دونوں کے دھتکارے ہوئے بن گئے۔ K.M.Pannikar اپنی کتاب A Survey of Indian History میں لکھتے ہیں کہ یورپین بنیوں، ایسٹ انڈیا کمپنی اور کلکتہ کے مارواڑی سیٹھوں کے درمیان گویا ایک معاہدہ طے پا گیا تھا کہ مسلمانوں کو خوب لتاڑا جائے۔ انگریز تو اصل میں مسلمانوں سے سخت خائف تھے کہ یہ کہیں اپنی گم شدہ حکومت واپس لینے کی کوشش نہ کریں۔

یہ حالات تھے جب ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ڈھاکہ میں نواب سر محمد سلیم اللہ خان صاحب کے مکان پر ہوا اور مسلمانوں نے اپنی ہستی کی بقاء کے لئے جدوجہد شروع کی۔ ان لوگوں کے بُرے عزائم دیکھ کر محمد علی جناح جیسا بااصول کانگرسی بھی علیحدہ ہو گیا۔

۱۹۲۱ء میں مسلمانوں نے ٹرکی کی زوال پذیر خلافت کے لئے جوش دکھایا۔ اِس موقعہ پر کانگرس نے مسلمانوں سے بظاہر تعاون شروع کیا مگر دُور دُور رہتے ہوئے۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کے خرچ پر تمام ہندوستان کا دورہ شروع کر دیا۔ جس میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا جاتا تھا۔ مگر درپردہ انگریز کی مخالفت اپنے نقطہ نظر سے کرتے تھے۔

علی برادران نے جو گھمسان کی جگہ کود پڑتے تھے اسی جوش میں علیگڑھ یونیورسٹی کے خلاف بھی دھاوا بول دیا مگر کسی ہندو نے بنارس یونیورسٹی کے خلاف ایک حرف بھی نہ کہا۔ اور جب لارڈ ریڈنگ نے گاندھی سے شکوہ کیا کہ تم نے تمام ہندوستان میں آگ لگا دی ہے تو بڑی معصومیت سے کہہ دیا کہ میں تو ایک سال سے دورے پر ہوں، اخبار تک بھی نہیں دیکھ سکا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ علی برادران اور مسلمان لیڈروں نے کیا تقاریر کی ہیں۔ اسی موقعہ پر اکبرالہ آبادی نے یہ شعر کہا تھا ؎

بُدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
گو گردِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

خلافت کے شوق میں مسلمانوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیکر ہجرت بھی کی، قید ہوئے، مگر جلد ہوش میں آگئے اور اپنا ہی نقصان کر کے بیٹھ گئے۔ ایسی مَت ماری ہوئی تھی کہ مغضوب اللہ کافرِ اعظم شردھانند کو جامع مسجد دہلی کے منبر پر بیٹھ کر تقریر کی اجازت دیدی۔

اسی زمانہ میں شدھی کی تحریک ہندوؤں نے چلائی کہ تمام مسلمانوں کو شُدھ یعنی پاک کر کے اپنے اندر ضم کرلیں اور یہاں تک سکیم بنی کہ عرب میں ''اوم'' کا جھنڈا گاڑا جائے۔ ان دنوں ''آریہ مسافر'' رسالہ آگرہ سے شائع ہوا کرتا تھا۔ ظفر علی خان نے اسی رعایت سے حسب ذیل اشعار لکھے تھے ؎

سُنا ہے کہ اک آگرے کا مسافر
اُٹھائے ہوئے سر پہ ویدوں کے بستے
عراق عِرب میں پہنچ کر پکارا
نمستے علیکم۔ علیکم نمستے
کبھی بھاؤ مہنگا تھا ہندو دھرم کا
ہیں لیکن اب اس جنس کے دام سستے
یہ وہ بل ہے جس میں گھسا چاہتے ہیں
تمام اہل اسلام شدھی کے رستے
اگر دھوتیاں باندھ لیتے مسلماں
تو کیوں ان پہ اینٹ اور پتھر برستے

الغرض صدیوں سے اکٹھے رہنے کے باوجود ہندوؤں نے کبھی بھی مسلمانوں کے قریب آنے کی کوشش تو کیا کرنی تھی نفرت ہی کرتے رہے۔ کبھی ان کو بھائی نہ بنایا، ہاں سوتیلا بھائی ضرور سمجھا۔

غرضیکہ بے شمار دفعہ کوشش ہوئی مگر بے سود۔ ۱۹۳۰ء میں چودھری رحمت علی صاحب ہوشیار پوری نے جو اُن دنوں کیمبرج میں تعلیم پا رہے تھے ایک ٹریکٹ شائع کیا جس میں شمالی ہندوستان کے صوبوں کے ناموں کے پہلے

حروف سے لفظ پاکستان ایجاد کیا۔اس پر تمام دُنیا نے مذاق اُڑایا۔مگر ۱۹۳۰ء کے جلسۂ مسلم لیگ میں علامہ اقبال نے ابھی اپنے خطبۂ صدرات میں ایک ایسی ہی اسلامی سلطنت بنائے جانے کے متعلق اشارہ کیا۔

۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں سر چمن لال سیتلواد نے سر آغاخاں مرحوم اور قائداعظم محمد علی جناح کو ایک پرائیوٹ میٹنگ میں پوچھا کہ اگر کوئی قابل عمل تجویز طے پا جائے تو کیا مسلمان علیحدہ انتخاب کے حق کو چھوڑ دیں گے؟ انہوں نے کہا کہ اگر تم ہمارے جائز مطالبات مان لو گے تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔سر چمن لال نے پھر پوچھا کہ اگر تمام مطالبات پر ہمارا تمہارا اتفاق ہو جائے تو پھر؟ انہوں نے کہا تو ایسی صورت میں تم قیادت کرنا ہم پیچھے چلیں گے۔

مگر بعض کٹر مہاسبھائی ذہنیت کے لیڈروں نے اتفاق نہ کیا۔

دوسری گول میز کانفرنس کے موقعہ پر کوئی قابل عمل تجویز ہو جاتی تھی مگر گاندھی نے یہ ضد کر کے کہ صرف وہی تمام ہندوستان کی طرف سے واحد نمائندہ ہیں، کام خراب کر دیا۔نوآبادیاتی حکومت بھی نہ مل سکی۔اکبر نے خوب کہا ہے۔

اتحادِ باہمی اس ملک میں آساں نہیں
کوئی سر سیّد ہے کوئی بابو آسو توش ہے

سر آسوتوش مکر جی۔کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔انہوں نے بنگالی زبان میں تعلیم شروع کرائی۔ یونیورسٹی سر آسوتوش تھے اور آسوتوش یونیورسٹی۔مذہب سوامی ودیکانند کے پیرو تھے۔بہت قابل، لائق، ہمدرد، مگر پکے ہندو تھے۔

(:The Making of Pakistan (R.symands)

انگلستان سے کئی تجاویز آئیں، وفود آئے، نہایت مدبّر لوگ سر جوڑ کر بیٹھے مگر ہندو مسلم سوال حل نہ ہوا۔کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ پاکستان معرض وجود میں آئے گا۔ایک انگریز نے لکھا کہ ”حقیقت کے مَس سے ہی پاکستان غائب غلہ ہو جائے گا۔[۲]“

ہندو قوم پاکستان کی مخالفت میں یہاں تک آ گئی کہ وہ ڈومینین سٹیٹس قبول کر لے گی مگر پاکستان نہیں بننے دیگی۔۳۱مئی ۴۷ء تک گاندھی جی مسلمانوں پر برس رہے تھے کہ خواہ تمام ہندوستان کو آگ لگ جائے ہم پاکستان نہیں بننے دیں گے۔نہیں ہرگز نہیں بنے گا خواہ مسلمان تلوار کے ذریعہ ہی منوانا چاہیں ہم مخالفت کریں گے۔

مگر خدا کے بندے محمد علی جناح نے بنیوں جیسی شاطر قوم اور انگریز جیسی ہوشیار قوم سے آخر پاکستان کا اصول منوا ہی لیا۔

اب ہندوستان کی تقسیم کا سوال پیدا ہوا۔اس کے لئے ثالث کے طور پر لندن کے ایک انگریز بیرسٹر سر سائرل

ریڈکلف کو ثالث مان لیا گیا۔

اس نے ہندوؤں کی شہ پر ایک ایسی تقسیم کی جس پر عقلِ سلیم ہمیشہ گریاں رہے گی اور جو محیّر العقول ہے۔

قائداعظم کے دوستوں نے ان کو بہت کہا کہ آپ اس ثالثی فیصلہ کو رد کر دیں۔ اس میں صریح بے ایمانی کی گئی ہے مگر وہ مردِ مجاہد اپنے اصول کا پکا تھا۔ فرمایا کہ جب ہم نے اُسے ثالث مان لیا تھا تو اب اس کا فیصلہ بھی ماننا پڑے گا.............؟

پھر شاطرِ بساطِ فریب و ریاء سے آج
بے چارہ سادہ لوح مسلماں ہوا ہے مات
لائی ہیں رنگ دیر و کلیسا کی سازشیں
خنداں ہیں ساکنانِ حرم پر منات و لات

لارڈ مونٹ بیٹن کا پریس سیکرٹری ایلن کیمپبل جانسن اپنی کتاب Mission with Mountbatten میں لکھا ہے:۔

(ترجمہ) ''ریڈکلف نے پنجاب اور بنگال کے فیصلے پر ۱۲راگست کو دستخط کر دیئے تھے اور سلہٹ والے پر ۱۳راگست کو۔ ۱۶راگست کو مونٹ بیٹن نے ان کی اشاعت کی اور ۱۷۔ اگست کو عوام الناس کو بتایا۔''

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ۱۷راگست کو فیصلہ کیوں شائع کیا گیا جبکہ پاکستان ۱۴راگست سے معرضِ وجود میں آچکا تھا ؟ حقیقت یہ ہے کہ جواہر لال نہرو، مونٹ بیٹن اور کرشنا مینن نے مل کر اصل نقشۂ تقسیم میں ۱۲راور ۱۷راگست کے درمیان ریڈکلف سے تبدیلی کرائی تھی تا کہ گورداسپور کا مسلم اکثریت والا ضلع ہندوستان کو مل جائے اور اس کے بغیر ہندوستان کو کشمیر کا رستہ نہیں مل سکتا تھا۔

نیز چونکہ ۱۷راگست کو اتفاق سے عیدالفطر تھی۔ مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کرنے کے لئے یہ دن چُنا گیا۔ قادیان میں ۱۴، ۱۵راگست کو پاکستان کا جھنڈا لہراتا رہا۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر چیمہ نے چارج لے لیا اور قادیان سے ہوائی جہاز منگوا کر تمام ضلع کی صورتِ حال دیکھی۔ تمام طرف اطمینان کی لہر دوڑ گئی کہ چلو ہم لوگ پاکستان میں آ گئے مگر ۱۶راگست کو متوحش خبریں آنا شروع ہوئیں تا آنکہ (عید کی صبح) آل انڈیا ریڈیو نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ضلع گورداسپور کی تحصیل پٹھانکوٹ اور بٹالہ ہندوستان کو دیدی گئی ہیں۔

اس کے معاً بعد قائداعظم نے ہندوؤں سے مطالبہ کیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہمیں Corridor دیا جائے۔ اس پر ہندوؤں نے جو شور وغوغا مچایا وہ لیونرڈ ما سلے مصنف The Last days of British Raj کی زبان سے سُنئے:۔

(ترجمہ) ''کانگرسی لیڈروں نے اس مطالبے کا جواب یوں دیا جیسے کُتوں کی ٹولی کے درمیان پٹاخہ پھینک دیا جائے اور وہ خوف زدہ ہو کر چلانے لگ جائیں۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ پٹاخہ بے ضرر تھا تو کچھ سنبھل سے گئے۔''

مسلمان ہرگز تقسیم کے شائق نہ تھے ۔دیکھئے سر چمن لال اپنی کتاب Recollections and Reflections میں لکھتے ہیں:۔

(ترجمہ) ''تحریک پاکستان کی اصل بانی مبانی کانگرس تھی جنہوں نے فرقہ وارانہ سوال کو غلط طور پر چلایا اور جب ان کو حکومت ملی تو غلط رویہ اختیار کیا اور اس طرح اُس فرقے کے دماغ میں بے اعتمادی کی روح پھونکی جس کے باعث انہوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔''

خود لارڈ مونٹ بیٹن نے سردار پٹیل کو سمجھایا کہ فرض کرو مسلمان یہاں سے چلے جائیں تو ملک میں کس قدر امن چین ہو جائے گا اور کانگرس کی راہ میں روڑے اٹکانے والا کوئی نہ ہوگا۔تمام ملک میں ایک آزاد پارٹی ہوگی۔

قائداعظم کی رواداری اور نیک نیتی ملاحظہ ہو کہ ۱۵ر اگست تک صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب وزیراعظم تھے مگر جب انہوں نے پاکستانی پرچم کو سلام کرنے سے انکار کر دیا تو گورنر سر جارج کننگھم کی رپورٹ پر قائداعظم نے ان کو ڈسمس کر دیا۔

ذرا پیچھے آیئے۔ ۷ر اگست کو قائداعظم نے دہلی کو بعزمِ کراچی خیر باد کہا۔گورنر جنرل کا سفید ڈکوٹا جہاز تیار کھڑا تھا۔قائداعظم شیروانی ،جناح کیپ، اور شلوار میں ملبوس تشریف لائے ۔ان کے ہمراہ محترمہ فاطمہ جناح تھیں۔لفٹیننٹ ایس۔ایم احسن اور فلائٹ لفٹیننٹ عطاء ربی ایڈی کانگ تھے۔جب جہاز دہلی کی فضاؤں میں بلند ہوا تو آپ نے شہر دہلی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے فرمایا کہ **''میں سمجھتا ہوں کہ میں اس شہر کو آخری مرتبہ دیکھ رہا ہوں اب قصہ ختم ہے''۔**

یہ امر واقعہ ہے کہ ۷ر اگست سے لیکر آخر دم تک قائداعظم نے ہمیشہ پاکستانی لباس ہی پہنا اور بہترین انگریزی سُوٹ مقفل کر دیئے۔یہ وضع داری کی بہترین مثال ہے۔

۴ گھنٹے کی اُڑان کے بعد جب وہ کراچی پہنچے تو ایرپورٹ کے اردگرد ہجوم خلائق تھا۔ابھی جہاز فضا میں ہی تھا کہ قائداعظم نے اُٹھ کر نیچے نگاہ دوڑائی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ پھر سے جوان ہو گئے ہیں کیونکہ اُن کو اپنی محنت کا پھل سامنے نظر آرہا تھا۔جب جلوس گورنمنٹ ہاؤس کو روانہ ہوا تو ہر جگہ شادمانی اور مسرت کی لہر دوڑتی نظر آرہی تھی سوائے ہندوؤں کے محلّوں کے جو کہ سخت ملول نظر آتے تھے اور قیام پاکستان سے قطعاً خوش نہ تھے۔

۱۳ر اگست کی شام کو لارڈ مونٹ بیٹن مع مختصر سے سٹاف کے آ گئے کیونکہ انہوں نے اگلے دن ۱۴ر اگست کو قیام پاکستان کا اعلان کرنا تھا اور یہ بھی اعلان کرنا تھا کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل خود قائداعظم ہوں گے۔

اس سے قبل لارڈ موصوف نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کو ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل تسلیم کر لیا جائے مگر قائداعظم کی فراستِ مومنانہ نے تاڑ لیا تھا کہ اشتراک غیر مناسب ہے۔اس پر عقیلؔ خیرآبادی نے غضب کی رباعی کہی

نہ ہوا پر نہ ہوا رام گورنر جنرل
ہند کے بخت میں تھا ٹام گورنر جنرل

پاک استاں کے لئے نیک شگوں ہے عقیل
قائد اعظم اسلام گورنر جنرل

آخر خدا خدا کرکے ۱۴/اگست کا مبارک دن طلوع ہوا اور پاکستان کے سفید و سبز پرچم نے آزاد ہوا میں لہرانا شروع کیا۔ یہ ڈیزائن خود قائداعظم اور لیاقت علی خان نے تجویز کیا تھا۔ لارڈ مونٹ بیٹن کی خواہش تھی کہ اس کے اُوپر کے کونے میں چھوٹا سا یونین جیک بھی ہو مگر قائداعظم بھلا یہ کب مان سکتے تھے۔

جب لارڈ مونٹ بیٹن ۱۳/اگست کو کراچی سے آئے تو کمشنر پولیس نے ایرپورٹ پر ہی ان کو بتادیا کہ ۱۴/اگست کو جلوس کے وقت کچھ شریر عنصر بم مار کر قائداعظم اور مونٹ بیٹن دونوں کو مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ مونٹ بیٹن نے کہا کہ جلوس کا رستہ تبدیل کردیا جائے مگر یہ مسئلہ قائداعظم کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے سختی سے انکار کردیا اور حکم دیا کہ جلوس پہلے راستہ سے ہی جائے گا۔

دربار سے واپس آکر بیٹھے ہی تھے کہ قائداعظم نے مونٹ بیٹن کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

Thank God I have brought you back safe.

(ترجمہ) ''خدا کا شکر ہے کہ میں تمہیں صحیح سلامت واپس لے آیا ہوں''۔

اس وقت کراچی کی یہ حالت تھی کہ کوئی دفتر نہ تھا۔ نہ سٹیشنری تھی نہ کارکن تھے۔ نئی دہلی سے جو عملہ آنا تھا وہ ابھی تک پہنچا نہ تھا کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کس دفتر سے متعلق ہے؟ کون اس کا افسرِ اعلیٰ ہے؟ دفتر خود کہاں واقع ہے؟ ہندو جاتے ہوئے یا توپُرانا ریکارڈ ہمراہ لے گئے تھے یا ضائع کر گئے تھے۔ نیوی سرے سے تھی ہی نہیں۔ اکثر مسلمان سپاہی باہر کے ممالک میں ایک سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت بھجوا دیئے گئے تھے۔ اُن کو واپس لانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ باوجود تحریری وعدوں کے ہمارے حصہ کے سٹور (فوجی اور سویلین) نہ دیئے۔ ریل کے ڈبے تک لے گئے تھے۔ انجن چلانے کے لئے کوئلہ جھریا (مغربی بنگال) سے آیا کرتا تھا اسکی بجائے کوئٹہ سے ناقص کوئلہ لائے مگر وہ کام کا نہ تھا۔ قائد نے حکم دیا کہ تمام انجن ڈیزل آئل سے چلانے کا اہتمام کیا جائے۔ خزانہ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ آخر کراچی کے چند مسلمان سیٹھوں کو اعتماد میں لے کر ۶۰ کروڑ روپیہ ۲ دن کے اندر فراہم کر کے دیا گیا۔ مہاجرین روزانہ ہزاروں کی تعداد میں دھڑا دھڑ آرہے تھے۔ ان لٹے پٹے لوگوں کی رہائش، خوراک وغیرہ کا بندوبست کرنا تھا۔ دفاتر کے لئے جگہ تجویز کرنی تھی۔ میز کرسیاں تک مہیا کرنی تھیں۔ بالکل نیا گھر آباد کرنے والی بات تھی۔

الغرض پاکستان تاریخ کا ایک عجوبہ اور خدا تعالیٰ کا احسان ہے۔ اس طرح ایک ملک بننے کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ اب یہ اہلِ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی اقدار کو یہاں رائج کریں اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں آگے بڑھیں۔ قائداعظم نے ہم کو ایک چھوٹا سا گھر دے دیا ہے اسی مقام سے انشاء اللہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہوگی۔

(ماہنامہ خالد اگست ۱۹۷۳ء)

دجّال سے مُراد ایسٹ انڈیا کمپنی ہے

ایک واقعاتی اور تاریخی جائزہ

ا

(الف) تاریخ کے اوراقِ شاہد ہیں کہ ایشیائی اقوام کا پلّہ تہذیب وتمدن کی میزان میں مغربی اقوام کے مقابلہ میں نسبتاً بھاری چلا آیا ہے مگر سولھویں صدی عیسوی میں خداوند تعالیٰ نے بوجہ اُس کے کہ وہ تمام جہانوں اور تمام قسم کی مخلوق کا رب ہے اُن کی حالت پر بھی رحم فرمایا اور ان کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا اور ان کی دینی اور دنیوی بہبود کے بندوبست ہونے لگے۔ قدرت نے خود انہی کے اندر سے بہت سے بیدار مغز اور مفکّر پیدا کر دیئے جنہوں نے معاش اور معاد کے ہر شعبے میں نمایاں ترقی اور اصلاح کی۔ سوتے ہوئے لوگوں کو بیدار کیا۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا سبق اُن کو پھر سے پڑھایا اور مخلوق پرستی کے خلاف زبردست مدلّل وعظ کہہ کر روم کے پوپ کی عظمت کو کافی حد تک گھٹا دیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ داغدار کر دیا۔ ایک زبردست تحریک کا آغاز جرمنی سے ہوا جس کا نام The Reformation یعنی الاصلاح تھا اور پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد پڑی۔ اس سے عوام کے ذہنوں میں ایک خاص جلا پیدا ہوئی اور عیسائی دنیا کا تقریباً ۳/۴ حصہ پوپ کی مشرکانہ غلامی سے نکل گیا۔

مؤرخین کا خیال ہے کہ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا تھا اور اس کے نتیجہ میں ریفارمیشن کی تحریک ظہور میں آئی تھی۔ بے شک ایک سبب یہ بھی تھا کیونکہ اس فتح کے بعد بے شمار یونانی اور عربی علوم کے فاضل جو ان علوم کی کلید اپنے قبضہ میں رکھتے تھے قسطنطنیہ سے نکل کر وسطی اور غربی یورپ میں جا بسے تھے اور اس طرح ان ممالک میں قدیم علوم یعنی Classical Sciences اور اسلامی علوم پھیل گئے جسے انگریزی میں Reniassance (تحریک احیاء علوم) کہتے ہیں۔

علاوہ بریں چھاپہ خانہ کی ایجاد نے ان علوم کی اشاعت میں مزید اضافہ کیا اور عوام میں تعلیم کا عام رواج ہوا۔ اس ظلمت کدہ میں سیاسی رنگ میں یہ اصلاح ہوئی کہ یورپی سلطنتوں نے باہم مل کر قوت کی موازنت یعنی Balance of Power کا اصول قائم کیا۔ جس سے زبردست زیردستوں پر ناحق ظلم نہ کر سکتے تھے۔ مثلاً قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ترک یورپ والوں کو دباتے چلے جا رہے تھے کہ دفعتہً ان کی ترقی میں روک پیدا ہوگئی۔

ایک اور فضل جو اہل یورپ پر ہوا وہ یہ تھا کہ ان کی دولت میں بے حد ترقی ہوئی۔ برّاعظم امریکہ کی دریافت اور نوآبادیوں کے قیام سے سب سے اوّل پرانگریزوں نے افریقہ کے گرد چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچنے کا راستہ دریافت کیا۔

فوجی سپاہیوں کو ایسے عمدہ طریق پر تربیت دی گئی کہ ایشیا کے کسی ملک کو یہ کمال حاصل نہ ہوسکا اور ہندوستانی راجے، نواب انہی فرنگیوں کو اپنی فوجوں میں انسٹرکٹر مقرر کرتے تھے۔ الغرض سولہویں صدی سے بیسویں صدی کے وسط تک تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھتے جائیں تو یہی معلوم ہوگا کہ یورپ دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن تھا اور ایشیا خصوصاً ہندوستان تنزل کی طرف جارہا تھا۔ وتلک الایّام نُدَاوِلُھابین النّاسِ میں خدا تعالیٰ نے اسی اصول کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

اس زمانہ میں امیر تیمور نے جو عظیم الشان حکومت قائم کی تھی وہ عدم تنظیم کی وجہ سے زوال پذیر ہوگئی۔ ہندوستان میں خاندان لودھی کو زوال آ گیا اور اس کی جگہ سلطنت مغلیہ اپنے ظاہری طمطراق کے ساتھ قائم ہوگئی تھی۔ لیکن اگر بنظرِ غور دیکھیں تو یہ سلطنت بھی اسلام کے حق میں چنداں مفید ثابت نہ ہوئی۔ کیونکہ اکبر کی ہندونواز پالیسی نے دراصل اسلام کو شدید ضعف پہنچایا۔ بے شک شاہ جہاں اور اورنگزیب نے اس مرض کا علاج کرنا چاہا اور اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ عارضی طور پر نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک کفر کی طاقت کچھ کمزور پڑ گئی مگر جب مزاج کا اعتدال ہی خبط ہو جائے تو اس وقت کوئی علاج بھی کارگر نہیں ہوتا۔ وہ شوکت اور وہ رعب داب جو عرصہ دراز سے مسلمانوں کو ہندوستان میں نصیب تھا وہ واپس نہ آسکا۔

(ب) حدیث شریف میں خروجِ دجّال کے متعلق نہایت وضاحت سے پیشگوئی موجود ہے۔ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشتِ مبارک سے مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ (دجاّل) اس سمت سے نکلے گا چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

واَوُمٰی الی المشرقِ

اب ضروری تھا کہ دجّال ہندوستان کے مشرق کی جانب سے آئے۔ نیز حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے مشرق کی طرف رُخِ مبارک کر کے فرمایا کہ ''مجھے ہندوستان سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔'' اس میں یہ رمز تھی کہ مسیح موعود عرب سے مشرق (یعنی ہندوستان) میں آئے گا۔ نیز مسیح موعود کے ہاتھوں ہی دجاّل نے قتل ہونا تھا۔ اس واسطے دونوں کا ایک ہی جگہ ظاہر ہونا لازم وملزوم تھا۔ (حدیث) طواف کعبہ کے وقت بھی آنحضرت ﷺ نے دجّال کو طواف کرتے دیکھا تھا اور اس کے پیچھے مسیح موعود کو جس کی یہ تعبیر تھی کہ دجّال اسلام کی تباہی کی کوشش کرے گا اور مسیح موعود اسلام کی تعمیر کیلئے کوشاں ہوگا۔ اس حدیث سے بھی ظاہر ہے کہ دجاّل اور مسیح موعود دونوں ایک ہی ملک میں ظاہر ہوں گے۔

اب ناظرین کرام ذرا لفظِ دجّال پر غور فرمائیں۔ اس کا مادہ ہے دجل۔ جس کے معنی لغتِ عرب میں مکر وفریب ملمع سازی، کذب اور سحر کے ہیں۔ لہذا دجّال جو مبالغہ کا صیغہ ہے اس کے معنی ہوئے:۔

سخت مکروفریب سے کام لینے والا۔ ساحر اور کذّاب۔ لسان العرب میں لکھا ہے کہ کُلُّ کذّابٍ فھو دجّالٌ یعنی ہر ایک کذّاب دجّال ہے۔

دجّال کے ایک اصطلاحی معنی بھی ہیں۔ لسان العرب میں ہے:۔

والدجّال فھو المسیح الکذاب دجلهٔ وسحرهٔ وکذبه۔ یعنی دجّال سے مراد وہ کذاب مسیح ہے جس کے حق میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ وہ آخری زمانہ میں خروج کرے گا۔ احادیث میں دجّال کی ایک صفت مسیح بھی آئی ہے جو فعیل کے وزن پر ہے۔ اور فعیل بمعنی فعول بھی آتا ہے۔ مراد مسیح سے ممسوح العین ہے کہ اس کی دینی آنکھ اندھی ہوگی۔

پھر لکھا ہے کہ وقیلَ اِنَّهٗ یغطی علی النّاسِ بکفرهٖ یعنی وہ کفریات میں لوگوں پر چھا جائے گا۔

اب صاف ظاہر ہے اس میں دجّال کی دو صفتوں کا صاف صاف ذکر ہے۔ یعنی:۔

(۱) اس کا کذّاب ہونا۔ یعنی وہ جھوٹ سے کام لے گا۔

(۲) وہ سیاحت کرنے والا ہوگا۔ یعنی بہت ملکوں میں گھومنے والا ہوگا۔

آگے چل کر اسی لسان العرب میں لکھا ہے کہ:۔

والدجّال والدجالیته: الرُّفقَتُه العظیمة۔ یعنی دجّال اور الدجّالہ سے مراد ایک ایسی کمپنی ہے جس کے ممبران کثیر ہوں۔ بہت بڑی کمپنی۔ اور پھر لکھا ہے کہ رفقةٌ دجالیتهٌ عظیمتهٌ یعنی ایک ایسی سیاہ کار کمپنی یا گروہ جو زمین کو اپنی کثرت سے ڈھانپ لے گی اور آخر کار لکھا ہے کہ وقیل ھی الرّفقةُ تحمل المتاع التجارةَ کہ وہ کمپنی ہے جو تجارت کی غرض سے اپنا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے گی۔

خلاصہ یہ کہ دجّالِ موعود میں ذیل کی صفات کا پایا جانا لازمی ہے۔

(۱) وہ اپنی کفریات اور کذب اور سحر کا خوب پراپیگنڈہ روئے زمین پر کرے گا۔

(۲) اس کے پراپیگنڈے کی ایجنٹ تجارتی کمپنیاں ہوں گی۔

(۳) وہ دینی اعتبار سے بے بہرہ ہوگا اور اسکی دینی آنکھ بند ہوگی۔

(ج) مندرجہ بالا تحقیق میں پہلے معنی ان عیسائی پادری صاحبان کے مختلف گروہوں پر نہایت خوبی سے چسپاں ہوتے ہیں جو یورپین تجارتی کمپنیوں کے ہمراہ یہاں آئے اور دوسرے معنی اُن تمام تجارتی کمپنیوں پر تمام و کمال صادق آتے ہیں جو ہندوستان میں مختلف اوقات میں تجارت کی غرض سے آئیں۔ سب سے اوّل پرتگیزوں نے ہندوستان میں قدم رکھا تو گوا، دمن اور اپنے دیگر مقبوضات میں عیسائیت کا خوب ہی پرچار کیا عظیم الشان گرجے تعمیر کئے۔ جو اَب تک موجود ہیں۔ کثرت سے لوگوں کو عیسائی بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ گوا کے علاقہ میں کثرت سے عیسائی پائے جاتے ہیں۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

''اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کوایک نئی قوم اورایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یورپ سے سب سے پہلے پرتگالی آئے ۔اس کے بعد ولندیزی آئے اور فرانسیسی ۔لیکن ان کا کوئی زیادہ اثر ملک پرنہیں ہوا۔ پرتگالی دومقصد سے آئے تھے ۔مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے ان دونوں مقصدوں میں انہوں نے بڑے ظلم وجبراور سفاکی سے کام لیا۔ان کی یادگاراب ان کے کچھ الفاظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دوغلے مردوزن رہ گئے ہیں ۔فرانسیوں کا کوئی قابل ذکرنشان باقی نہیں رہا۔البتہ انگریزوں کے قدم یہاں ایسے جمے کہ وہ اکاس بیل کی طرح سارے ملک پر چھاگئے۔

اس سے قبل جتنے فاتح ہندوستان میں آئے وہ شمال مغرب کی طرف سے داخل ہوئے مگر یہ یورپی قومیں سمندر کے راستے تجارت کے بھیس میں آئیں اور تجارت کی کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے بنائے اور لشکرجمع کرنے لگ گئے ۔اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت دہلی میں انحطاط شروع ہوگیا تھا۔رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ۔صوبے خودمختار ہوگئے ۔ یہ کبھی آپس میں لڑتے مرتے ۔کبھی غیروں کی امداد سے ایک دوسرے پرحملہ کربیٹھتے ۔کبھی مل کرغیروں سے جابھڑتے اور کبھی غدّاری کرکے خوداپنی جڑ کاٹنے پرآمادہ ہوجاتے ۔ انگریزان حالات کا ایک شاطر کی طرح مطالعہ کرتا رہا اور کبھی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔کبھی ایک کے ساتھ ہوگیا اور دوسرے کوشکست دیدی اوراس کمک کے معاوضے کے نام سے گراں قدررقم لے لی اور کچھ حصہ ملک کا بھی ہتھیالیا۔کبھی کسی کو بڑھتے ہوئے دیکھ کرچھیڑخانی شروع کردی اوراس کے حریفوں سے مل کراس کے علاقے پرچڑھائی کردی اور بندر بانٹ کے قدیم اصول پراچھاحصہ اپنے لئے رکھ لیا اور منہ بھرائی کے طور پرایک ٹکڑاساتھیوں کے سامنے ڈال دیا۔کبھی بادشاہ سے مغصوبہ علاقے کے قبضے کوجائزقراردے لیا۔ ہمارے اسلاف ان فرنگیوں کو کبھی خاطر میں نہ لائے ۔ان کا لباس، کھانا، پینا، رہنا، سہنا، عادات واطوار، ان کی زبان، غرض ان کی ہربات ان کی نظر میں نامانوس اور ناشائستہ تھی ۔ ہمارے ایک لغت نویس نے فرنگی کی عجیب وغریب تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

یکے از جانور ان دریائی کہ گاہ گاہ بر
ساحل نمود ارمی شود

ہمارے بزرگ زیادہ سے زیادہ اُن کی یہ تعریف کرتے تھے کہ کاریگراچھے ہیں ۔توپ، بندوق، گھڑی وغیرہ بنانا خوب جانتے ہیں ۔مسلمانوں سے بھی وہ خوش نہ تھے اوران کو وفادارخیال نہیں کرتے تھے بلکہ باغی سمجھتے تھے ۔ان کا ایسا سمجھنا کچھ بے جانہ تھااس لئے کہ سلطنت انہوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔

انہوں نے ابتداء میں جس مکروفریب، جعل سازی، اندرونی سازشوں اور حکمتوں سے ایساربط بڑھایااورخاص کراسلامی سلطنتوں سے جومعاندانہ سلوک کیااس نے مسلمانوں کے دلوں میں اُن کی طرف سے نفرت پیدا کردی۔''

(دیکھئے رسالہ نقوش لاہور، شخصیات نمبر۲ صفحہ ۷۳۱)

(د) برّصغیر ہندوستان میں مسیحی تبلیغ یوں تو واسکوڈے گاما کے ذریعہ مئی ۱۴۹۸ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کی فراہم کردہ معلومات سے اہل پرتگال کے دلوں میں ہندوستان سے تعلقاتِ تجارت بڑھانے کا خیال پیدا ہوا تھا مگر باقاعدہ مسیحی مشن ۱۷۰۱ء سے جاری ہوئے اور پھر دن بدن ان کی سرگرمیاں بڑھتی ہی گئیں۔ مندرجہ ذیل مشن ہندوستان کے طول وعرض میں کام کررہے تھے:۔

نام مشن	سنہ ءقیام
ایس۔پی۔جی مشن	۱۷۰۱ء
بپٹسٹ مشن	۱۷۹۲ء
لنڈن مشنری سوسائٹی	۱۷۹۵ء
چرچ مشنری سوسائٹی	۱۷۹۹ء
ویزلیٹن مشن سوسائٹی	۱۸۱۳ء
بپٹسٹ یونین مشن	۱۸۱۴ء
بائبل مشن سوسائٹی	۱۸۱۵ء
میتھوڈسٹ چرچ	۱۸۱۹ء
ڈینش مشن سوسائٹی	۱۸۲۱ء
چرچ آف سکاٹ لینڈ	۱۸۲۹ء
اے۔بی۔سی۔فیلڈ مشن	۱۸۳۲ء
پیفک ایونجیکل لیوتھرن مشن (جرمنی)	۱۸۳۶ء
پریسبٹرین بورڈ	۱۸۳۷ء
کوسنر مشن	۱۸۳۹ء
سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ مشن	۱۸۴۲ء
یونائیٹڈ فری چرچ آف سکاٹ لینڈ	۱۸۴۷ء
زنانہ بپٹسٹ مشن	۱۸۵۲ء
یونائیٹڈ پریسبٹرین مشن	۱۸۵۹ء
ایس۔اے مشن	۱۸۶۵ء
چرچ ایونجلیکل زنانہ سوسائٹی	۱۸۸۶ء
نارویجئن مشن	۱۸۸۸ء

جرمن ایونجلیکل لیوتھرن مشن ۱۸۹۲ء

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت اور اس کے بعد جب گورنمنٹ برطانیہ نے ۱۸۵۸ء میں کمپنی سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تب اور شدت سے سرکاری پادری تبلیغِ عیسائیت میں سرگرم کار ہو گئے۔ ۱۸۰۰ء میں گورنر جنرل ولزلی نے فورٹ ولیم کالج جاری کیا تو پادری بوقینن کو ناظم یعنی پرنسپل مقرر کیا گیا اور پادری ولیم کیری کو پروفیسر۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"ناظم و پروفیسر دونوں کا مقصد دورانِ تعلیم میں روحوں کا آں مسیح کے لئے جیتنا تھا۔ یہ اس بات کے شائق تھے کہ طلباء میں بہتر اخلاق و سنجیدگی پیدا ہو۔ مسیحیت کی عظمت، عبودیت اور الوہیت کو پُر زور اُن کے سامنے پیش کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بلا ناغہ عبادت اور عشاء میں شریک ہونے لگے۔"

(تاریخ بشارت الہند و پاکستان مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور)

"جیمز تھامس جو ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۳ء تک شمال مغربی سرحدی صوبہ (موجودہ علاقہ یو۔ پی) کے گورنر رہے انہوں نے خود چرچ مشنری سوسائٹی کے ساتھ مل کر تبلیغ میں بہت دلچسپی لی۔ یہ اپنے ماتحت افسران کو سکھایا کرتے تھے کہ خدا سے ڈرتے رہو اور مسیحیت کو بلا دھڑک پھیلاؤ اور مشنریوں کی مدد کرو۔"

(کتاب مذکورہ بالا ص ۱۶۵)

"جب لاہور میں انگریزوں کے قدم جم گئے تو ۹۔ فروری ۱۸۵۲ء میں C.M.S کو دعوت دے کر تبلیغ میں بہت دلچسپی لی۔ اور ۳۰۰۰ پاؤنڈ جمع کر کے دیئے۔

رابرٹ منٹگمری نے ۲۴ ستمبر ۱۸۵۶ء کو ایک جلسہ میں ۵۰۰۰ پاؤنڈ تبلیغی مشن کو دیئے جس سے چرچ مشنری سوسائٹی کی جلتی ہوئی جھاڑی از سر نو سرسبز ہو کر لہلہانے لگی۔" (ص ۱۶۵)

"۶۹۔ ۱۸۶۴ء میں جب سر ہنری لارنس وائسرائے مقرر ہوئے تو انہوں نے مسیحی تبلیغ کی اور وسیع کوشش کی"

یہ امر واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ سکھوں کے اول اور آخری راجہ نے عیسائی پادریوں کو پنجاب میں تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ ان کے دل کے ارادوں کو بھانپ گیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "۱۸۳۶ء میں دریائے ستلج میں جہاز پر سفر کرتے ہوئے بشپ ڈانیل ولسن نے پنجاب کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "میں اس ملک پر اپنے خداوند یسوع مسیح کے نام میں قابض ہوتا ہوں۔"

عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کی پوری تفصیل ملاحظہ کرنی ہو تو کتاب بشارت الہند و پاکستان مطبوعہ بائبل سوسائٹی انار کلی لاہور نیز History of the Missions in India اور History of the India Missions مطالعہ فرمائیں۔

۱۸۱۳ء میں چرچ مشنری سوسائٹی کو باقاعدہ شاہی مہر کی تصدیق بھی مل گئی جس کی رو سے گورنمنٹ انگریزی نے اس کی حفاظت اور حمایت کا پورا پورا ذمہ لے لیا۔ تمام سکولوں اور کالجوں میں بائیبل کی تعلیم دی جانے لگی۔ صرف پنجاب میں عیسائیوں کے بڑے بڑے مراکز حسب ذیل تھے:۔

لدھیانہ ۱۸۳۴ء۔ جالندھر ۱۸۴۶۔ انبالہ ۱۸۴۸۔ لاہور ۱۸۴۹۔ امرتسر ۱۸۵۲۔ کانگڑہ ۱۸۵۴۔ ملتان۔ پشاور اور سیالکوٹ ۱۸۵۵ء۔ راولپنڈی ۱۸۵۶ ڈیرہ اسماعیل خان۔ ۱۸۶۸۔ ڈیرہ غازی خان ۱۸۷۹ پنڈ دادنخان ۱۸۸۷۔ مکتی فوج کی سرگرمیاں اسکے علاوہ تھیں۔

ان باقاعدہ انجمنوں کے علاوہ مختلف افراد نے بھی اپنے طور پر اپنے مذاہب کو فروغ دینے کی سعی کی محض چند مثالیں عرض کرتا ہوں ورنہ ان کے علاوہ بھی بے شمار لوگ تھے۔

بٹالہ میں مس سارہ۔ سی۔ ٹکر نے ۱۸۷۷ء میں ایک ہائی سکول اور بورڈنگ قائم کیا۔ جو تیلی دروازہ کے باہر لب سڑک تھا۔ اس کا نام A.L.O.E ہائی سکول تھا۔ یعنی A Lady of England High School آج بھی یہ سکول کام کر رہا ہے۔

راجہ شیر سنگھ کے بنگلہ میں جو بٹالہ شہر کے باہر تھا مسٹر ایف۔ ایچ۔ بیرنگ نے اپنے خرچ سے ۱۸۷۸ء میں ایک ہائی سکول اور بورڈنگ قائم کیا جو بٹالہ سے قادیان جانے والی سڑک پر تھا اور اب تک جاری ہے۔ ۱۸۸۳ء میں ایک چھوٹا سا مگر بہت خوبصورت گرجا تعمیر کیا گیا جس کا افتتاح اُس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایچی سن نے خود جا کر کیا۔

امرتسر میں مشن تو بہت بڑا تھا مگر الیگزنڈر ہائی سکول لڑکیوں کے لئے کھولا گیا بے شمار لڑکیاں عیسائی ہوگئیں۔ وائسرائے لارڈ رپن نے بھی اس کا معائنہ کیا اور عیسائیوں کی تبلیغی مساعی کو سراہا۔

۱۸۹۲ء میں بنوں شہر میں ڈاکٹر تھیوڈور لٹن پینل T.L. PANEL نے ایک سکول اور ہسپتال قائم کر کے بے شمار مسلمانوں کو پھانس لیا۔ اس شخص نے اپنی وضع قطع اور لباس بالکل مسلمان مولویوں کی سی بنائی ہوئی تھی۔ سفید پگڑی۔ مقطع داڑھی اور مولویانہ لباس سے لوگ دھوکہ کھا جاتے تھے زبان پر ایسا عبور تھا کہ اہل زبان بھی پہچان نہ سکتے تھے۔ یہی پادری صاحب ایک دفعہ قادیان بھی گئے تھے۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ لاکھوں روپے کی جائداد اور نقد چھوڑ کر ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ کتاب بشارت الہند و پاکستان نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

''پینل نے سرحدی لوگوں میں دلیرانہ تبلیغ کی''

غرضیکہ عیسائی اصحاب کی تبلیغ سے بے شمار ہندو۔ مسلمان اور سکھ اصحاب اس مذہب میں چلے گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تو جیتے جی پادریوں کو پنجاب میں آنے کی اجازت نہ دی مگر انہوں نے سب سے پہلے راجہ کے

خاندان پر ہی ہاتھ صاف کیا۔ یعنی مہاراجہ دلیپ سنگھ کو عیسائی بنالیا!

لائف آف لارڈ لارنس (وائسرائے و گورنر جنرل جلد دوم ص ۳۱۳ پر لکھا ہے کہ:۔

''کوئی چیز بھی ہماری سلطنت کے استحکام کا اس امر سے زیادہ موجب نہیں ہوسکتی کہ ہم عیسائیت کو ہندوستان میں پھیلائیں۔''

اور کیمبرج شارٹ ہسٹری آف انڈیا مطبوعہ یونیورسٹی پریس کیمبرج ص ۱۵ے پر لکھا ہے کہ:۔

''خدا تعالیٰ نے اپنی مشیت کے مطابق ہندوستان کو برطانیہ کے ہاتھ میں اس لئے دیا ہے کہ اس ملک کے لوگ عیسائی بنائے جاسکیں۔''

فرمایئے اس سے زیادہ اور کیا ان کے ''نیک ارادوں'' کا بخوبی پتہ لگ سکتا ہے۔

(ہ) بلاتقسیم گورنمنٹ ہندوستان میں ایک صیغہ Ecclesiastical ہوتا تھا۔ جس کا ہیڈ The Metropolitan of India ہوا کرتا تھا۔ اور ہندوستان میں عیسائیت کا محافظِ اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ خود شاہانِ انگلستان کے خطابات میں سے ایک ضروری جزو Defender of the faith اب تک موجود ہے۔

ہندوستانیوں کا دین دھرم خراب کرنے کے لئے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اور پھر اس کی جانشین گورنمنٹ نے کوئی کمی اُٹھا نہ رکھی تھی۔ سکولوں کے ذریعہ بھی پوری سعی کی گئی۔ ۱۸۵۰ء میں کلکتہ میں ایک سکول جاری کیا گیا جس میں ایک ہزار سے اُوپر طالب علم تھے (سب کے سب ہندو تھے) اس کے متعلق مشہور و معروف مؤرخ لارڈ میکالے (جو اُن دنوں گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر ہوتے تھے) اپنے والد زیکری میکالے کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"No Hindos boy who received an English education could ever remain sincerely attached to his own religion and, if this plan of education was followed up, in thirty years times there would not be a single idolator left among the respectable classes in Bengal,

ترجمہ:۔ کوئی ہندو لڑکا جس نے مغربی تعلیم پائی ہو خلوص کے ساتھ اپنے مذہب پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر یہی طریقہء تعلیم جاری رکھا جائے تو تیس سال کے اندر بنگال کے معزز طبقوں میں ایک بھی بت پرست باقی نہیں رہیگا۔ (یعنی سب کے سب عیسائی ہو جائیں گے)

اسی جذبہ کے ماتحت لارڈ میکالے نے اپنی مشہور و معروف تعلیمی رپورٹ میں حسب ذیل فقرات لکھ کر اپنے اندرون باطن کا اظہار کیا تھا۔ جس سے اس کے دلی ارادوں کا صاف پتہ لگ سکتا ہے۔ انہوں نے لکھا:۔

We must do our best to form a class who may be an interpreter between us and the million whom we grown a class of

persons Indian in blood and colour but English in Taste, in opinions, in morals and in intellect.

ترجمہ:۔ ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم ایک ایسا طبقہ پیدا کریں جو ہمارے (یعنی انگریزوں) اور اُن لاکھوں لوگوں کے درمیان جن پر ہم حکمران ہیں بطور ترجمان کے ہوں۔ ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو مگر اپنے مذاق، خیالات، اخلاق اور ذہن کے لحاظ سے انگلش ہوں۔''

(ماہنامہ مصباح فروری ۱۹۶۰ء)

دجال سے مراد ایسٹ انڈیا کمپنی ہے

ایک واقعاتی اور تاریخی جائزہ

(و) ایسٹ انڈیا کمپنی کے اکثر ملازمین اپنے مفوضہ کاموں کے علاوہ پرائیویٹ طور پر تجارت میں لگے رہتے تھے۔ جس سے وہ خوب ہاتھ رنگتے تھے۔ اپنے لئے وہ ایک جگہ سے مال خریدتے اور دوسری جگہوں پر لے جا کر بہت زیادہ قیمت پر فروخت کرتے۔ چونگی کا محصول کبھی ادا نہ کرتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جس شخص سے مال خریدا اوّل تو اسے مطلق قیمت نہ دیتے اور ادا کرتے بھی تو یونہی برائے نام سی۔

''انگلستان کی مصنوعات کو رائج کرنے کیلئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکن زبردستی اپنا مال (جس کی تہ میں تاجرانہ حکمت عملی اور خود غرضی ہوتی تھی) لوگوں پر ٹھونستے تھے۔ پھر یہاں کے کاریگروں کو زبردستی پیشگی رقوم دی جاتی تھیں۔ جس کے عوض ان سے جبراً کام لیا جاتا تھا اور ان کے بنے ہوئے مال کی قیمت اپنی مرضی سے دیتے تھے اور اکثر اوقات دیتے ہی نہ تھے۔ پارچہ بافوں کی ایک کالونی بنا کر ان پر ایک ریذیڈنٹ مقرر کر دیا جاتا تھا جو اُن سے زبردستی کام لیتا تھا۔

(India in the victorian Era .Vol.1)

ہندوستانی لوگ اگر اپنا مال ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جاتے تھے تو ہر شہر میں مال لے جانے پر ۱۵ فیصدی کے حساب سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔ اسکے مقابلہ پر انگلستان کا جس قدر مال اِدھر آتا تھا اس پر قطعاً کوئی محصول عائد نہ ہوتا تھا۔ اسی کے متعلق ایچ ولسن نے لکھا:۔

''برطانوی صناعوں کی سیاسی ناانصافی کے بل بوتے پر ایک ایسے حریف کو سرنگوں کرنے اور آخرکار اس کا گلا گھونٹنے میں پس و پیش نہیں کیا جس سے وہ مساوی شرائط پر مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔''

کرنل ہیوز نے لکھا ہے:۔

''ایشیا اور یورپ کی کسی حکومت کے ماتحت ہندوستان کے موجودہ محصول اراضی کے برابر محصول وصول نہیں کیا جاتا۔''

آسام کے چائے کے کھیتوں میں مزدوری کیلئے عورتیں بھرتی کی جاتی تھیں۔ اُن سے انگوٹھے لگوا لئے جاتے تھے اور پھر اُن سے ان کی طاقت سے زیادہ مشقت لی جاتی تھی حتیٰ کہ غریب عورتیں مر جاتی تھیں:۔

''کمپنی کے گماشتے رعیت کو اس قدر دق کرتے تھے کہ مال گذاری کے مطالبات ادا کرنا تو الگ رہا وہ بعض اوقات اپنے بچوں کو بھی فروخت کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ یا بصورت دیگر فرار اختیار کر لیتے تھے۔''

(Consideration of Indian affairs)

ہنری ونسٹارٹ گورنر بنگال (جو کلائو کا جانشین تھا) نے کمپنی کو ایک رپورٹ میں خود لکھا کہ:۔

''بلا ادائے محصول خرید وفروخت رائج تھی جس سے بے انتہا مظالم ہوتے تھے۔ انگریز ایجنٹ لوگوں کو نقصان پہنچانے کے علاوہ حکومت کے اقتدار کو بھی پامال کرتے۔ اگر کبھی نواب کے عہدے داران نے دخل دینے کی جرأت کی بھی تو ان کو باندھ کر مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے اور یہی بات میر قاسم سے جنگ چھڑنے کا باعث ہوئی تھی۔ تنگ آ کر آخر خود میر قاسم نے کمپنی کو لکھا کہ آپ کے ایجنٹ میری قلمرو کے گاؤں میں سے مچھلی۔ بانس۔ بھوسہ۔ تیل۔ چاول۔ دھان۔ سپاری اور پان کا بیوپار کر رہے ہیں۔ اور ہر کس وناکس کمپنی کا ''پاس'' ہاتھ میں لے کر اپنے آپ کو کمپنی سے کم نہیں سمجھتا۔''

ایک دفعہ وارن ہیسٹنگز نے اپنے ایک سفر کی روئداد کمپنی کو لکھی جو بذریعہ کشتی طے ہوا تھا:۔

''ہر کشتی پر مجھے انگلستان کا جھنڈا نظر آ رہا تھا۔ ہمارے آگے آگے جو سپاہی جا رہے تھے اُن کی پیشانیوں پر خود مختاری، سرکشی اور غارتگری جھلک رہی تھی۔ ہماری آمد پر لوگ مجبوراً شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے یا دکانیں بند کر لیتے تھے۔ دیہات کے باشندے ہماری حکومت کی نسبت بہت بُرے خیالات رکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔''

(India in Victorian Era.vol.II)

(ز) کمپنی کے ملازمین کی شرافت اور دیانت ملاحظہ فرمائیں کہ جنگ پلاسی (جون ۱۷۵۷ء کے بعد جب میر جعفر کو کمپنی کے ملازمین نے تخت نشین کرایا تو اس غریب سے ۱۲،۳۸،۵۷۵ پاؤنڈ ''انعام'' کے نام سے وصول کئے جس میں سے بیس ہزار پاؤنڈ خود کلائو نے اپنا ''حصہ'' رکھ لیا۔

۱۷۶۰ء میں جب میر قاسم کو تخت نشین کرایا گیا تو اس سے ۲،۰۰،۲۶۹ پاؤنڈ اسی طرح ''انعام'' کے نام سے وصول کئے جس میں بیس ہزار پاؤنڈ خود کلائو نے اپنا ''حصہ'' رکھ لیا۔

۱۷۶۰ء میں جب میر قاسم کو تخت نشین کرایا گیا تو اس سے ۲،۰۰،۲۶۹ پاؤنڈ اسی طرح ''انعام'' کے نام سے وصول کئے گئے۔ جس میں سے ہنری ونسٹارٹ نے اپنا حصہ ۵۸،۳۳۵ پاؤنڈ رکھ لیا۔

۱۷۶۳ء میں جب ایک قلیل عرصہ کیلئے پھر میر جعفر کو تخت نشین کرایا گیا تو پھر اس بے چارے سے ۵،۰۰،۱۶۳ پاؤنڈ وصول کئے۔ آخر کار کمپنی کو بھی اس بات کا علم ہو گیا تو انہوں نے لنڈن سے احکام بھجوائے کہ آئندہ کے لئے ایسی رقوم ہرگز نہ لی جایا کریں۔ مگر انہی دنوں یہاں ایک گمنام سے نواب میر نجم الدولہ تخت نشین ہونے والے تھے لہٰذا وہ لفافہ اس وقت تک نہ کھولا گیا جب تک کہ نئے نواب صاحب سے بھی آخری مرتبہ ''چائے پانی'' کی رقم وصول نہ کر لی۔

(ح) لارڈ میکالے کے متعلق بھی سُن لیں کہ وہ ہندوستان میں کیا لینے آیا تھا:۔

But the primary cause of Macaulay's visit to India was not

Literature nor the codification of India's law nor the educational regenration of the Hindoo but the bussiness of earning and saviang enough money to enable him to return to England an independant men.He was saving, after sending money home Six or seven thousand pounds a year from the moment he landed
(Macaulay by Arthur Bryant pp:68)

(ترجمہ) میکالے کا ہندوستان آنے کا اولین مقصد نہ تو لٹریچر تھا نہ ہندوستان کا قانون مرتب کرنا تھا۔نہ ہندوؤں میں تعلیم کا دوبارہ اجراء تھا۔ بلکہ محض روپیہ کمانا اور اس قدر پس انداز کرنا کہ جب وہ انگلینڈ کو لوٹے تو کسی کا محتاج نہ ہو۔ جس گھڑی وہ ساحل پر اُترا وہ گھر روپیہ بھجوانے کے علاوہ بھی چھ سات ہزار پاؤنڈ سالانہ بچالیتا تھا۔''
(میکالے از آرتھر برائنٹ ص ۶۸)

اس قدر روپیہ کہاں سے آتا تھا؟ صاف ظاہر ہے کہ تجارت کا دستِ غیب ہی مدد کرتا تھا۔ یہ شہادت ایک انگریز کی ہے کسی ہندوستانی کی نہیں!

(ط) پھر اور سنیئے! جب ایسٹ انڈیا کمپنی سے تمام اختیارات چھین کر برٹش گورنمنٹ نے خود لے لئے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا رأس المال واپس کرنے کی یہ صورت نکالی گئی کہ تمام رقم بطور ''قرضہ'' ہندوستان کے ذمہ لگادی گئی۔ اس قرضہ میں تمام اُن جنگوں کے اخراجات بڑھادیئے جاتے تھے جو انگریزوں نے مختلف جگہوں پر لڑیں۔ مثلاً حبشہ میں جو جنگ لڑی تو اس کے تمام اخراجات ہندوستان کے ذمہ ڈال دیئے گئے۔ قصہ مختصر یہ کہ یہ قومی قرضہ ملکہ وکٹوریا کی تخت نشینی کے وقت ۳۰ لاکھ پونڈ تھا اور ملکہ کی وفات کے وقت ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ تھا۔ اس کا محض سُود ہی لاکھوں روپیہ ہندوستان کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

بمبئی کے گورنر سر جان ونگیٹ نے کمپنی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے صاف کہا کہ:۔

''ہم نے ہندوستان پر ہندوستان کے دیسی لوگوں کی خاطر نہیں بلکہ محض اپنی خاطر حکومت کی ہے۔ ہم خالق ومخلوق دونوں کی نظروں میں صاف طور پر قابل الزام ہیں کیونکہ ہم نے اس حکومت کے مصارف ادا کرنے میں ایک حبّہ بھی خرچ نہیں کیا۔''

سر جان شور نے شہادت دیتے ہوئے اقرار کیا کہ:۔

''اگر ہندوستان کے سر سے خراج کا یہ بارِ سنگین دُور کرادیا جائے اور ہندوستان سے جو ٹیکس وصول ہوتے ہیں وہ یہیں پر صرف کئے جایا کریں تو اس ملک کے محاصل میں ایک درجہ فراخی ہوجائے جس کا ہم اندازہ ہی نہیں کرسکتے۔''

(India in victorian Era .vol II p.448)

(ی) ڈھاکہ کی مشہورِ عالم ململ اب صرف یادوں میں رہ گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا ایک سالم تھان انگشتری کے سوراخ میں سے نکل جایا کرتا تھا۔ اس صنعت کو صرف اور محض اس واسطے برباد کیا گیا تاکہ لنکا شائر کے بنے ہوئے کپڑے کو فروغ حاصل ہو سکے۔ اُس زمانہ میں پارچہ بافی کے سنٹر ڈھاکہ۔ قاسم بازار۔ آگرہ۔ بھروچ۔ بڑودہ۔ مدراس۔ ملتان اور لاہور تھے۔ وہاں کے ہنرمند کاریگروں کو عمداً فاقوں مارا گیا۔ تاکہ یہ صنعت پنپ نہ سکے۔ حتیٰ کہ لارڈ ولیم بنٹنگ نے اپنی ایک رپورٹ میں کمپنی کو لکھا کہ:۔

''شمالی ہندوستان کے میدان پارچہ بافوں کی لاشوں سے سفید ہو گئے ہیں۔''

لاکھوں لوگ جب اس طریق سے ہلاک ہو گئے تو پھر بھی لاکھوں بچ رہے تھے۔ ان بے چاروں نے چاروں طرف سے لاچار ہو کر آخر مطابق ''مرتا کیا نہ کرتا'' قلبہ رانی اختیار کی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو کام بے دلی اور بے رغبتی سے کیا جائے اس میں کیا خاک برکت ہو گی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل کام تو ہاتھ سے گیا ہی تھا بے چارے اچھے کاشتکار بھی نہ بن سکے۔ دونوں کو شدید نقصان پہنچا۔ غرضیکہ جو ملک ترقی کرتے کرتے بامِ عروج تک پہنچ گیا تھا انگریزوں کی مہربانی سے ہر پھر کر کاشتکار بن گیا۔

سر سیّد احمد خان صاحب نے اپنی کتاب ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' میں ایک سبب یہ بھی لکھا ہے کہ کمپنی کے تمام بڑے بڑے افسر کھلم کھلا عیسائیت کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ پنجاب کے مشہور گورنر لارڈ لارنس شد ومدّ سے خود تبلیغ کیا کرتے تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب The Discovery of India میں لکھا ہے کہ:۔

''جہاں تک صیغہ مال کا تعلق ہے انگریز جس قدر فسق و فجور میں مبتلا رہے۔ اس ساری بداعمالی کی ذمہ داری کلائو پر ہے۔ ہُن برسانے والے درخت کو بار بار ہلایا گیا۔ یہاں تک ۱۷۷۰ میں سب سے زیادہ خطرناک قحط رونما ہوا جس سے لاکھوں آدمی مر گئے۔''

انگریزوں کی لُوٹ کھسوٹ تو اہل ہندوستان کو عمر بھر یاد رہے گی۔ انہوں نے نہ صرف بے شمار روپیہ مختلف طریقوں سے لیا بلکہ ہر قیمتی چیز جو اُن کے ہاتھ لگی جھٹ لنڈن کے عجائب خانوں میں پہنچا دی۔ لنڈن کا برٹش میوزیم۔ وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم۔ انڈیا ہاؤس لائبریری۔ آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری وغیرہ تمام ہندوستان کے مال و متاع سے پُر ہیں۔ تمام قیمتی اور نادر قلمی کتابیں، شاہی ساز و سامان اور یادگار اشیاء، خوشخطی کے اعلیٰ نمونے، قیمتی تصاویر، کتابیں، دستاویزات ہندوستان سے انگلستان پہنچا دی ہیں۔ کوہِ نور برٹش کراؤن کو زینت بخش رہا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کا شراب پینے کا پیالہ بھی لے گئے ہیں۔ سلطان ٹیپوؒ کے کمرۂ خاص کا تمام فرنیچر لارڈ کرزن کے گھر میں موجود ہے جسے وہ بڑے فخر سے ہندوستانی زائرین کو دکھایا کرتے تھے۔ مولانا الطاف حسین صاحب حاؔلی نے انہی

کے متعلق مسدّس میں بجا طور پر فرمایا ہے

نوشتوں سے جن کے ہے ابتک مزین
کتب خانہ ء پیرس و روم و لنڈن

اور علامہ اقبالؔ نے کہا

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

مندرجہ بالا مختصر سے مضمون میں حسب ذیل امور روزِ روشن کی طرح ثابت کر دیئے گئے ہیں:۔

(۱) حدیث شریف کی رُو سے مسیح موعود نے ہندوستان میں آنا تھا۔ اور چونکہ مسیح موعود کے ہاتھوں دجّال نے قتل ہونا تھا لہٰذا ضروری تھا کہ دجّال بھی ہندوستان میں ہی پیدا ہوتا۔

(۲) دجّال کی تمام نشانیاں لغتِ عرب کی رُو سے ایسٹ انڈیا کمپنی پر چسپاں ہوتی ہیں۔

(۳) ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تمام تاجرانہ ہنرمندی، چالاکی، دھوکہ، فریب، سیاست اور ظلم و تعدی کے ساتھ ساتھ عیسائی پادریوں کی سرپرستی کی اور اُن کو اپنی حمایت اور حفاظت میں ہندوستان لاکر عیسائیت کا خوب پراپیگنڈہ کرایا۔ ان پادریوں نے اپنی کفریات اور کذبات کا اپنی سحر بیانی سے اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ لاکھوں مخلوقِ خدا شرک کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہوگئی۔

(۴) ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ملازمین کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ پرائیویٹ تجارت بھی کر سکتے ہیں۔ ان کا مقصد ہرگز ہرگز خدمتِ خلق نہ تھا بلکہ محض روپیہ کمانا تھا۔

(۵) ایسٹ انڈیا کمپنی آئی تو تجارت کرنے تھی۔ مگر آہستہ آہستہ اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے بوجہ کسی سنٹرل گورنمنٹ کے نہ ہونے کے خود ہی مالک بن بیٹھی اور اس ملک کو جو صنعتی اعتبار سے ترقی کے بامِ عروج پر پہنچ چکا تھا اقتصادی طور پر بالکل تباہ کر دیا۔ تا کہ انگلستان کی تجارت کو فروغ ہو۔

(۶) ہندوستان کی تمام قیمتی املاک، یادگار اشیاء، کتب، تصاویر، جواہرات وغیرہ بغیر کسی حق کے اپنے ہاں لے گئے ہیں۔

لہٰذا ان پر لفظِ دجّال درست طور پر چسپاں ہوتا ہے۔ (ماہنامہ مارچ ۱۹۶۰ء)

ذرّیّتِ دجّال جنوبی افریقہ میں

آجکل اخبارات میں جنوبی افریقہ میں کشت وخون سے متعلق خبریں آرہی ہیں۔ کالی آبادی نے گوروں کے خلاف ایک موثر قدم اٹھایا ہے۔ اس کو بغاوت قرار دینا تو ظلم ہے۔ یہ تو منطقی نتیجہ ہے اس ظلم وتشدد کا جو عرصہ دراز سے سفید فام حاکموں نے سیاہ فام، سانولی یا زرد رُو اقوام مقیم جنوبی افریقہ پر روا رکھا ہوا ہے۔ یہ اس جنگِ آزادی کی دوسری لہر ہے جسے گاندھی جی نے اپنے قیامِ جنوبی افریقہ میں شروع کیا تھا۔

برّاعظم افریقہ کے نقشہ کو دیکھئے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی فقیر کی گدڑی ہے جس میں مختلف رنگوں کے مختلف سائز کے پیوند عجیب وغریب فیشن میں لگے ہوئے ہیں۔

دراصل یہ سات یورپین اقوام کے مقبوضات ہیں جنہوں نے ۱۸۸۰ء کے اردگرد اپنی گنجان آبادی کو پھیلانے کے لئے آپس میں دوڑ شروع کی تھی تا کہ اس چھینا جھپٹی میں جو کچھ بھی ہاتھ لگ جائے اُسے مالِ غنیمت سمجھ کر ہضم کر جائیں۔

اُس زمانہ میں سلطنتیں بڑی آسانی سے گھر بیٹھے ہی وسیع کر لی جاتی تھیں اور ان کی قیمت صرف چند بوتلیں شراب کی، کچھ رائفلیں اور چند ادنیٰ قسم کے کھلونے وغیرہ ہوا کرتی تھی۔ کسی افریقن رئیس کو معمولی سی رشوت پیش کر کے ایک معاہدے پر دستخط کرا لئے جاتے تھے جسے وہ غریب سمجھنا تو کجا پڑھ بھی نہ سکتا تھا اور یہ معاہدہ اس کی تمام قلمرو کو غیر ملکیوں کے قبضہ میں دیدیتا تھا۔ بعض اوقات اتنا بھی نہ ہوتا تھا بلکہ چند سیاسی مدبّر لنڈن، پیرس یا برلن میں بیٹھ کر کسی ملک کا نقشہ سامنے پھیلا کر پنسل سے لاکھوں میل رقبہ پر نشان لگا کر قبضہ جما لیتے تھے۔

اس سے قبل ۱۸۶۹ء میں ایک سکاچ ڈاکٹر ڈیوڈ لِونگ سٹون (D.Living stone) نے وسطی افریقہ کی سیاحت شروع کی اور بہت بڑے علاقہ کی چھان بین کی۔ جب متواتر کئی برس تک اس کی کوئی خبر نہ ملی تو اخبار نیویارک ہیرلڈ کے نامہ نگار ہنری ایم سٹینلے نے اس کی تلاش شروع کی اور آخر کار اسے ڈھونڈ نکالا۔ اُسے بوجہ خرابی صحت واپس وطن بھجوا دیا اور خود مصروفِ سیاحت ہو گیا۔

جب سٹینلے اپنی سیاحت سے واپس لوٹا تو اس نے تمام مہذب دنیا کو افریقہ کے سربستہ رازوں سے باخبر کیا۔ اُدھر انہی دنوں میں جان رسکن آکسفرڈ میں برطانی قوم کو یہ درس دے رہا تھا کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنی مملکت کو وسیع کرو، اور اپنی نسل کے لئے نو آبادیاں تلاش کرو۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ یہ لوگ کیوں اپنی سلطنت میں وسعت چاہتے تھے۔

اوّل محبِ وطن لوگوں کی زبردست خواہش تھی کہ ان کی قوم کے مقبوضات زیادہ سے زیادہ ہوں۔ دوم تاجر یہ

خواہش کرتے تھے کہ ان کے مال کے لئے نکاس کی صورت ہو جائے۔ان کو خام مال آسانی سے اور بہت ارزاں قیمت پر ملے۔ایسی منڈیاں ہوں جہاں وہ تجارت میں اپنا سرمایہ لگا سکیں اور ان کی حکومت کا جھنڈا ان کے مفاد کی حفاظت بھی کرے۔سوم مشنری سپرٹ ان عیسائی حکومتوں کو یہ بھی خیال تھا کہ وہ دوسری تمام اقوام کو حضرت یسوعؑ مسیح کا پیغام پہنچائیں پسماندہ اقوام کو تہذیب وتمدن کا سبق پڑھائیں۔مگر تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ اکثر و بیشتر یہ بہانہ محض ذاتی اغراض کے لئے ہی استعمال ہوتا تھا۔چنانچہ ورلڈ ہسٹری کے قابل مصنفین ہیز، ٹون اور وے وَرڈ مطبوعہ میکملن کمپنی لنڈن لکھتے ہیں کہ:۔

"This motive unfortunately,has ofter been made an excuse for selfish greed for example King leopold of Belgium,claimed that he wished to bring the blessing of christian civlizalion to the benighted Negroes of centrel Africa,but in reality he brought them misery a misery that yielded money to the King and his bussiness associates.(p.760 History of the World by Hayes, Moon and wayward)

(ترجمہ):۔بدقسمتی سے یہ بہانہ اکثر ذاتی حرص کے لئے استعمال ہوتا تھا۔مثال کے طور پر شاہ لیوپولڈ آف بیلجیئم نے دعویٰ کیا کہ ان کی خواہش ہے کہ وہ عیسائیت کی برکات اور تہذیب سے وسطی افریقہ کے تاریکی میں گرے ہوئے حبشیوں کو بھی متمتع کریں۔حقیقتاً وہ ان کے لئے سوائے مصیبت کے کچھ نہ لائے۔مگر وہ ''مصیبت'' بادشاہ اور اس کے کاروباری شرکاء کے لئے ''روپیہ'' لائی۔

انگلستان کے بختِ بیدار کی وجہ سے اسے ایک آدمی ایسا ہاتھ آ گیا جس نے ایک سنہری کارنامہ کر کے دکھا دیا۔اس کا نام تھا جان سیسل رہوڈس۔اسے خدا نے دوربین نگاہ بخشی تھی۔اور برطانیہ کے پاس اس کام کے لئے روپیہ تھا۔اور یہ کام انجام پا گیا۔

سیسل رہوڈس ۵رجولائی ۱۸۵۳ء کو انگلستان کے شہر سٹارٹ فورڈ میں پیدا ہوا۔بچپن سے ہی وہ مریل سا تھا۔۱۸۷۰ء میں جب جنوبی افریقہ کے شہر کمبرلے میں ہیروں کی کانیں دریافت ہوئیں۔تو رہوڈس کا بڑا بھائی ان میں شریک ہو گیا۔۱۸۷۲ء میں والدین نے اس بیمار ونزار لڑکے کو بھی وہیں بھجوا دیا۔حسن اتفاق کہ اسے جنوبی افریقہ کی ہوا ساز گار آئی اور اس کی صحت بہت بہتر ہو گئی۔چنانچہ سیسل نے بھی تیس پونڈ کی رقم سے تجارت شروع کی اور ۱۹ سال کی عمر میں ہیروں کی منڈی میں اس کی ساکھ بہت مضبوط تھی۔بوجہ مالی لحاظ سے فارغ البال ہونے کے اس نے ۸ ماہ تک دریائے اورنج اور دریائے وال کے پرے ایک چھکڑے میں سیاحت کی۔یادداشتیں اور نقشے وغیرہ مرتب

کرتا رہا۔ یہ شخص فطرتاً بہت ہی ہوشیار تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

Even the Jews of Kimberley believed that they could not Suecessfully compete with him.(The great Victorla. .by H.J .Massingham.I.N.watson co London.

ترجمہ۔ ''حتیٰ کہ کمبرلے کے یہودی بھی یہ مانتے تھے کہ وہ کامیابی سے اسکے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

اُس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ یہ تمام علاقہ انگریزی سلطنت میں شامل ہونا چاہیئے۔ ۱۸۷۳ء میں اس کی صحت پھر خراب ہوگئی تو وہ انگلستان گیا اور واپسی پر کیپ اسمبلی کا ممبر بن گیا۔ اُن دنوں وہ دھڑ ادھڑ دولت کمار ہا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس نے آکسفرڈ جا کر بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

رہوڈس کا اصل منشاء یہ تھا کہ قاہرہ سے کیپ تک مسلسل ان کی نو آبادیاں ہوں۔ ریلوے کی لائن ہو اور ٹیلیگراف ہو۔ اور ان علاقوں کا تمام خام مال انگلستان کے تاجروں کو نہایت سستے داموں ملے۔ تا کہ ان کے ہم قوم خوب تجارت کر کے دولت جمع کریں۔ اور دُنیا میں ممتاز ہو جائیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ:۔

I look upon this territory as the Suez canal of this country.

یعنی ''یہ علاقے اس ملک کے سوئیز کنال ہیں''۔

اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ:۔

He felt not merely that trade follows the flag but that the flag must first be made to follow the trade and that the crown must shed its luster on the concessionaire.

(p 60-cecil Rhodes by W.Plomer .T.Nelson Co London.)

ترجمہ۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ نہ صرف تجارت (کسی ملک کے) جھنڈے کے پیچھے چلے۔ بلکہ سب سے پہلے جھنڈے ''تاج'' کو اپنی ضیاء مراعات حاصل کرنے والے (افراد یا کمپنی) پر ڈالنی چاہیئے'' دیکھا آپ نے کیا بات کہہ گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حکومت کو اپنے افراد کی ہر ممکن طور پر مدد کرنا چاہیئے۔ اور امداد باہمی سے ترقی ہو گی۔

دراصل رہوڈس کا منشاء یہ تھا کہ ایک ایسی خفیہ سوسائٹی بنائی جائے جسکا مقصد تمام افریقہ، فلسطین، عراق، سائپرلیس، بحرالکاہل کے تمام جزیرے (جو ابھی تک سلطنت برطانیہ کے زیر نگیں نہ ہوں) پر برطانوی قبضہ ہو۔

(کتاب سیسل رہوڈس ص ۲۵)

یہ تو وہی بات ہوئی جو خالصہ بہادر کہا کرتے تھے کہ **''راج کرے گا خالصہ باقی رہے نہ کو''**۔ گویا تمام دنیا پر برطانیہ کی ہی حکومت ہو۔ باقی علاقوں کو چھوڑیئے کم از کم جنوبی افریقہ میں تو سیسل رہوڈس نے برطانیہ

کا جھنڈا لہرا کر دکھا دیا۔ کس طرح قبضہ کیا؟ اب اسکی داستان سنیے۔

کیپ کالونی کے شمال کی جانب ایک حبشی قبیلہ متابلی آباد تھا۔ جس کے رئیس کا نام تھا لوبن گلا (Lobengula) سیسل رہوڈس نے پہلے تو لوبن گلا کے پاس ایلچی بھجوایا کہ تم برطانیہ کی ''حفاظت'' میں آ جاؤ۔ اس پر خوب دباؤ ڈالا۔ وہ کب ماننے والا تھا۔ تب رہوڈس خود وہاں گیا اور مکی کے ایک بڑے کھیت کے قریب مشین گن لگوا کر بے تحاشہ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ چند منٹ میں وہ کھیت ڈھیر ہو گیا۔ تب اہل متابلی کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ بالکل اسی طرح تم کو ختم کر دوں گا اگر تم نے ہماری اطاعت قبول نہ کی۔ اور ساتھ ہی لوبن گلا کو ایک ہزار پاؤنڈ ماہوار نقد اور ایک ہزار رائفل مع گولیوں کے ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ طوعاً و کرہاً لوبن گلا نے انگریزوں کی حفاظت میں آنا منظور کر لیا۔ بعد میں وہ حسرت سے کہا کرتا تھا کہ:۔

They came like wolves without my leave to make roads into my country.

ترجمہ۔''وہ بھیڑیوں کی طرح بغیر میری اجازت کے میرے ملک میں گھس آئے''۔

ایک دفعہ اس نے ملکہ وکٹوریا کو خط لکھوایا کہ:۔

If the Queen hears that I have given away the whole of my country it is not so. I do not understand where the dispute is becuse I have no Knowledge of it.

ترجمہ۔ اگر ملکہ یہ سُنے کہ میں نے اپنا تمام ملک دیدیا ہے تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔ میں تو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ جھگڑا کس بات کا ہے (کم از کم) مجھے کچھ علم نہیں ہے''

بے چارہ کیا سادہ لوح آدمی تھا! جھگڑا کیوں ہوتا جب بغیر جھگڑے کے ہی چار لاکھ پچاس ہزار مربع میل کا نہایت زرخیز وسیع علاقہ ملکہ کے زیرنگیں آجائے! کچھ عرصہ بعد باقاعدہ قبضہ کر لیا اور لوبن گلا کو نکال باہر کر دیا گیا۔ سیسل رہوڈس کا سوانح نگار ولیم پلومر لکھتا ہے کہ:۔

"The so called Matabele war was promoted mainly by Rhodes., the company (south African Co) bore the whole expenses of the campaigne and when it was over the Imperial authorities allowed Rhodes to go on having his own way. sir Henry Lock had in the Queen,s name repeatedly assured Lobengula that there was no design on his lands but Dr: Jameson

backed and inspired by Rhodes did not hesitate to arrange with his pack of freebooters to smash the Matabele;(p.82 c.Rhodes)

ترجمہ :۔ ''نام نہاد متابلی واردراصل رہوڈس نے جاری کی اور کمپنی (مراد ساؤتھ افریقن کمپنی جس کا خود رہوڈس مالک تھا) نے جنگ کے تمام اخراجات ادا کئے۔ جب جنگ ختم ہوگئی تو امپیریل اتھارٹی (مراد کابینہ انگلستان) نے رہوڈس کو اپنی من مانی کاروائی کرنے کی اجازت دیدی۔ سر ہنری لاک نے بار بار لا بن گلا کو یقین دلایا کہ اس کی قلمرو پر (قبضہ کرنے کا ہر گز ہمارا ارادہ نہیں ہے۔ مگر ڈاکٹر جیمز سن نے رہوڈس کی پشت پناہی اور اشارے سے قبیلہ متابلی کو پرزے پرزے کر کے رکھ دیا۔''

لو بن گلا بے چارہ بہت شریف انسان تھا مگر اس کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:۔

There was nothing that was not discreditable in the fraud, provocation and slaughter by which its destruction was engineered .throughoult the last act of that conflict Lobengula made a far better showing for the credit of humman character than did the assilants of his domains.

(p. 82) (cecil Rhodes by W.plomer .)

(ترجمہ) اس کی تباہی کے لئے جس قدر بھی ذرائع استعمال ہوئے اور جس قدر بھی فریب، اشتعال اور قتلِ عام اختیار کیا گیا۔ وہ حد درجہ مذموم تھا۔ اس کشمکش کے آخری دور میں لو بن گلا نے انسانی کردار کے تمام قابلِ تعریف پہلو انتہائی طور پر نمایاں کئے بہ نسبت ان کے جو اس کی سلطنت پر حملہ کرنے آئے تھے۔''

ان تمام کارروائیوں کی باقاعدہ رپورٹ کابینہ انگلستان کو مل رہی تھی اور ان کی پوری تائید سے یہاں عملدر آمد ہو رہا تھا۔ خود ملکہ وکٹوریا بھی بے خبر نہ تھی۔ اسی زمانہ کے قریب جب سیسل رہوڈس انگلستان گیا تو ملکہ نے پوچھا کہ:۔

"What are you engaged on Mr Rhodes? "I am doing my best to enlarge .your Majesty,s Dominons (78.A world History of our own times byQuincy How New Yark)

ترجمہ:۔ مسٹر رہوڈس آجکل آپ کیا کر رہے ہیں؟

رہوڈس نے جواب دیا کہ ''میں ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں کہ ملکہ معظمہ کی قلمرو کو وسیع کروں۔''

آیوری مینز انسائیکلو پیڈیا جلد ششم صفحہ ۵۰۷ پر لکھا ہے کہ:۔

In this Simal tenous rush of the powers for protectorates and

the spheres of influence in Africa cecil Rhodes in S.Africa and sir George Goldie in west Africa agumented the British Empire within the space of 20 years by a total area extending that of the whole Europe.

ترجمہ: ۔مختلف طاقتوں نے جو اکٹھی دوڑ لگانی شروع کی ۔تاافریقہ میں نو آبادیاں اور حلقہ ہائے اثر قائم کرسکیں اس میں سیسل رہوڈس نے جنوبی افریقہ میں اور سر جارج گولڈی نے مغربی افریقہ میں مجموعی طور پر سارے یورپ سے بھی کہیں زیادہ وسیع علاقے برطانوی سلطنت میں بڑھائے۔''

یہ تو انگریز قوم کا وہ سلوک تھا جو انہوں نے جنوبی افریقہ کے اصل باشندوں سے کیا۔اب آپ سنئیے کہ جنوبی افریقہ کی سفید فام یورپین اقوام سے کیا سلوک کیا۔

۱۶۵۲ء میں ڈچ قوم نے جنوبی افریقہ میں سے انگریزوں کو نکال کر قبضہ کرلیا۔مگر ۱۸۱۴ء میں انگریزوں نے ڈچوں کو نکال کر قبضہ جمالیا۔بوئرقوم جو وہاں آباد تھی انگریزوں کے ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف تھی۔اس نے دریائے اورنج اور دریائے وال کے پرے جاکر دو ریاستیں قائم کرلیں۔جن کا نام اورنج فری سٹیٹ اور ٹرانسوال تھا۔جونہی جوہنسبرگ میں سونے کی کانیں اور کمبرلے میں ہیرے کی کانیں دریافت ہوئیں انگریزوں نے ان دونوں ریاستوں کی سرحدوں پر کچھ بے سرداری فوج بھجوا دی جو ہر دم چھیڑ خانی کرتی رہتی تھی۔جس پر تنگ آکر بوئروں کے پریذیڈنٹ پال کروجر نے برٹش گورنمنٹ کو الٹی میٹم دیدیا کہ یا تو ان لوگوں کو بند کرو ورنہ پھر ہماری تمہاری جنگ ٹھن جائے گی۔آخر کار جنگ چھڑ گئی۔

انگریزوں نے سمجھا تھا کہ ان بوئروں کی بھلا کیا مجال ہے جو ہمارے ایسی منظم گورنمنٹ سے چند دن بھی لڑسکیں مگر تین سال تک بوئروں نے انگریزوں کو حیران پریشان کئے رکھا۔سر ولیم بٹلر کو کمانڈر بنا کر بھجوایا تو اُسے معلوم ہوا کہ

سیسل رہوڈس اور اسکی پارٹی اس جنگ کو خوب ہوا دے رہے ہیں اور یہ کہ برٹش وار آفس بھی ایسے احکام جاری کررہا ہے جو انصاف اور عقلمندی کے خلاف ہیں:۔

The motives behind the whole affair were mixed and some of them were sordid (life a Times of Churchill, oldhour press London .48.)

ترجمہ:۔''اس تمام معاملہ کی تہہ میں جو ترغیبات تھیں وہ ملی جلی تھیں اور بعض تو نہایت درجہ کمینہ تھیں۔''

گو اس جنگ میں انگریزوں کا ۲۰ لاکھ پاؤنڈ روزانہ خرچ آرہا تھا مگر ہر روز شکست کے سوا کچھ نصیب نہ ہوتا تھا۔تمام برٹش ایمپائر کی طاقت صرف ہو رہی تھی۔مگر بوئر تھے کہ ان کو دباتے ہی چلے آتے تھے:۔

The Boers swept down the Natal, routed and Killed General Symonds, Bottled up sir Geerge white in Lady smith and won a big victory at Nicholson,s Nek.To the west of the Transvaal Baden powell was besieged at Mafeking of further south kimberley was invaded by the enemy.)

(بحوالہ سابق ص ۴۸۔۴۹)

ترجمہ:۔ بوئر نٹال پر چھا گئے۔ انہوں نے جنرل سمنڈز کو شکست دیکر مار ڈالا۔ سر جارج وائٹ کو (شہر) لیڈی سمتھ میں بوتل کی مانند قید کر دیا اور نکلسن پر بہت بڑی فتح حاصل کی۔ ٹرانسوال کی جانب غرب انہوں نے بیڈن پاول کو میفکنگ میں محاصرہ میں لے لیا۔ اور جانب جنوب کمبرلے پر حاوی ہو گئے۔''

بوئروں کے ذکر میں ڈاکٹر جیمز سن کا حملہ بڑا مشہور واقعہ ہے سیسل رہوڈس نے اپنے ایک چیلے ڈاکٹر جیمز سن کو ۵۰۰ آدمی دیکر سرحد پر بھجوا دیا۔ ادھر جوہنسبرگ میں جو انگریز لوگ رہتے تھے ان میں دو ہزار رائفلیں تقسیم کرا دیں اور یہ طے پایا کہ ادھر سے ہم حملہ کریں گے شہر کے اندر سے تم شورش کرنا۔ اس طرح ہم کو کامیابی حاصل ہوگی۔ مگر پریذیڈنٹ پال کروجر کوئی بچہ نہ تھا اُسے تمام معاملہ کی خبر تھی۔ وہ چوکس ہو گیا۔ جونہی حملہ ہوا بوئر فوج نے ڈاکٹر جیمز سن کے دستے کو گھیرے میں لیکر گرفتار کر لیا۔ شہر والوں نے ذرا بھی حرکت نہ کی اور اس طرح تمام معاملہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ انگریزوں کی خوب جگ ہنسائی ہوئی۔ ادھر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ بوئروں کے ہاتھ وہ خط و کتابت آ گئی جس سے معلوم ہوا کہ یہ تمام سازش سیسل رہوڈس کی تھی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۹ کے صفحہ ۲۵۹ پر لکھا ہے کہ:

"A cipher correspondance, siezed and published by the Boers left the civilized world in doubt as to Rhodes Share in the previous preparation and he was for a time believed to be responsible for the raid itself .

ترجمہ:۔ خفیہ خط و کتابت جو بوئروں کے ہاتھ آئی اور انہوں نے اس کی اشاعت کی جس سے تمام مہذب دنیا ہکا بکا رہ گئی کہ قبل از وقت تیاری میں رہوڈس کا بھی حصہ تھا اور کافی عرصہ کے لئے یہ مان لیا گیا کہ وہی اس حملے (جیمز سن والے حملے) کا بانی مبانی ہے۔ پارلیمنٹ کے کمشن نے گو اسے بری قرار دیا مگر خود رہوڈس نے بعد میں اقرار جرم کر لیا تھا۔

Morally and officially he accepted full responsibility (The Grea Victorious)

بعد میں لارڈ بیڈن پاول کے نام سے مشہور ہوئے۔ سکاؤٹنگ کے بانی مبانی یہی تھے۔ سکاؤٹنگ کا پہلا تجربہ میفکنگ میں ہی انہوں نے کیا تھا۔

اخلاقاً اور سرکاری طور پر رہوڈس نے اس کی تمام ذمہ داری قبول کی۔ مزید دیکھئے اسی کتاب کے صفحہ ۴۲۸ پر حق پسند مصنف لکھتا ہے کہ:۔

Presumably by Rhode's orders and certainly with his full approval Dr:Jameson organised a force.

ترجمہ:۔ اغلباً رہوڈس کے حکم سے اور یقیناً اس کی پوری منظوری سے ڈاکٹر جیمز سن نے ایک دستہ تیار کیا......وغیرہ''

غرضیکہ اس ڈاکٹر کی بے وقوفی سے تمام معاملہ بگڑ گیا اور انگریزوں کو شکست ہوگئی۔ اگر تو یہ ڈاکٹر صاحب صرف اپسم سالٹ تک ہی رہتے تو بات بھی تھی۔ انہوں نے تو اپنے آپ کو knight hood کے لئے تیار کیا ہوا تھا۔

آخر کار ۴۸ سال کی عمر میں جان سیسل رہوڈس فوت ہوگیا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے:۔

"So little done so much to do."

ترجمہ:۔ بہت قلیل کام ہوا ہے۔ اور بہت کام باقی ہے۔''

اس کی وصیت میں ۲۰۰ وظائف آکسفرڈ یونیورسٹی میں برٹش نوجوانوں کی اعلیٰ تعلیم وتربیت کے لئے لکھے ہوئے ہیں اور اب تک مل رہے ہیں۔ روڈیشیا میں اس کا بنگلہ اب تک جنوبی افریقہ کے وزیراعظم کا دیہاتی مکان ہے۔

آخر کار فروری ۱۹۰۰ء میں لارڈ رابرٹس اور سر ہربرٹ کچنر (Kitchner) (بعد میں لارڈ کچنر Kitchner) کو جنگ کا کمانڈر بنا کر بھجوایا گیا۔ ان دونوں نے مل کر بوئروں کو شکست دی۔ تین سال تک تو وہ بیچارے جوانمردی سے لڑے۔ اب تھک گئے تھے آخر باعزت صلح کر لی۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

Such an unequal struggle could have only one outcome. over whelmed by sheer numbers, the Boers finally accepted peace in England's terms (p.754 A world History by Hayes, Moon and wayward London).

آخر کار انگریز اور ڈچ مِل کر رہنے لگے۔ انہی بوئروں میں سے جنرل بوتھا اور جنرل کرسچن سمٹس (smuts) ہمارے اپنے زمانہ میں بہت مشہور ہستیاں ہوگزری ہیں۔ دونوں باری باری متحدہ جنوبی افریقہ کے وزیراعظم رہے ہیں اور یوں اپنی شکست کو انہوں نے فتح میں تبدیل کر لیا۔

لارڈ کچنر نے بوئروں پر بے حد ظلم کئے۔آدمی بڑا سخت گیر تھا۔چنانچہ ورلڈ ہسٹری میں لکھا ہے کہ:۔

In south Africa our troops are burning farms under Kitchner's command and the Queen and the two Houses of parliament and the Bench of Bishops thank God publicly and vote money for the work (p91) Humanatarious in England and elsewhere called Kitchner's Methods barbaric,since women and children died of disease in concentration camps while British Troops burned Boer crops and farmhouses .

ترجمہ:۔جنوبی افریقہ میں ہماری افواج کچنر کے ماتحت (زراعتی) فارموں کو نذرِ آتش کر رہی تھیں۔ملکہ معظمہ، پارلیمنٹ اور بشپ صاحبان علانیہ طور پر خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کر رہے تھے اور اس کام (جنگ) پر روپیہ صرف کر رہے تھے۔(ص ۹۱۔۹۲)

انگلستان اور دوسرے مقامات پر خدا ترس لوگوں نے کچنر کے طریقوں کو نہایت درجہ ظالمانہ قرار دیا۔کیونکہ عورتیں اور بچے بیماری سے فوج کیمپوں میں مر رہے تھے جبکہ انگریز سپاہی بوئروں کے فارم اور مکانات کو غارت و برباد کر رہے تھے۔''

جنوبی افریقہ میں تقریباً ۱۰۰ سال ہوئے محنتی ہندوستانی سکھ، مسلمان، ہندو گئے۔کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ مگر ان بیچاروں کو وہاں پر کوئی حق حاصل نہیں ہے۔نہ ووٹ دے سکتے ہیں نہ ان کا کوئی ممبر بن سکتا ہے۔نہایت حقارت سے دیکھے جاتے ہیں۔اور حبشیوں کی فہرست میں ان کا شمار ہے۔وہی بات ہے کہ

نامراد آپ کا کیوں آپ سے پائے گا مراد
اس کو کیا حق ہے جسے حق نہیں حاصل کوئی

۱۸۹۳ء میں جب مسٹر گاندھی وہاں گئے تو ہندوستانیوں کی حالتِ زار دیکھ کر ان کے دل کو سخت چوٹ لگی۔مگر جوں جوں وہ بہتری کے لئے کوشش کرتے اتنی ہی ان کی ذاتی طور پر ہتک کی جاتی تھی۔ان کو کوئی کپڑے دھو کر نہ دیتا تھا۔مہتر کا کام خود کرتے رہے۔باوجود ٹکٹ خریدنے کے فسٹ کلاس کی گاڑی میں سوار نہ ہونے دیتے تھے۔ غرضیکہ ہر ذلت وہاں پر ہندوستانیوں کے ہی نصیب ہے۔جنگ بوئر میں خود گاندھی جی نے گورنمنٹ کو پیشکش کی کہ ہم سے بھی جنگی خدمت لی جائے مگر مسٹر آر۔جیمز سن نے صاف کہہ دیا کہ

You Indians know nothing of war. You would only be a drag on the army. You would have to be taken care of instead of being

of helps to us (p.52 An Indian palriot in south Africa by J.J.Doke 1909)

آخر کار جب جنگ میں خوب ہار کھائی اور زخمی لوگوں کو سنبھالنے والا کوئی نہ ملا تو ہندوستانی یاد آئے۔ان لوگوں نے دلی شوق سے کام کیا۔لارڈ رابرٹس کے بہادر زخمی فرزند کو یہی ہندوستانی لوگ اٹھا کر ۳۰ میل دور ہسپتال میں لے گئے تھے۔بہت سے مارے بھی گئے مگر انگریزوں کی نظر میں پھر بھی زندیق ہی رہے۔جوہنسبرگ میں شدید پلیگ پھیل گئی۔۱۲۵ آدمی آناً فاناً مر گئے۔ہندوستانیوں نے سب کو دفن کیا، ہسپتال قائم کئے بیماروں کی خدمت کرتے رہے۔سوائے ایک انگریز ڈاکٹر سیویج (savage) کے ایک شخص کی بھی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس نے پلیگ میں کام کیا ہو۔پھر بھی ان کی قدر نہ ہوئی۔غرضیکہ ہندوستانیوں سے اس قدر وحشیانہ سلوک ابتک روا رکھا ہوا ہے کہ عقل حیران ہے۔

ہر ممکن طریق سے تمام ایشیائی اقوام کو ذلیل کیا جاتا ہے۔جنوبی افریقہ میں ایک ایشیائی موٹر تو خرید سکتا ہے مگر اس کو اس بات کی اجازت نہ دی جائیگی کہ وہ موٹر ٹھہرانے کے لئے گیراج حاصل کر سکے یا ایسا مکان کرایہ پر لے سکے جہاں گیراج بھی ہو۔شہر سے ۴۰۔۵۰ میل دور شاید اُسے اتفاق سے کوئی ایسا مکان مل جائے۔ہر وہ شخص جو انگریز نہیں ہے اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا شناختی کارڈ ہر وقت اپنے پاس رکھے ورنہ پولیس کو حق حاصل ہے کہ اسکے خلاف قانونی کاروائی کرے۔اب حال ہی میں بمقام شارپ ولا کالوں نے مشورہ کر کے سرِ بازار اپنے پرمٹ جلا دیئے اور حکومت کو صاف انگوٹھا دکھا دیا۔بات بڑھی اور آخر کار فساد ہوا۔گولی چلی سینکڑوں کی تعداد میں مر گئے ہیں۔کوئی پرسان حال نہیں۔فوٹو گرافروں کو اجازت نہیں کہ وہ فوٹو باہر بھجوا سکیں۔تاہم چند فوٹو باہر کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔لنڈن میں نسلی امتیاز کے خلاف بڑا احتجاج ہوا۔جلوس نکالے گئے ہیں۔خود یو۔این۔او نے ۱۰۔۱۲ کی کثرت سے ووٹ پاس کر کے جنوبی افریقہ کی حکومت کی اس پالیسی کے خلاف اظہار نفرت کیا ہے۔لنڈن کے مزدوروں نے عہد کر لیا ہے کہ وہ جنوبی افریقہ کے مال کو جہاز سے نہیں اتاریں گے۔دکانداروں نے عہد کر لیا ہے کہ وہ جنوبی افریقہ کا بنا ہوا مال فروخت نہیں کریں گے۔انگلستان کے کرکٹ کے مشہور کھلاڑی ڈیوڈ شیرڈ نے (جو پیشہ کے لحاظ سے پادری ہے) جنوبی افریقہ کی کرکٹ ٹیم کے ساتھ کھیلنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔چند روز ہوئے جنوبی افریقہ کی ٹیم جب لنڈن پہنچی تو اسکے خلاف لوگوں نے سخت نعرے لگائے اور کہا کہ ’’نسلی امتیاز کرکٹ نہیں ہے‘‘ ’’نسلی امتیاز کو چھکا لگاؤ‘‘۔نسلی امتیاز کو آؤٹ کر دو‘‘ اور تو اور روم کے پوپ صاحب نے بھی اپنے ایسٹر کے وعظ میں نسلی امتیاز کی سخت مذمت کی ہے کیونکہ یہ چیز شخصی، شہری اور مذہبی آزادی کے خلاف ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ سفید لوگ خود اپنے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات پیدا کر رہے ہیں۔اب کالا ہونا ہی جرم نہیں رہا۔بلکہ سفید ہونا بھی جرم ہو گیا ہے۔ابتک تو یہ نشہ حکومت میں تمام ایشیائی قوموں کو پائے استحقار سے ٹھکراتے رہے ہیں۔مگر اب یہی رَو دوسری طرف بہنی شروع ہو گئی ہے۔حکومت ذرا سوچے کہ اس کی ’’راج

ہٹ'' کب تک قائم رہے گی؟

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

گزشتہ ۷۰۔۸۰ برس سے انگریز نسلی تفاخر کے نشہ میں جھوم رہے تھے مگر اب وہ نشہ اُتر رہا ہے۔ تازہ خبر یہ ہے کہ جوہنسبرگ کے انگریز لاٹ پادری صاحب وہاں سے خفیہ طور پر بھاگ کر لنڈن پہنچ گئے ہیں تا مظلوم ایشائی اقوام کے حق میں اپنے چشمدید واقعات پیش کر کے دنیا سے انصاف کے نام پر اپیل کر سکیں۔

الغرض جہاں جہاں بھی انگریز کے قدوم نحوست لزوم گئے ہیں انہوں نے وہاں کے اصل باشندوں پر لا متناہی مظالم کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کے ہر مفاد کو کچلا۔ بیجا ٹیکس عائد کئے گئے۔ صرف اس واسطے کہ ان کی اپنی تجارت کو فروغ حاصل ہو۔ انکے ہموطنوں کو اعلیٰ ملازمتیں مل سکیں ہر ممکن طریق سے اہل ملک کو ذلیل کرتے رہے ہیں۔ اپنے آپ کو کوئی آسمان سے اُتری ہوئی نسل سمجھتے رہے ہیں۔ اہل ملک کو ہمیشہ اعلان کے ذریعہ سے یقین دلاتے رہے ہیں کہ ہم تمہاری مذہبی رسوم، رسم ورواج، تمدّن اور روایات کا احترام کریں گے۔ مگر یہ اعلان صرف دکھاوے کے لئے ہوتا تھا۔ ہمیشہ اپنا اُلو سیدھا کرتے رہے ہیں۔ اور اسی ملک کی دولت سے جھولیاں بھرتے رہے ہیں۔ انہی چیزوں کا نام دوسرے الفاظ میں ''دجالیت'' ہے۔

(ماہنامہ مصباح جون ۱۹۶۰ء)

ذریّتِ دجّال مصر میں

سرزمین مصر میں پہلے پہل انگریزوں نے اسمٰعیل پاشا خدیو مصر (۱۸۶۳۔۷۹ء) کے عہد حکومت میں قدم رکھا۔اور پھر ایسے پاؤں جمائے کہ نکلنے کا نام نہ لیا۔تا آنکہ جمال عبدالناصر کی قیادت میں مصریوں کی شدید جدوجہد نے انہیں ۱۹۵۶ء میں وہاں سے نکلنے پر مجبور کردیا۔اس عرصہ دراز کی خونچکاں داستان مختصر اُسنئیے :۔

فرانس کے ایک نہایت ہی قابل اور ذہین انجینئر فرڈی ننڈ ڈی لیسپ نے بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کو ایک نہر کے ذریعہ ملانے کی سکیم بنائی۔جس کا بڑا فائدہ یہ بتایا گیا کہ یورپ سے مشرق کو جانے کیلئے بہت آسان رستہ نکل آئے گا۔اُس وقت مشرق کو جانے کیلئے ایک ہی راستہ تھا جو براعظم افریقہ کے گرد چکر کاٹ کر طے کرنا پڑتا تھا۔یہ راستہ بڑا طویل اور تکلیف دہ تھا۔

اس آبی رستے کا منصوبہ یوں تو بہت ہی پُرانا ہے۔فرعون نیخو (Necho) نے یہاں ایک بہت بڑی نہر کھدوانے کا بندوبست کیا تھا اور ایک لاکھ سے اُوپر مزدور بیگار میں لگائے تھے مگر سکیم سرے نہ چڑھی۔پھر ایران کے بادشاہ دارا گشتاسپ نے بھی نہر کا انتظام کرنا چاہا مگر رہ گیا۔مسلمانوں نے بھی اپنے عہد میں کوشش کی مگر کسی نہ کسی وجہ سے کامیاب نہ ہوئے۔ماہرین کو ایک خوف یہ بھی تھا کہ بحیرہ روم کی سطح بلند ہے نہر کھدوانے سے کہیں تمام مصر زیر آب نہ ہو جائے۔نپولین اعظم نے بھی اپنے زمانے میں ایسی کوشش کی مگر وہ بھی دوسرے حالات میں اُلجھ کر رہ گیا۔

اس نہر کے کچھ فوائد بھی تھے۔(۱) مالی فوائد۔یورپ، ایشیا اور آسٹریلیا کے درمیان آمدورفت کا مختصر قریبی راستہ مل گیا اور اس طرح سے مسافت بے حد کم ہوگئی۔مال لانے اور لے جانے میں اخراجات بہت حد تک کم ہو گئے۔راس امید کے راستے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جس سے سیاح فائدہ اُٹھا سکتے (۲) نہر سویز کے آس پاس کئی تاریخی مقامات تھے مثلاً عرب، فلسطین، لبنان، مشرقی یورپ جنوبی یورپ کے متعدد صحت افزا مقامات، یونان کے تاریخی مندر، مصر کے اہرام اور دیگر عجائبات اور بحیرۂ روم کے جزائر، یہ بہت بڑے فوائد تھے لیکن اس کے بالمقابل کچھ باتیں بڑی تاریک بھی تھیں۔مثلاً اس نہر کے ذریعہ اہل مصر کے لئے ایک ایسا آہنی جال تیار کردیا گیا جو بڑی مشکل سے توڑا گیا۔اس نہر کی وجہ سے انگریزوں نے عرب کے مختلف ممالک میں قدم جمالئے تاکہ نہر کی حفاظت کے لئے وہ اپنے اڈے قائم کرسکیں۔چنانچہ عدن اور اس کے اردگرد کے علاقہ پر اس غرض سے قبضہ کیا گیا۔بعد میں اس میں تیل کی کشش بھی پیدا ہوگئی بعض لوگوں کا خیال ہے۔کہ عرب کے پہلو میں اسرائیل کی حکومت اسی واسطے قائم کی گئی ہے تاکہ وہ عربوں کے لئے خارِ پہلو ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ نہر سویز پر قبضہ کے دوام کا موجب بھی بنے۔

نہر سویز نکالنے کا جب منصوبہ بن رہا تھا اُسوقت برطانیہ کا وزیراعظم لارڈ پامرسٹن تھا۔اس نے سعید پاشا خدیو مصر پر اپنے سفیر مقیم قسطنطنیہ کے ذریعہ زور ڈالا کہ یہ نہر ہرگز نہیں بنی چاہیئے۔اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ ڈی لیسپ کو نہر کھودنے کی اجازت نہ ملے اور ابتداء میں وہ اس بات میں کامیاب بھی ہوگئے مگر ڈی لیسپ بھی بڑے پکے ارادے

کا آدمی تھا اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اور سعید پاشا پُرانے دوست تھے آخر کار ۱۸۶۰ء میں سعید پاشا نے اُسے نہر کھودنے کا فرمان دیدیا۔

ابتدائی کام شروع ہوا تو انگریزوں نے پھر روڑے اٹکانے شروع کئے۔ اس وجہ سے ۱۸۶۴ء میں کام بند ہو گیا۔ مگر ڈی یسپ نے پھر نئے عزم کے ساتھ دوبارہ کام شروع کر دیا اور آخر کار ۱۵ رنومبر ۱۸۶۹ء کو اس نہر کا افتتاح شہنشاہِ فرانس نپولین سوم کی ملکہ نے کیا۔ ان کا جہاز جس پر یورپ کی بعض مایہء ناز ہستیاں سوار تھیں۔ رات کو Bitter Laces میں لنگر انداز رہا اور اس تقریب پر بہت خوشی منائی گئی۔ یہ نہر ۱۰۱ میل لمبی ہے۔ اس کے شمالی سرے پر پورٹ سعید ہے اور جنوبی سرے پر سویز کا گاؤں ہے۔

انگریز نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اس کے ہوش بجا ہوئے اور اسے افسوس ہوا کہ اس عظیم الشان آبی شاہراہ میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے انگریزوں کو یہ بھی خطرہ محسوس ہوا کہ ان کے مشرقی مقبوضات غیر محفوظ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہی انگریز جو پہلے اس نہر کے کھودے جانے کے سخت مخالف تھے اب ہر ممکن حیلے بہانے سے کوشش کرنے لگے کہ اس کمپنی کے حصص خریدیں۔ چنانچہ انہوں نے اُس وقت تک چین نہ لیا جب تک ایک لاکھ چھتر ہزار چھ سو دو حصص انتالیس لاکھ چھہتر ہزار پانچ سو بیاسی پونڈ کے عوض خرید نہ لئے۔ یہ کارنامہ برطانیہ کے یہودی الاصل وزیرِاعظم بنجمن ڈسرائیلی نے سرانجام دیا انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۲۳ صفحہ ۱۵۹ پر لکھا ہے:۔

"نئے وزیرِاعظم کی شاہی اور خارجہ پالیسی بالکل ملکہ معظمہ کی مرضی کے مطابق تھی جس نے سویز کینال کے حصص حاصل ہونے پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔"

وزیرِاعظم کے اس کارنامہ پر ملکہ وکٹوریہ کو خوش ہونا ہی چاہیئے تھا کیونکہ اس کی سلطنت کے استحکام کے لئے ایک نہایت مضبوط قدم گاہ میسر آ گئی تھی۔ نیز چونکہ فرانس کے بعد سب سے بڑے حصہ دار اب انگریز تھے اس لئے اس سے ان کی کلاہِ افتخار میں ایک اور طرۂ امتیاز کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جغرافیائی طور پر بھی ان کو تمام دوسری اقوام پر ایک گونہ تفوق حاصل ہو گیا۔ کیونکہ دنیا کے ۸۰ فیصدی جہاز برطانیہ کی ملکیت میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ عظیم اول و دوم میں جرمنی کے بحری بیڑے کو نہر سویز کی طرف آنے کی قطعاً جرأت نہ ہو سکی۔

سویز کینال کمپنی کے مرکزی دفاتر پیرس اور لنڈن میں تھے۔ جس قدر جہاز نہر میں سے گزرتے تھے وہ یا تو نقد رقم ادا کرتے یا چیک دے جاتے جو پیرس اور لنڈن کے بنکوں سے بھی کیش ہوتے تھے مطلب یہ ہے کہ تمام روپیہ بجائے مصر میں جمع ہونے کے لنڈن اور فرانس چلا جاتا۔ بعد میں حساب کتاب کر لیا جاتا جس کے نتیجہ میں ایک بہت ہی معمولی رقم مصری حکومت کو ملتی۔ اس کمپنی کے کل ڈائرکٹر ۳۲ تھے۔ ۲۱ فرانسیسی ۱۰ انگریز اور ایک ڈچ۔ مصر والوں کی نمائندگی کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

نہر سویز کی اصل آمد تو اللہ ہی جانے مگر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا والے نے اتنا اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۲۸ء تک جس قدر سرمایہ برطانیہ نے ابتداء میں لگایا تھا۔ وہ اسے آٹھ گنا وصول ہو چکا تھا۔ اور راس المال محفوظ تھا۔ (ص ۵۱۸ جلد ۲۱)

مصر کی مالی مشکلات کی کہانی ۱۸۶۲ء سے شروع ہوتی ہے جب خدیو مصر نے ۳۳ لاکھ گنا قرض لیا۔ نہر کی تعمیر کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مصری حکومت تمام مزدور مہیا کرے گی۔ ان کے لئے کوارٹرز مہیا کرے گی۔ میٹھا پانی سپلائی کرے گی اور تنخواہ بھی دے گی۔ ان تمام اخراجات کے لئے خدیو مصر کے پاس کوئی پیسہ نہ تھا۔ لہذا اس نے ابتدائی اخراجات کے لئے بعض یورپین طاقتوں سے قرض لیا۔ دوران تعمیر میں جب نہر سویز کا کام عارضی طور پر بند ہو جاتا تو ان قرض خواہوں کو خیال آتا تھا کہ کہیں ہماری رقوم ضائع ہی نہ ہو جائیں۔ مگر ان کو وعدے سے تسلی کرادی جاتی مگر آخر کب تک اس طرح کام چلتا۔ آمد تو تمام کی تمام فرانس اور برطانیہ والے لے جاتے تھے۔ مصر کے پلے میں کیا پڑتا تھا؟ اُوپر سے قرض خواہوں نے زیادہ سختی سے قرض مع سود کی واپسی کا مطالبہ شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدیو مصر نے ان روز روز کے مطالبوں اور بڑھتے ہوئے سود سے تنگ آ کر اپنے حصص برطانیہ کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔

اس وقت مصر کی مالی حالت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جنوب میں سوڈان اور ابی سنیا کے ساتھ لڑائی میں ہزارہا مخلوق خدا اور بے شمار روپیہ ضائع ہو چکا تھا۔ اور حاصل کچھ نہ ہوا تھا۔ بلکہ رہا سہا وقار بھی جاتا رہا۔ حاکمِ وقت آخر غریب مصری فلاحین سے کہاں تک روپیہ بٹورتا؟ ادھر یورپین مارکیٹ سے اسے مزید قرضہ ملنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے اس صورت حال سے بحران پیدا ہوا اور بین الاقوامی کمیشن اسماعیل پاشا پر مسلط کر دیئے گئے۔ جن میں سے ہر ایک اسے زیادہ سے زیادہ یورپین تسلط کے ماتحت لے آیا۔ (جلد ۸)

یہی موقعہ تھا جب دوربین بنیا صفت انگریز نے اپنے قرضہ کے تحفظ کے لئے مصر میں اپنا پہلا مالیاتی کمیشن بھجوایا جس نے چھان بین کے بعد رپورٹ کی کہ ملک مصر کے تمام محاصل پر ہمارا قبضہ ہونا چاہئیے۔ تھوڑے عرصہ بعد برطانیہ اور فرانس نے ایک اور مشترکہ مالیاتی کمیشن بھجوادیا تاکہ ان دونوں ممالک کے تمسک گیروں کی تسلی کرائی جائے۔ اسی کمیشن نے سفارش کی کہ تمام ملک کے محاصل پر مشترکہ کنٹرول ہونا ضروری ہے۔ برطانوی نمائندہ ریونیو کا انچارج ہو اور فرانسی نمائندہ اخراجات پر کنٹرول کرے۔ پھر ایک تیسرا کمیشن مقرر ہوا جس نے خدیو مصر اسماعیل پاشا کی تمام ذاتی املاک پر کنٹرول کرلیا۔ اس طرح کی شاطرانہ چالوں سے حاکمِ مصر کو بے بس کر کے ملک کے اصل حاکم خود انگریز اور فرانسیسی بن گئے۔ اس گرفت سے تنگ آ کر خدیو مصر نے اپنی فوج کو اشارہ کر دیا اور بغاوت کرادی۔ جس سے تمام ''ڈبل کنٹرول'' دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بدمست سپاہیوں نے خوب ہنگامہ کیا اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کی طبیعت صاف کردی۔ سب بھاگ کر سکندریہ میں پناہ لینے چلے گئے مگر انگریز بھی بچے نہ تھے کہ اس چال کو نہ سمجھتے انہوں نے ایک طرف تو فرانس کو اکسایا کہ تم اپنا بحری بیڑا اسکندریہ بھجوادو۔ ادھر ہم اپنا بیڑا لاتے ہیں دوسری طرف سفیر ترکی لارڈ فرن (جو بعد میں ہندوستان کے وائسرائے بنے۔) انہوں نے سلطان ترکی پر دباؤ ڈالا کہ نائب سلطنت خدیو مصر نے یہ کیا لغو حرکت کی ہے؟ چنانچہ سلطان ترکی نے اسماعیل پاشا کو ایک کرخت تار بھجوایا

جس میں اسے سابق خدیو مصر کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔

اس کے بعد پھر وہی ڈبل کنٹرول جاری ہوگیا۔ جس کے سر ڈیولین ریویلین بیرنگ (بعد کے لارڈ کرومر) نگران مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن پھر امرائے مصر نے ایک فوجی کرنل احمد اعرابی کو آگے کر کے ایک نئے ہنگامے کی طرح ڈال دی۔ یہ شخص اگرچہ کسی خاص قابلیت کا مالک نہ تھا مگر جذبہء حب وطن سے ضرور معمور تھا۔ اس نے نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں چند ایک جذباتی تقاریر کیں۔ جس سے عام فوجیوں کا جذبہء حب الوطنی بھڑک اُٹھا اور احمد اعرابی کی زیر قیادت ملک میں شورش ہوگئی اس شورش میں کرنل فہمی اور کرنل عبدالعلی بھی شریک تھے۔ ہر طرف سے انحراف دیکھ کر رائج الوقت حکومت کچھ دب گئی۔ اور احمد اعرابی کے مطالبات کو تسلیم کر لیا۔ مگر اعرابی نے مزید مطالبات پیش کر دیئے اس پر گورنمنٹ نے اسے نائب وزیر جنگ بنا دیا تا کہ وہ چُپ رہے اسے کابینہ کا ممبر بنا لیا گیا۔ اور پاشا کا معزز خطاب دیا گیا مگر اسکے باوجود اعرابی پاشا نے اپنے مطالبات سے ذرا بھی انحراف نہ کیا بلکہ مزید سختی کی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۲ء میں تمام ملک میں جگہ بجگہ بلوے ہونے لگے۔ انگریزوں اور فرانسیسوں کا قتل عام ہوا۔ اس پر انہوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے بحری بیڑے سکندریہ کی بندرگاہ میں لا کھڑے کئے۔ اعرابی پاشا مصر کی فوج کو لے کر تل الکبیر کے مقام پر معرکہ آراء ہوا۔ لیکن انگریز جیت گئے۔ خود خدیو مصر بھاگ کر سکندریہ میں انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا۔ اعرابی پاشا گرفتار ہوا اور مصری عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ چنانچہ اسے سیلون میں جلاوطن کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں سے اسے ۱۹۰۱ء میں رہائی ملی اور ۲۱ ستمبر ۱۹۱۱ء کو وہ فوت ہوگیا۔

اب بظاہر مصر میں پھر امن چین نظر آنے لگا۔ مگر اندر ہی اندر انگریزوں کے خلاف جذبہ نفرت وحقارت بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف انگریزوں کے سامنے سخت پریشان کن مسئلہ سوڈان کا تھا جسے خدیو مصر اپنے زیر عنان شمار کرتا تھا۔ مگر وہاں کے باشندے اپنے آپ کو کلیتہً آزاد سمجھتے تھے۔ مصری خزانہ سوڈان پر ہر سال ۲۰ لاکھ پاؤنڈ خرچ کرتا تھا۔

سوڈان میں اگر حکومت تھی تو سید محمد احمد کی تھی۔ جو وہاں کے باشندے تھے۔ اور پنے آپ کو مہدی خیال کرتے تھے۔ اور نیکی میں ان کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا تھا۔ ان کے عقیدتمند لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ یہ خود اور ان کے ہم خیال مرید انگریزوں سے لڑائی کو فرض سمجھتے تھے۔ انگریزوں کو یہ خوف بھی تھا کہ اس خیال کو اگر قبولیت عامہ حاصل ہوئی تو نہر سویز کی حفاظت کے بہانے جو ہم یہاں جمے بیٹھے ہیں اس میں ہمارے لئے سخت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ چنانچہ انہوں نے خدیو مصر پر دباؤ ڈالا اور سوڈان پر فوج کشی کے احکام صادر کرائے۔ سر ولیم ہکس کو فوج کا اعلیٰ افسر بنا کر بھیجا گیا۔ قاہرہ سے خرطوم ۸۷۰ میل ہے۔ نہ کوئی ریل۔ نہ ٹرانسپورٹ پیدل چل کر جانا تھا تا کہ اس ''مہدی'' اور اس کے درویشوں کو سیدھا کیا جائے سفر ریگستان کا۔ موسم گرمیوں کا۔ علاقہ دشمن کا۔ لُو چلتی تھی۔ افسر اور ماتحت کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ شروع میں ہی سب کے دل مردہ ہو گئے۔ سر ولیم اور انکے نائبوں میں ابتدا

میں ہی تلخ کلامی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ اُوپر سید محمد احمد نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ اس مصری فوج کو راستے میں کچھ نہ کہنا۔ ان کو جس قدر ہو سکے جانب جنوب آنے دو۔ جب یہ سوڈان میں پہنچ جائیں گے تب انہیں آٹے دال کا بھاؤ بتائیں گے۔ مارچ میں چلے تھے اور سفر کرتے کرتے نومبر آ گیا۔ ۱۵۔ نومبر ۱۸۸۳ء کو عبید کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں مہدی کے درویشوں نے ہکس پاشا کی فوج کو بالکل تہس نہس کر دیا۔ بمشکل چند آدمی بچے جنہوں نے جا کر تباہی کی داستان سنائی۔

۱۳ برس تک پھر انگلستان کو جرأت نہ ہو سکی کہ سوڈان کا رُخ کریں۔ جنگِ عبید کے تقریباً ڈیڑھ برس بعد ۲۲۔ جون ۱۸۸۵ء کو سید محمد احمد مہدی سوڈانی انتقال فرما گئے۔ اور خرطوم محلہ اُمِ درمان میں دفن ہوئے۔

انگریزوں نے سوڈان کی فتح کے لئے جنرل گارڈن کو بھی بھجوایا اس نے خرطوم لے تو لیا مگر مہدی کے درویشوں نے اسے آخر کار مار ڈالا۔ واقعہ یوں ہوا کہ وہ کچھ فوج لیکر محصور ہو گیا تھا۔ اور مسلمانوں کے مشہور معاند اس وقت کے وزیر اعظم برطانیہ گلیڈسٹون سے اپیلیں کرتا رہا کہ جلد امداد بھجواؤ۔ مگر وہاں سے سوائے تساہل کے کچھ نہ ہوا گارڈن کے بھائی نے گلیڈسٹون سے ذاتی طور پر مل ملا کر کوشش کی تو ایک فوج ترتیب دیکر بھجوائی گئی۔ مگر وہ کارروائی بے وقت تھی گارڈن محاصرہ کی تاب نہ لا کر مغلوب ہو گیا اور مارا گیا۔......... جب گارڈن کو قتل کر کے درویش اس کا سر ایک رومال میں باندھ کر مہدی کے سامنے لے گئے تو اس نے اظہارِ ناراضگی کیا کہ تم کو قتل کرنے کے لئے کس نے کہا تھا؟ گارڈن کے قتل کے ۶ ماہ بعد مہدی بھی فوت ہو گئے۔

معرکہ ہائے مصر کے ضمن میں لارڈ کچنر کا نام ضرور آتا ہے یہ ایک انگریز افسر کا بیٹا تھا جو انگریزی فوج متعینہ مصر میں بطور کیپٹن بھرتی ہو کر آیا اور محنت کے باعث ترقی کرتا ہوا ۱۸۹۲ء میں مصری فوج کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا۔ جنگ عبید کے بعد سے سوڈان میں مہدی سوڈانی کا تسلط تھا۔ انگریزوں کو سر ولیم ہکسن کی تباہی بھولی نہ تھی۔ ان کو یہ ذلیل کن شکست ہر وقت آتش زیر پا رکھتی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اس کا بدلہ لیا جائے۔ چنانچہ اس کام کے لئے جنرل کچنر کا انتخاب ہوا۔ اس نے ایک لمبے عرصے تک تیاری کرنے کے بعد درویشوں کی سرکوبی کے لئے ایک فوج تیار کی ۔ اس وقت مہدی سوڈان کا ایک خلیفہ عثمان دِغنہ نامی مہدی کے نام پر حکومت کر رہا تھا۔ عثمان دغنہ کے دل میں انگریزوں کے لئے سوائے شدید ترین نفرت و عداوت کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ آدمی کیا تھا ایک دیو تھا۔ سر پر سوڈانیوں کی طرح بکھرے ہوئے بال۔ چھوٹی چھوٹی مگر عقابی آنکھیں۔ نہایت ہی سادہ لباس۔ ہاتھ میں شمشیر آبدار ہر وقت اپنے پیروؤں کو اکٹھا کر کے جہاد کی تلقین کرتا رہتا تھا۔ اوپر سے لارڈ کچنر کروفر سے چلے آخر کار ۲۔ ستمبر ۱۸۹۲ء کو محلہ اِم درمان کے قریب نہایت خون ریز جنگ ہوئی۔ انگریزوں نے تمام زور خرچ کر ڈالا اور کامیاب ہوئے۔ اگر چہ یہ کوئی جنگ نہ تھی کیونکہ درویشوں کے پاس پرانے زمانہ کا اسلحہ تلوار اور بھالے تھے۔ مگر انگریزوں کے پاس ہر قسم کا جدید اسلحہ رائفلیں اور توپ خانہ تھا۔ اس جنگ میں سر ونسٹن چرچل نے بھی حصہ لیا تھا اور ایک موقعہ پر بمشکل جان بچانے

میں کامیاب ہوئے تھے۔اس فتح سے انگریزوں کو بے حد خوشی ہوئی اور کچز کی خوب عزت افزائی کی گئی۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک یہی لارڈ کچز ہندوستان میں کمانڈر انچیف بھی رہا۔ یہاں سے ریٹائرڈ ہوا تو فیلڈ مارشل بنایا گیا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک مصر میں برطانوی ہائی کمشنر رہا جنگ عظیم اول میں وہ وزیر جنگ تھا۔اسی زمانہ میں زار نکولس ثانی شہنشاہ روس نے اس کو روس بلوا بھیجا تا روسی افواج کو از سر نو منظم کرنے میں امداد دے۔ ۵۔ جون ۱۹۲۶ء کو سکاپا حلو سے جو انگریزوں کا ایک مشہور و معروف بحری اڈہ ہے آرک انجبل روس کی شمالی بندرگاہ کے لئے رات کے اندھیرے میں خفیہ طور پر روانہ ہوا جرمن آبدوزیں اس کی تاک میں تھیں۔اس خیال سے کہ جرمنوں کو علم نہ ہو جائے۔ جہاز کو اکیلے ہی روانہ کر دیا گیا۔اور حفاظتی جہاز چند میل کے بعد واپس لوٹ آئے۔مگر جرمنوں کو خوب علم تھا کہ لارڈ کچز اسی جہاز میں سفر کر رہا ہے۔انہوں نے گھیرہ ڈال لیا اور کپتان سے مطالبہ کیا کہ کچز کو ہمارے حوالے کر دو۔اس نے انکار کیا جس پر جہاز کو غرق کر دیا گیا۔اور یہ مشہور زمانہ انگریز جرنل سمندر کی اتھاؤں میں غرق ہو گیا۔انہی دنوں میں لکھنو کے مشہور اخبار اودھ پنچ نے ایک نظم شائع کی تھی جس کے ایک شعر کا مطلب یہ تھا کہ اے مسلمانو! مسجد کے حوض میں ڈوب کر کیوں مرتے ہو۔ بلکہ ؎

دریا دلی کے شعبدے کچنر سے سیکھ لو

یہ تمام واقعات اس واسطے ذرا تفصیل سے لکھے ہیں کہ اس شخص کی موت میں قدرت نے ایک زبردست سبق رکھا ہے۔اور وہ یہ کہ جنگ امِ درمان کے بعد کچز نے فتح کے نشہ میں مہدی سوڈانی کی قبر کو کھدوایا اور اس کی ہڈیوں کو ہوا میں بکھیر دیا تھا۔قدرت نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ کچز کو سمندر میں غرق کیا تا حساب برابر ہو جائے۔اسی واقعہ کو علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں مہدی سوڈانی کی روح کی زبان سے یوں نظم کیا ہے ؎

گفت اے کچز اگر داری نظر
انتقامے خاکِ درویشے نگر
آسماں خاکِ ترا گورے نہ داد
مرقدے جز دَر یم شورے نہ داد

لارڈ کچز کی واقعی یہ ایک کمینہ حرکت تھی اس سے تو راجہ شیر سنگھ ہی اچھا رہا جس نے حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کی نعش کو دیکھ کر اپنا خاص دوشالہ احتراماً اُس پر ڈال دیا اور مسلمانوں کو بلوا کر حکم دیا کہ حضرت سید صاحب کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ اسلامی طریق سے دفن کیا جائے۔

مصر جنگ عظیم اوّل میں

جنگِ عظیم اول کے شروع میں انگریز مصر میں اس قدر مضبوطی سے قدم جما چکے تھے کہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انہوں

نے محض ایک اعلان کے ذریعہ ہی مصر پر اپنی ''حفاظت'' کا اعلان کر دیا۔خدیو مصر عباس حلمی پاشا کو جو اُس وقت قسطنطنیہ گیا ہوا تھا۔اس کی غیر حاضری میں ہی معزول قرار دیدیا اور اسی خاندان کے ایک اور شہزادے حسین کو بادشاہ بنادیا۔اس نے برطانوی کابینہ سے دعائیں لے کر سلطان کی بجائے اپنے لئے ''ملک'' کہلوانا پسند کیا مگر ۱۹۱۷ء میں اس کی وفات پر فواد کو بادشاہ بنایا گیا جو اپنے پیش رو کی طرح انگریزوں کا پروردہ تھا۔

جنگِ عظیم اوّل کے دوران مصری قوم بالکل خاموش رہی۔ان دنوں مصر ایک بہت بڑے فوجی کیمپ کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔یہاں سے فلسطین اور گیلی پول کے لئے مہمات چلائی جا رہی تھیں۔جنگ ختم ہوتے ہی مصری پھر بیدار ہو گئے اور ۱۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو صلح نامہ وارسائے کے صرف دو دن بعد سعد زاغلول۔عبدالعزیز فہمی اور علی شعراوی برٹش ہائی کمشنر سے ملے اور اس کو نہایت واضح اور واشگاف الفاظ میں کہدیا کہ تم لوگ فوراً مصر کو خالی کر دو۔ہم اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ اب تم مزید یہاں ایک دن بھی ٹھہرو اس نے ان کی بات نہایت تحمل اور توجہ سے سنی مگر دوسرے ہی دن ان تینوں کو گرفتار کر کے جزیرۂ مالٹا میں نظر بند کر دیا۔وفد پارٹی کے لیڈروں کو جب اس طرح گرفتار کر لیا گیا تو تمام ملک میں شور مچ گیا۔خصوصاً طلباء نے شورش کر کے عملی طور پر گورنمنٹ کی تمام مشینری کو مفلوج کر دیا۔اس کا یہ اثر ہوا کہ انگریزوں نے چپکے سے سعد زاغلول کو رہا کر کے مصر کی آزادی کا اعلان کر دیا۔مگر حسب ذیل شرائط عاید کیں۔

۱۔برطانیہ مصر میں انگریزی سلطنت کے سلسلہء مواصلات کا نگران ہوگا۔

۲۔انگلستان مصر کے دفاع کا ذمہ دار ہوگا۔

۳۔تمام غیر ملکیوں کے مفاد کی نگرانی انگلستان کیا کرے گا۔

۴۔اندرون ملک تمام اقلیتوں کے حقوق کا محافظ انگلستان ہوگا۔

۵۔سوڈان کا محافظ بھی انگلستان ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ اعلان صرف شاہ فواد کو ہی مطمئن کر سکا ہوگا۔اس سے مصریوں کے دل جل گئے مگر آہنی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ کچھ نہ کر سکے۔کچھ عرصہ بعد چند منچلے نوجوانوں نے سرلی سٹیک انگریز کمانڈر انچیف کو سرِ بازار قتل کر دیا بہت پکڑ دھکڑ ہوئی اور سخت سزائیں دی گئیں۔اس شرط کی تشریح سابق ہائی کمشنر مصر نے جو بعد میں بمبئی وسندھ کے گورنر بنے اور جن کے نام پر سکھر کا مشہور بیراج لائیڈ بیراج کہلاتا ہے یوں کی کہ:۔

''برطانوی ذرائع آمد و رفت سے صرف نہر سویز ہی مراد نہیں بلکہ وہ تمام راستے مراد ہیں۔جو ہندوستان اور آسٹریلیا کو جاتے ہیں۔نیز ایران عراق اور چین تک پہنچنے کے لئے سمندر ہوا یا زمین پر سے گزرتے ہیں اور جن سے ہمارے تجارتی اور سیاسی مفاد وابستہ ہیں۔علاوہ ازیں اس شرط میں وہ راستے بھی شامل ہیں جو ہمارے افریقی مقبوضات تک جاتے ہیں۔''

(ماہنامہ مصباح جنوری فروری ۱۹۶۱ء)

ذرّیتِ دجّال مصر میں

اس کے بعد بے شمار دفعہ آزادیٔ مصر کے لئے گفت وشنید ہوئی۔مگر ہر دفعہ معاملہ طے ہونے کی بجائے اور الجھ کررہ جاتا۔آخر کار ۱۹۳۶ء میں ایک معاہدہ قرار پایا جس کی دفعات اس قسم کی تھیں:۔

(۱) اگر مصر پر باہر سے کسی طرف سے بھی حملہ ہوتو انگریز مصر کی حفاظت کریں گے۔ایسی حالت میں مصری اپنے سلسلہء مواصلات کو کلیتہً برطانوی حکومت کے حوالہ کردیں گے۔

(۲) مصریوں نے تسلیم کیا کہ وہ نہر سویز کے علاقہ میں دس ہزار برطانوی فوج رہنے دیں گے۔ان کے علاوہ ۴۰۰ پائلٹ جو جہازوں کو نہر میں سے چلانے کے لئے ذمہ دار ہیں وہ بھی رہیں گے۔

(۳) بقیہ تمام انگریزی فوج مصر سے چلی جائیگی۔

(۴) سکندریہ کا بحری اڈہ آٹھ سال تک انگریزوں کے قبضہ میں رہے گا۔

(۵) برطانوی سفیر کو دیگر سفیروں پر تفوق حاصل رہے گا۔

(۶) مصر کو لیگ آف نیشنز کا ممبر بنادیا جائیگا۔

(۷) یہ معاہدہ بیس ۲۰ سال تک قائم رہے گا۔

صاف ظاہر ہے کہ اس معاہدہ سے آزادیٔ کامل کی تعبیر نہ نکلتی تھی۔

مصر جنگِ عظیم دوم میں

جنگِ عظیم ثانی میں بھی مصر پر عملی طور پر انگریزوں کا ہی تسلط رہا۔انہوں نے ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا اور سخت سنسر شپ قائم کردی۔سلسلہء مواصلات پراُن کا مکمل قبضہ تھا۔جرمنی اور اٹلی سے تعلقات منقطع کرلئے گئے۔مگر جنگ کی حالت یہی نہ تھی، بلکہ انگریزوں نے مصر کو بہت بڑا فوجی مرکز بنا کراُسے ہر طرح سے Base بنالیا۔بے شمار قوموں کے سیاسی لیڈر یہاں آن اکٹھے ہوئے۔

اتحادیوں کا شاید ہی کوئی ممتاز لیڈر رایسا ہو جس نے اس جنگ میں قاہرہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف نہ بخشا ہو۔قاہرہ میں بڑی بڑی معرکے کی میٹنگز ہوتی رہیں۔جن میں چرچل، چیانگ کائی شیک، روزویلٹ اور عصمت انونو وغیرھم شامل ہوتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ مصر کو صرف اسواسطے آزادی نہ دیتا تھا کہ آزادی ملنے کے ساتھ ہی نہر سویز پر سے بھی اس کا قبضہ جاتا رہے گا اور اسکے جہازوں کو بے شمار قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا لہذا اُس نے وہ تمام سیاسی ہتھکنڈے استعمال کئے جو استعماری طاقتیں ایسے موقع پر ہمیشہ استعمال کرتی ہیں۔تاکہ محکوم زیادہ سے زیادہ عرصہ تک

دبا رہے۔

جنگِ عظیم ثانی کے خاتمہ کے ساتھ ہی حکومت مصر نے ۳۶ء کے معاہدہ کو منسوخ کرنے کا مطالبہ پیش کیا ۔مگر انگریز ہر حیلے بہانے سے معاملات کو طول دیتے جاتے تھے۔ آخر کار ۱۹۴۷ء میں گفت وشنید بالکل بند ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۳ جون ۱۹۵۳ء کو مصر میں عظیم انقلاب ہوا۔ بادشاہی کا تختہ جنرل محمد نجیب نے پلٹ دیا۔ برطانیہ جن عناصر سے کام لیا کرتا تھا ان کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن جنرل نجیب نے جلد ہی اپنی جگہ جمال عبدالناصر کے لئے خالی کر دی ،جنہوں نے بہت زیادہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

مصر کے نئے سربراہ کی خواہش صرف یہ ہے کہ اُن کا ملک آزادی کے ساتھ دنیا کی طاقتوں کے پہلو بہ پہلو تعمیری اور امن کو بڑھانے والے امور میں شریک رہے۔ عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ ملک کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے جس سے قومی سرمایہ اور وقار بڑھے۔ اس کیلئے ضروری تھا کہ وہ اسوان کے مقام پر سابقہ تعمیر شدہ بند کی بجائے موجودہ طرز کا ایک نیا عظیم الشان بند تعمیر کریں جو ملکی زراعت کیلئے زیادہ مفید ثابت ہو۔ ابتداء میں تو برطانیہ اور امریکہ نے اس بند کی تعمیر میں معقول امداد دینے کی پیش کش کی مگر پھر خود بخود دستِ تعاون کھینچ لیا۔

دُنیا کو یہ سبق خود انگریزوں نے ہی دیا ہے کہ جس ملکی صنعت یا صیغہ کو خاص حفاظت دینی مقصود ہو اُسے ملک کی پارلیمنٹ کے ذریعہ ''قومی ملکیت'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مصری پارلیمنٹ نے بھی نہر سویز کو قومی ملکیت قرار دے دیا۔ یہ قانون پاس ہونا ہی تھا کہ برطانیہ اور فرانس کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جلے پاؤں کی بلّی بن کر وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اس کے متعاقب ہی جمال عبدالناصر نے اعلان کر دیا کہ آئندہ نہر سویز سے جس قدر ہمیں آمدنی ہوگی وہ تمام مصر وصول کیا کرے گا اور یہ تمام رقوم ایک علیحدہ فنڈ میں جمع کر کے اسوان کا نیا بند تعمیر ہوگا جس سے ہماری زراعت ترقی کرے گی۔ بے انتہاء بجلی پیدا ہوگی۔ ریلیں اور کارخانے بجلی سے چلا کریں گے۔ اور یوں بھی نہر کا معاہدہ ۱۹۶۸ء میں ختم ہونے والا تھا۔ بہر حال مصریوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو بار بار یقین دلایا کہ فکر نہ کرو تمہارا سرمایہ بالکل محفوظ رہے گا۔ اس کی ادائیگی ہمارے ذمہ ہے مگر ان سُود خوروں کو کیسے یقین آتا؟

چنانچہ ان دونوں طاقتوں نے اپنے غم وغصہ میں اوآخر اکتوبر ۱۹۵۶ء میں حکومت اسرائیل کو شہ دی کہ وہ مصر پر حملہ کر دے۔ چنانچہ اس نے جھٹ جزیرہ نمائے سنائی کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس پر برطانیہ اور فرانس نے مشترکہ طور پر مصر کو نوٹس دیدیا۔ کہ اگر تم نے اسرائیل سے جنگ بند نہ کی تو ہم دونوں ملک تم پر چڑھائی کر دیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ محض لڑنے کے بہانے تھے۔ چنانچہ یکم نومبر ۵۶ء کو ۳ بجکر ۴۰ منٹ پر برطانوی جیٹ بمباروں نے قاہرہ اور سکندریہ پر بمباری کی۔ وزیر خارجہ سلوِن لائڈ نے برطانوی پارلیمنٹ میں اس امر کی تردید کی کہ ہم نے حملہ کیا ہے مگر یہی وہ وقت تھا جبکہ ادھر بیان دیا جا رہا تھا اور اُدھر حملہ شروع اور آخر میں یہ بھی کہہ

دیا کہ ہمارا مقصد تو صرف نہر سویز پر قبضہ ہے۔ وزیر اعظم مسٹر ایڈن نے اعلان کیا کہ چونکہ مصر ہماری پالیسی کے خلاف چل رہا ہے اس واسطے یہ عارضی کارروائی کی جا رہی ہے۔ یہ مصر میں ''ہلکا سا پولیس ایکشن ہے''۔ ہماری فوجیں ضرورت سے زیادہ ایک دن بھی وہاں نہ ٹھہریں گی۔ حزب مخالف کے لیڈر مسٹر ہیو گیٹکل نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری حکومت نے جو مصر میں کارروائی کی ہے اس کی وجہ سے کروڑوں برطانوی باشندوں کے سر ندامت سے جھک گئے ہیں۔ ہماری حکومت کا یہ اقدام اقوام متحدہ کے منشور کے خلاف ہے۔ بشپ آف کنٹربری نے ہاؤس آف لارڈز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اس حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا کہ دنیا کی نگاہ میں برطانیہ کی یہ کارروائی ظلم پر مبنی ہے''۔ امریکہ کے آنجہانی وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس نے یونائیٹڈ نیشنز میں اسمبلی میں اقرار کیا کہ برطانیہ اور فرانس کا حملہ ایک زبردست غلطی ہے جس کو پولیس ایکشن کا نام دیا جا رہا ہے۔ برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن نے کہا کہ آج مصر کے معاملات پر بحث کرتے وقت جو ہنگامہ برٹش پارلیمنٹ میں ہوا اُس کی مثال گزشتہ ۳۰ برس میں نہیں پائی جاتی۔

برطانیہ نے غم و غصہ میں ایک ہسپتال پر بھی بم برسائے حالانکہ اس پر ریڈ کراس کا نشان ظاہر تھا۔ اس دوران میں مصر پر کیا گزری یہ ایک بہت خونچکاں داستان ہے۔ مصر کا بڑا نقصان ہوا۔ تین ہزار مصری مارے گئے۔ زیکوسلاویکیہ سے جس قدر ہوائی جہاز خریدے تھے وہ تقریباً سب کے سب تباہ ہو گئے۔

مصریوں نے برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ فوجی حملہ کا جواب یوں دیا کہ انہوں نے نہر سویز میں ۴۹ بڑی بڑی مگر پُرانی کشتیاں ٹوڑا کرکٹ اور اینٹ پتھر سے بھر کر نہر کے اندر مختلف جگہوں پر غرق کر دیں جس سے نہر اَٹ گئی اور ناقابل عبور ہو گئی۔ اس طرح عملاً نہر بند ہو گئی اور تمام دُنیا مجبور ہو گئی کہ افریقہ کے گرد گھوم کر راس امید کے رستے مشرق کی طرف جائیں۔ دو ماہ تک وہ مصیبت برداشت کرتے رہے مگر اس کے بعد تمام مغربی طاقتیں فریاد لے کر یونائیٹڈ نیشنز میں پہنچیں۔ وہاں پر آپس میں صلاح مشورے سے طے ہوا کہ مسٹر ڈاگ ہمرشول سیکرٹری جنرل خود جا کر جمال عبدالناصر سے گفتگو کریں۔ سیکرٹری جنرل نے جا کر جب درخواست کی تو مصریوں نے جواب دیا ہم تو نہر کی صفائی پر ایک پیسہ بھی نہیں لگائیں گے۔ اب انگریز اور فرانسیسی آئیں اور اپنے خرچ پر نہر صاف کرائیں۔ جب صاف ہو جائے گی تو مکمل کنٹرول ہمارا ہوگا۔ تمام رقوم ہم وصول کریں گے۔ ہماری اپنی مقرر کردہ شرح سے اجرت ادا کرنی ہوگی۔ یہ تمام شرائط مان لی گئیں۔ چھ ماہ کے عرصہ میں جا کر نہر صاف ہوئی اور معاملہ کچھ سُلجھا مصر والوں نے تمام انگریزی اور فرانسیسی بنک مصر میں بند کر دیئے اور ان دونوں قوموں کے باشندوں کو مصر سے خارج کر دیا گیا۔ انگریزی سکول بند کر دیئے گئے۔

اب نہر سویز مصر کی قومی ملکیت بن چکی ہے۔ اس واقعہ سے برطانیہ کے قومی وقار کو جو سخت صدمہ پہنچا ہے اُس کی تلافی بظاہر سخت ناممکن ہے۔ مسٹر ایڈن اس تمام مصیبت کے ذمہ دار تھے۔ اس کی پاداش میں اُن کو سیاسیات سے علیحدہ

ہونا پڑا۔اوراب وہ قعرِ گمنامی میں زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں۔

فرانس مصر کواس واسطے کمزور کرنا چاہتا تھا کہ وہ الجزائر کے مسلمانوں کی مدد نہ کر سکے ۔الجزائر وہ مقام ہے جہاں کے نڈر مجاہدین نے فرانس کی شہ رگ کو مضبوط پکڑا ہوا ہے اور وہ اب زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اُدھر تمام افریقہ میں آزادی کی زبردست لہر اُٹھی ہوئی ہے۔اور وہ دن دُور نہیں جب اس تاریک براعظم پر انشاءاللہ آزادی کا سورج اپنی پوری تابانی سے ضیاپاش ہوگا اور اجنبی اقتدار کے دھبے اُڑ جائیں گے۔

اسوان ہائی ڈیم جو اَب روسی ماہرین کی زیرِ نگرانی تعمیر ہو رہا ہے ۲۰۰ فٹ بلند پہاڑیوں کے قریب بنے گا۔یہاں سے دریائے نیل کا پاٹ تین میل ہے۔اس جگہ پر ایک زبردست تین میل لمبی جھیل بن جائے گی۔اس بندھ کے بننے سے مصر کی زراعت ۱/۳ کی نسبت سے زیادہ ہو جائے گی۔ دس ملین کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی جس سے تقریباً ہر گاؤں میں بجلی پہنچ جائے گی ۔ریل گاڑیاں کوئلے کی بجائے بجلی سے چلیں گی۔ پانی کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو جائے گا کہ جب چاہیں گے اور جس قدر چاہیں گے پانی حاصل کر سکیں گے۔

غرضیکہ جمال عبدالناصر نے اہلِ افریقہ کے لئے عموماً اور عربوں کیلئے خصوصاً امید کا ایک نیا چراغ روشن کیا ہے جو یورپین طاقتیں مل کر بھی اب بجھا نہیں سکتیں۔عربوں کی سوئی ہوئی روح اب بیدار ہو چکی ہے۔

لاشِ حریّتِ افکار کی محکوموں نے
دوشِ افرنگ پہ کس شان سے رکھوا دی ہے
خون کے قطرے جو بوئے تو اُگی کِشتِ اُمید
جس سے افرنگ کے گلزار کی بربادی ہے

(ماہنامہ مصباح مارچ ۱۹۶۱ء)

طُورِ سینا کی نئی ضِیاء باریاں

(انگریزی سے ترجمہ)

جنوری ۱۹۴۷ء میں کیلی فورنیا یونیورسٹی امریکہ نے ایک مہم جزیرہ نما عقبہ میں تحقیقات کیلئے تا زمانہ بائبل کے بعض سربستہ رازوں کو منظرِ عام پر لایا جائے۔

اِس مہم کا لیڈر ایک ۲۶ سالہ نوجوان وینڈل فلپس تھا۔ دوسرے ممبر ڈاکٹر ہنری فیلڈ تھے جو نیچرل ہسٹری میوزیم شکاگو کے ڈائرکٹر تھے۔ تیسرے ممبر بائیبلی زمانہ کے آثارِ قدیمہ کے ماہر اور السنہ قدیم کے مشہور استاد ڈاکٹر ولیم ایف آل برائٹ جان ہاپکنس یونیورسٹی کے تھے۔ چوتھے اور پانچویں ممبر ولیم بی ٹیری اور ان کی اہلیہ گلیڈیز ٹیری بطور فوٹو گرافروں کے تھے۔ چھٹے ممبر ایک انجنیئر صاحب تھے جو موٹروں دیگر آلات کے نگران تھے۔

یہ پارٹی دو موٹر لاریوں میں موجودہ زمانہ کے تمام ضروری آلات سے لیس ہو کر ۱۲ جنوری ۴۷ء کو ویرانوں کو عبور کرتے ہوئے آخر کار سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ کے باہر پہنچ گئی۔ یہ خانقاہ جبل موسیٰ کے عین دامن میں واقع ہے۔ اس جگہ پر یونانی راہبوں نے ۱۴۰۰ سال سے ایک قلعہ بندی کی صورت میں رہائش اختیار کی ہوئی ہے۔

اب آگے پارٹی کے لیڈر کی زبانی سنیئے:۔

''جس جگہ ہمارے ٹرک جا کر رُکے یقیناً وہ مقام اس جگہ سے دُور نہ ہوگا جہاں بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دس الواح لیکر پہاڑ سے اُترنے کے منتظر رہے ہوں گے۔

قاہرہ سے ہماری پارٹی کو بشپ پورفائی رَس سوئم (جو سنائی کے آرچ بشپ ہیں) نے خانقاہ میں اقامت گزین ہونے کے لئے پرمٹ اور اپنا تعارفی خط بھی دیا تھا۔

ایک بھاری بھرکم دروازہ کھُلا اور تقریباً ایک درجن نفوس ہماری طرف بڑھے۔ معاً ہمارے دلوں میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ اِن لوگوں سے بات چیت کرنے میں سخت دقّت کا سامنا ہوگا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی یونانی زبان نہ جانتا تھا۔ مگر یوں سمجھئے کہ گویا اندھیری رات میں یکا یک اُجالا پیدا ہوا جب ہم کو نہایت شستہ انگریزی میں پادری نیل صاحب (Nile) نے خوش آمدید کہا کون پادری نیل؟ وہی جو پانچ زبانوں کے ماہر نکلے! آگے چل کر یہی صاحب بطور ترجمان بہت مفید ثابت ہوئے۔

ہم نے جلد جلد ٹرکوں پر سے سامان اُتارنا شروع کیا۔ اور کئی معاون ہاتھوں نے ہماری امداد کی۔ ہمارے یہ معاون انہی پہاڑوں میں رہنے والے باشندے تھے۔ جن کو جَبِلیّہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ نسلاً بعد نسلٍ اِس خانقاہ کے ملازم چلے آتے ہیں۔

مطلع بہت صاف تھا اور رات خوب سرد تھی۔ کیونکہ سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ بحرِ قلزم کی سطح سے ۵۰۰۰ فٹ بلند ہے۔ آئندہ پانچ دنوں کے قیام میں پادری نیل صاحب ہمارے راہبر اور ہر وقت کے ساتھی بنے رہے۔ انہوں نے ہمیں گرم گرم کھانا کھلا کر آرام کے لئے بھیج دیا۔

دُنیا سے یہ الگ تھلگ خانقاہ قاہرہ اور یروشلم سے براستہ ہوائی جہاز ۲۰۰ میل کے فاصلے پر ہے اور جزیرہ نما عقبہ کے جنوب وسط میں واقع ہے۔

اگلی صبح جب ہم خانقاہ کے صدر دروازے کے شاہ نشین پر کھڑے تھے تو پادری نیل صاحب نے ہمیں بتایا کہ دُنیا کے چند مقامات میں سے یہ ایک مقام ہے جہاں ''سورج مغرب سے طلوع ہوتا ہے''۔ اور حقیقت میں یہ تھا بھی درست۔ کیونکہ یہ خانقاہ ۷۴۹۷ فٹ بلند جبلِ موسیٰ (روایتی طور پر مشہور کوہِ طُور) کے شمالی بازو کے دامن میں کچھ اس طرح واقع ہے کہ سورج کی کرنوں کو پہاڑ روک لیتا ہے اور سورج خانقاہ پر ایک مغربی بازو سے عکس فگن ہوتا ہے۔

پروفیسر ولیم آل برائٹ اس دُھن میں سرگرم تھے کہ کسی طرح وہ فلسطین، اُردن اور وادیٔ نیل میں مماثلت کا ثبوت بہم پہنچا سکیں۔ یقیناً ان کا وسیع علم اور گہرا مطالعہ بائیبلی گتھیوں پر نئی روشنی ڈال سکتا تھا۔

اپنی اس مہم میں امداد کے کیلئے ہم نے گُفتی قوم کے چند چیدہ چیدہ افراد کو ہمراہ لیا تھا۔ یہ لوگ لکسر luxor (مصر) کے آس پاس بستے ہیں اور مصر، سوڈان، فلسطین، شام اور اُردن میں ان کی خاصی توقیر ہے۔ اس وجہ سے کہ کُھدائی کے معاملہ میں یہ لوگ بڑے ماہر، محنتی اور تجربہ کار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خود ہی اپنے کام پر بڑے نازاں تھے۔ اس کے علاوہ متفرق امور میں بھی یہ ہم کو قابلِ قدر امداد دیتے تھے۔ کیونکہ یہ بڑے اچھے باورچی ہوتے ہیں اور ایسی مہموں میں خوب کام دیتے ہیں۔ مہم والوں کے ذرا سے نقصان کو بھی یہ لوگ اپنے لئے سخت بے عزتی سمجھتے ہیں۔

اِس سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مصر سے نکلنے کا راستہ بھی ہم نے متعین کر لیا اور یہ اصل قائم کی گئی کہ جس جگہ سے حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم نے بحرِ قلزم کو عبور کیا تھا وہاں پر کسی زمانہ میں نرسَل اُسے اٹا ہوا سمندر ہوا کرتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے خروج کی تاریخ ۱۵۰۰ ق۔م ہے اور جس راستہ سے آپؑ اپنی قوم کو ہمراہ لے کر چلے وہ موجودہ بحرِ قلزم کا شمالی حصّہ ہے۔

قدیم علماء نے یہ فرض کر لیا ہوا ہے کہ جس جگہ سے حضرت موسیٰؑ نے سمندر پار کیا تھا اس کی سطح خروج کے زمانے میں آج سے ۲۵ فٹ بلند تھی اور یہ علاقہ موجودہ (Bitter lakes) تلخ آب جھیلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے یہ نظریے تمام کے تمام بائیبل کے عین مطابق ہیں۔

حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کا تعاقب فرعونِ مصر کی فوج اپنے رتھوں اور گھوڑوں پر کر رہے تھے مگر آپؑ چونکہ زیادہ قابل جنرل تھے آپؑ نے اپنے گروہ کو نرسَل کے سمندر میں سے ایک شدید طوفان کی آمد سے قبل ہی پار اُتار دیا۔

خروج کے بیان کے مطابق مصریوں نے اسرائیلیوں کا تعاقب سخت دلدلی زمین میں کیا جہاں آکر اُن کے رتھ کیچڑ میں دھنس کر رہ گئے۔ تب غیر متوقع طوفان نے اُن بدبختوں کو آن گھیرا اور خدا تعالیٰ نے مصریوں کو سمندر میں غرق کر

دیا حتیٰ کہ اُن میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکا (دیکھئے خروج باب ۱۴۔ آیت ۲۷،۲۸)

''اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اُوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آ گیا اور مصری اُلٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور پانی پٹ کر آیا اور اُس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چُھوٹا۔''

اور معجزہ مکمل ہو چکا تھا۔

قدامت کے لحاظ سے یہ سرکنڈوں کا سمندر بحرِ قلزم کا ہی حصّہ ہے اور اس سے وہ تمام تضاد دور ہو جاتا ہے جو بظاہر Reed Sea اور Red Sea میں نظر آتا ہے۔

ا یعنی چھنب ہوا کرتا تھا

خانقاہ میں ایک لائبریری بھی تھی جس میں بہت سے قدیم نوشتے حفاظت سے دھرے تھے۔ اُن میں سے ایک سے ثابت ہوا کہ ملکہ ہلینا (والدہ شہنشاہ قسطنطین) ۳۴۲ء میں یہاں آئی اور اس کے حکم سے اس جگہ گرجا تعمیر کیا گیا جہاں حضرت موسیٰؑ کو جھاڑی میں آگ جلتی نظر آئی تھی اور خدا کے فرشتے نے حضرت موسیٰؑ سے بات چیت کی تھی:۔

''اور خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں اُس پر ظاہر ہوا۔ اس نے نگاہ کی اور کیا دیکھتا ہے کہ ایک جھاڑی میں آگ لگی ہوئی ہے۔ تب اُس نے کہا اے موسیٰ! اے موسیٰ!! اُس نے کہا میں حاضر ہوں۔ تب اُس نے کہا اِدھر پاس مت آ۔ اپنے پاؤں سے جوتا اُتار کیونکہ جس جگہ تو کھڑا ہے وہ مقدس زمین ہے۔''

خانقاہ کے دوسرے حصّوں کی بھی خوب سیر کی گئی اور اِسی ضمن میں ایک بہت بڑے چوبی دروازے میں سے گذر کر بازنطینی طرزِ تعمیر پر بنے ہوئے Church of Trans Figuration (کینسیہ ظہور جلالی) میں داخل ہوئے۔ یہ عمارت جو بعد میں سینٹ کیتھرائن کے نام سے موسوم ہوئی بارہ شاندار گلٹ کے ستونوں پر کھڑی ہے۔ اِس کے دروازے کی دہلیز پر یونانی زبان میں ثبت ہے:۔

''اِس مقام پر خدا نے موسیٰ سے کہا کہ مَیں تمہارے آباء کا خدا ہوں اور اسحاق کا خدا ہوں اور یعقوب کا خدا ہوں۔ مَیں ہوں جو ہوں۔ یہ خداوند کا دروازہ ہے کاش حق پرست لوگ اس میں داخل ہوں۔''

اس کے بعد پادری نیل صاحب ہم کو سینٹ جان کے گرجا گھر لے گئے۔ یہاں ہم نے جُوتے اُتار دیئے۔ کیونکہ اب جہاں ہم داخل ہونے والے تھے وہ مقدس جگہ تھی۔ ایک تنگ دروازے میں سے ہم ایک قطار بنا کر چلنے لگے اور خاموشی سے نہایت مؤدبانہ طور پر اُس مقام کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ جہاں حضرت موسیٰؑ کو جھاڑی میں آگ نظر آئی تھی۔ اِس مقام پر ہم حضرت موسیٰ کے عین نقشِ پا پر چل رہے تھے۔

اِس جگہ کے باہر ایک کیکر کا درخت تھا جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ حضرت ہارونؑ کے عصا سے پیدا ہوا تھا۔

''اور دوسرے دن جب موسیٰ شہادت کے خیمہ میں گیا تو دیکھا کہ ہارون کی لاٹھی میں جو لاوی کے خاندان کے نام کی تھی کلیاں پھوٹی ہوئی اور شگوفے کھلے ہوئے اور پکے بادام لگے ہیں۔'' (گنتی باب ۱۷۔آیت ۸ تا ۱۰)

بعض مبتدی راہبوں نے ہم میں سے ہر ایک کو اس درخت کے کچھ پتے دیئے۔ مَیں نے یہ پتے اپنی بیٹی کی بائیبل میں رکھ لئے۔

اِس عیسائی خانقاہ میں ہم ایک مسجد دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ یہ مسجد ابوعلی منصور کے حکم سے ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۶ء میں بدّو اور جبلی لوگوں کے لئے تعمیر ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کے لئے مقامِ عبادت کوئی نہ تھا۔

جیکس آف ورونا ۱۳۳۵ء میں ایک راہب گذرا ہے وہ بیان کرتا ہے کہ مسلمان امام اس مسجد کے ماذنہ سے اذان دیتے تھے کیونکہ اس زمانہ میں سینٹ کیتھرائن کی یہ خانقاہ سلطان کے مقبوضات میں سے تھی۔

اپنے قیام کے آخری روز دوپہر کے وقت ہم ۳۵۰۰ سیڑھیاں طے کر کے کوہِ طور کی چوٹی پر گئے۔ یہ سیڑھیاں ایک راہب نے پہاڑ کو تراش کر بنائی ہیں۔ راستے میں کافی بلندی پر جا کر ہم کو ایک دروازے میں سے گزرنا پڑا۔ یہاں رواج کے مطابق تمام زائر اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم یہاں ایک سرو کے درخت کے قریب ستانے کے لئے ٹھہر گئے جو ایک چشمہ کے پاس ہے۔ پاس ہی وہ جگہ ہے جہاں تورات کے بیان کے مطابق پہاڑی کوّوں نے ایلیا کو خوراک بہم پہنچائی تھی:۔

''اور تو اسی نالہ میں سے پینا اور مَیں نے کوّوں کو حکم کیا ہے کہ وہ تیری پرورش کریں۔''

(سلاطین ۱۔آیت ۴)

آخر کار دو گھنٹے کی کافی مشکل (مگر کوئی دوبھر نہ تھی) چڑھائی کے بعد ہم کوہِ طور کی چوٹی پر کھڑے تھے۔ جہاں ہم نے پانی کے چند گھونٹ پیئے اور گوند والی ٹکیاں مُنہ میں ڈالیں۔

اوپر سے بڑا عجیب نظارہ تھا۔ نیچے خلیج عقبہ اور جنوب مشرق کی طرف راس محمدؐ نظر آتی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں میں ہر چیز خوب نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔

چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ویرانے کا سا عالم تھا۔ عین اس وقت ہم کو یاد آیا کہ بالکل اسی مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ۴۰ دن اور راتیں اکیلے ہی بسر کی تھیں۔ جب خدا نے ان کو پتھر کی الواح، شریعت اور احکام عطا فرمائے تھے:۔

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ پہاڑ پر میرے پاس آ اور وہیں ٹھہر اور مَیں تجھے پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام جو مَیں نے لکھے ہیں دونگا تا کہ تو ان کو سکھائے۔''

(خروج باب ۲۴۔آیت ۱۲)

اور اس بات نے ہم کو بہت متاثر کیا۔

(ماہنامہ خالد مارچ ۱۹۵۴ء)

امان اللہ خان کا آخری سفر

گزشتہ دنوں سابق شاہِ افغانستان امان اللہ خان کا انتقال ہوگیا ہے جو بہ حیثیت ایک انسانی حادثے کے بڑا سبق آموز ہے۔ ان کی زندگی سے لوگ بہت عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ اولوالعزم شخص بگولے کی طرح اٹھا اور آندھی کی طرح چھایا اور بادِ صرصر کی طرح غائب غلّہ ہوگیا۔ دس برس کے اندر اندر قصہ ہی ختم ہوگیا۔

حسنِ اتفاق سے یہ عاجز ۲۲ جون ۱۹۲۹ء کو بمبئی میں تھا۔ اُس دن امان اللہ خان نے بمبئی سے ڈاک کے جہاز ''ملتان'' پر ایک بجے دوپہر سوار ہوکر اٹلی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس ''تاریخی ہستی'' کو جاکر خود دیکھوں۔ وقت بہت تنگ تھا اور مجھے بیلرڈ پائر کا رستہ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر جذبہء شوق کشاں کشاں وہاں لے ہی گیا۔

امان اللہ خان کئی ماہ سے بمبئی کے مشہور و معروف ہوٹل تاج محل میں (جو گیٹ وے آف انڈیا کے عین متصل واقع ہے) میں رہائش رکھتے تھے۔ عین اِسی مقام سے تقریباً ایک سال قبل اُس وقت کے وائسرائے لارڈ ارون (حال لارڈ ہیلی فیکس) نے ان کو تمام برطانوی جاہ و حشم کے ساتھ یورپین دورے پر الوداع کہی تھی۔

چند ماہ قبل امان اللہ خان افغانستان سے بھاگ کر ہندوستان میں انگریزوں کی پناہ میں آگئے ہوئے تھے۔ اُن کی رعایا نے اُن کو تخت سے محروم کر دیا تھا۔ رعایا بادشاہ کی جدید قسم کی اصلاحات سے اعلانیہ طور پر ناراض تھی۔ ادھر بادشاہ ان اصلاحات کو اپنے دور افتادہ اور پسماندہ ملک کے لئے نہایت ضروری خیال کرتا تھا۔ رعایا کے لوگ پرانی ڈگر پر چلنے کو ہی عین اسلام خیال کرتے تھے مٹھی بھر ڈاکوؤں نے کابل کے اردگرد کے علاقے میں سخت دہشت پھیلا رکھی تھی۔ سرکاری فوج اور پولیس ان کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھی اور ان کے مقابلہ میں بالکل مفلوج ہوکر رہ گئی تھی۔ یہ بات شاہ امان اللہ کے ستارہ واژگوں کی کُھلی علامت تھی۔ افغانستان کے مدبر اور تمام زیرک لوگ بدحواس ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اس قدر سمجھ نہ آئی کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ رفتہ رفتہ وہ دن بھی آیا کہ شہر کابل پر ڈاکوؤں نے قبضہ کرلیا اور خود حکومت کرنے لگے۔ وہ تو کہیے کہ قسمت کا ستارہ ابھی بالکل غروب نہ ہوا تھا۔

امان اللہ خان چُپکے سے موٹر میں کابل سے نکل کر قندھار پہنچ گئے۔ راستے میں اُن کی موٹر کا پٹرول ختم ہوگیا اور ویرانے میں کھڑے تھے کہ قسمت ایک دفعہ پھر مسکرائی۔ قندھار سے پٹرول لے کر سرکاری لاریاں وہاں پہنچ گئیں اُن سے پٹرول مل گیا اور سفر جاری رہا۔

قندھار پہنچ کر انگریز افسرانِ اعلیٰ سے رابطہ قائم کیا گیا اور درخواست کی گئی کہ ہندوستان میں پناہ گزین ہونے کی اجازت دی جائے جو بہت جلد مل گئی۔ ایک سپیشل ٹرین مہیا کر دی گئی جوان کو لے کر سکھر، فاضلکا، بٹھنڈا، دہلی، جے پور، بڑودہ، ہوتی ہوئی قلابہ سٹیشن بمبئی پر جا پڑی۔ وہاں پر تاج محل ہوٹل کی دو رولز رائس سیاہ رنگ ہاریں جن

میں گھرے پردے لگے ہوئے تھے معزول بادشاہ کو لینے کے لئے موجود تھیں۔

بمبئی میں قدرے لمبے عرصہ قیام میں امان اللہ خان شاذ ہی باہر نکلے۔ وہ تشہیر سے بچتے تھے۔ شام کو جب گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے سیر کرنے والے بیٹھے ہوتے تو کبھی کبھار اُوپر سے جھانک لیا کرتے تھے اُن کے مصائب میں ایزادی کے لئے بمبئی میں ان کے گھر لڑکی بھی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے اپنے قیامِ ہندوستان کی نسبت سے ''ہندیہ خانم'' رکھا۔

امان اللہ خان نے اپنے آباء کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک بے گناہ احمدی نعمت اللہ خان کو بمقام کابل ۳۱ اگست ۱۹۲۴ء کو سنگسار کرادیا تھا۔ چونکہ امان اللہ خان اپنے گردوپیش کے ملاّؤں سے خائف تھا۔ اس لئے ان کے کہنے پر اس معصوم شخص کو مروادیا گیا حالانکہ اگر وہ چاہتا تو اپنے قلم کی ایک ذرا سی جنبش سے اُسے بچا سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنی سلطنت کا استحکام اسی بات میں سمجھا کہ ایک کلمہ گو کو ضرور قتل کرادیا جائے تا کہ رعایا خوش ہو جائے۔

چونکہ سرزمین کابل پر ایسے واقعات پہلے بھی رونما ہو چکے تھے مگر خداوند تعالیٰ ان کو ڈھیل دے رہا تھا۔ اب اس کی غیرت جوش میں آ گئی اور ساری کسر ایک دفعہ ہی نکل گئی۔ اس سے قبل ۱۴ جولائی ۱۹۰۳ء میں امان اللہ کے والد امیر حبیب اللہ خان نے سلطنت کابل کے بہترین عالم حضرت سیّد عبداللطیف صاحب کو صرف اور محض اس وجہ سے سنگسار کرادیا تھا کہ وہ حضرت امام الزماں مسیح وقت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرید ہو گئے تھے۔ یہ وہ بزرگ ہستی تھی جو امیرانِ کابل کے سروں پر تاج پہنایا کرتے تھے۔ اِسی سے ان کی عظمت کا پتہ چل سکتا ہے۔ آپ کی تمام املاک وغیرہ بحق سرکار ضبط کر لی گئیں اور بیوی بچوں کو زنجیریں پہنا کر ہرات کی طرف ایک قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ بڑی اذیتیں دی گئیں۔ حالانکہ ان بے چارے معصوموں کا کیا قصور تھا۔

آخر کار جب کُھلے دربار میں مباحثہ کروایا گیا تو عُلمائے کابل لاجواب ہو گئے۔ مگر انہوں نے متفقہ طور پر امیر کی خدمت میں رپورٹ پیش کی کہ اس کے عقائد سخت ملحدانہ ہیں اور یہ شخص واجب القتل ہے۔ اِس محضر نامہ پر امیر نے مُہر تصدیق لگادی۔ آخر جب سیّد صاحب کو زمین میں گاڑ دیا گیا تو اس وقت امیر نے خود جا کر اُن سے کہا کہ اب بھی اگر احمدیت کا انکار کر دو تو میں بچالیتا ہوں۔ مگر سیّد صاحب نے نہایت جوانمردی سے جواب دیا کہ میں جس چیز کو حق خیال کرتا ہوں اب اس کی تکذیب کیونکر کردوں؟

سیّد عبداللطیف صاحب جن دنوں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صحبت میں قادیان میں اقامت رکھتے تھے ان کو پے در پے متواتر الہامات ہوتے رہے کہ سرزمین کابل اُن کے خون کا مطالبہ کرتی ہے جو انہوں نے وقت آنے پر پیش کر دیا۔

اِس واقعہ سے بھی کچھ عرصہ قبل سیّد صاحب موصوف کے ایک شاگرد عبدالرحمن خان کو اُس وقت کے امیر کابل عبدالرحمن نے بوجہ احمدی ہونے کے تکیہ مُنہ پر رکھ کر سانس بند کر کے مروادیا تھا۔

اب خدا تعالیٰ کی قہری تجلّی کا وقت قریب آ رہا تھا اور کابل پر خدا تعالیٰ کا قہر نازل ہونے والا تھا۔ امیر حبیب اللہ خان کو یہ سزا ملی کہ ۱۹۱۹ء میں جلال آباد کے قریب جبکہ وہ اپنی شکار گاہ کے اندر سویا ہوا تھا، پہرے لگے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے اسے پستول سے ہلاک کر دیا اور قاتل بھی گرفتار نہ ہوا۔ اب امان اللہ خان کو اپنے ظلم کے پودے کا تلخ پھل ملنا تھا جو اُن کے تخت سے اُتارے جانے کی صورت میں ملا۔

اب بقیہ چشم دید واقعہ سُنیئے :۔ ڈاک کے جہاز نے پہلی سیٹی دی تو سنٹرل ہال سے دو اشخاص برآمد ہوئے جو تمام نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ دونوں کے چہرے اُترے ہوئے تھے اور مایوسی کے مجسمے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ دونوں سابق شاہانِ افغانستان امان اللہ خان اور عنایت اللہ خان تھے۔ امان اللہ خان نے بوقتِ فرار اپنے برادرِ کلاں عنایت اللہ خان کے حق میں تختِ کابل سے دست برداری لکھ دی تھی مگر بدقسمتی نے نئے بادشاہ کو بھی نہ چھوڑا اور وہ صرف تین دن تک (وہ بھی محض برائے نام طور پر سخت افراتفری کے ایام میں) حکمران رہ سکا۔ چاروں طرف سے حالات سے مجبور ہو کر آخر عنایت اللہ خان نے برٹش سفیر سر فرانسس ہمفریز سے التجا کی کہ ان کی اور ان کے اہل وعیال کی جان بچائی جائے انہوں نے پشاور سے فوراً دو ہوائی جہاز منگوا کر ان کو پشاور امن سے پہنچا دیا۔ وہاں سے وہ بھی بمبئی چلے گئے[1] جہاں ان کے ہاں بھی لڑکی تولد ہوئی۔

دونوں باہر پلیٹ فارم پر کھڑے تھے کہ ڈاک یارڈ کے کسی افسر نے لوہے کے جنگلے میں ایک دروازہ کھول دیا جو ہجوم دُور سے نظارہ کر رہا تھا وہ اندر آ گیا۔ مَیں بھی بھیڑ کو چیرتا ہوا امان اللہ خان کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ افسوس کہ میرے پاس اس وقت کیمرہ نہ تھا اور نہ وہ نظارہ فوٹو کھینچنے کے قابل تھا۔ اس وقت اُن کی حالت سخت قابلِ رحم تھی۔ اُن دونوں کی سُوجی ہوئی آنکھوں سے یہ صاف عیاں تھا کہ وہ دونوں سخت روتے رہے ہیں۔ آخری مصافحہ کرنے کے بعد امان اللہ خان آہستہ آہستہ جہاز کی سیڑھی پر چڑھنے لگے اور پریس کے کیمروں نے ان کے فوٹو اتارنے شروع کئے جو شام کو اخبارات میں شائع ہو گئے تھے۔ اُوپر جا کر وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح جہاز کے جنگلا پر ٹیک لگا کر حسرت سے نیچے دیکھنے لگے۔ ان کا بڑا بیٹا ہدایت اللہ خان بھی ان کے ہمراہ تھا۔ ملکہ ثریا چونکہ حالتِ زچگی میں تھی ان کو صبح سویرے ہی جہاز پر پہنچا دیا گیا تھا۔

اُس وقت کا منظر عجیب منظر تھا۔ قدرت کی نیرنگی تھی کہ کبھی وہ بھی دن تھے کہ پورے شاہانہ وقار سے فیلڈ مارشل کی وردی میں ملبوس امان اللہ خان وزیروں سمیت نائب السلطنتِ ہند اور بڑے بڑے عمائدین حکومتِ ہند کے جھرمٹ میں یورپ کو روانہ ہوئے تھے اور آج اسی انگریزی سلطنت کا ایک ادنیٰ کارکن بھی مشایعت کے لئے موجود نہ تھا۔

میرے والد مولوی نعمت اللہ خان صاحب گوہر بی۔ اے نے ۱۹۲۴ء میں نعمت اللہ خان شہید کے متعلق چند

[1] کچھ دنوں بعد ایران چلے گئے تھے۔

اشعار فارسی میں لکھے تھے ان میں ایک تو پیشگوئی بن کر ظاہر ہو رہا تھا

که اماں یابد ستمگر بد شعار
تا به کے ایں فرّ و ایں زور آوری

جب جہاز چلنے کے قریب تھا تو ایک مسلمان نوجوان نے چند خلاصیوں کو اکٹھا کر لیا اور نعرہ لگا دیا امان اللہ خان ''زندہ باد'' صاف ظاہر ہے کہ اس کا کوئی محل نہ تھا، سابق شاہ تو پریشان ہو گئے، دوسرے مسافر (جن میں سے سر فیروز سٹھنا مشہور پارسی لیڈر اور بینکر مجھے ابھی تک خوب یاد ہیں) زیرِ لب مسکرائے۔

اب جہاز کی سیڑھی علیحدہ کر دی گئی اور تھوڑی دیر بعد جہاز نے تیسری سیٹی دی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ کافی دیر تک میں سابق بادشاہ کی شکل کو دیکھتا رہا۔ مگر یکا یک جہاز نے چکر کاٹا اور رُخ بدل گیا۔

انہی دنوں دہلی کے اخبار ''تیج'' میں امان اللہ خان کے متعلق حسب ذیل دو شعر شائع ہوئے تھے

یہ حال ہے جہاں کے نشیب و فراز کا
حاصل ہے تخت کی جگہ تختہ جہاز کا
اٹلی میں جا کے ہوں گے امان اللہ خان مقیم
در پیش ہے سفر رہِ دور و دراز کا

اب چونکہ مرحوم کا تعلق خدا تعالیٰ سے ہے۔ لہذا ہم بھی اس قصہ کو ختم کرتے ہیں۔

فاعتبروا یا اُولِی الابصار

(ماہنامہ خالد جون ۱۹۶۰ء)

ایک اہم ادبی و تاریخی دستاویز

"شکریۂ یورپ"

آغا حشر کاشمیری

آپ کے بزرگ انقلاب زمانہ سے کشمیر سے امرتسر آئے تھے۔ شالوں کی تجارت کرتے تھے۔ پھر کسی وجہ سے بنارس چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

آغا صاحب ۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ بنارس میں انکے والد نے حسب دستورِ زمانہ ان کو عربی اور فارسی کی تعلیم دلوائی۔ مگر اُن کی چلبلی طبیعت اُدھر نہ لگی۔ والدین ان کو مولوی بنانا چاہتے تھے اور یہ مُلّا ئیت سے متنفر تھے۔ آخر کار گھر سے بھاگ نکلے اور بمبئی پہنچے۔ وہاں پر پارسیوں کا تھیئٹر دیکھا۔ کہ سب اس پر غش ہیں تو آغا صاحب نے تھیئٹر کے لئے ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے۔ اُدھر چونکہ طبیعت خوب راغب تھی خوب چمکے۔ گو اس وقت بمبئی میں اس وقت اور بھی کئی مستند اساتذہ ڈرامہ نویس تھے۔ مگر ان کے سامنے سب گرد ہو گئے۔

جوانی کے دوستوں میں مولانا شبلی۔ ابونصر آہ، مولانا ابوالکلام اور حکیم فقیر محمد چشتی نظامی لاہور کے مشہور حکیم تھے۔

اس دور میں ڈرامے لکھنے۔ شراب نوشی میں غرق رہنے کے سوا کچھ یاد نہ تھا۔ نماز روزہ کو سراسر بُھلا دیا ہوا تھا۔ تاہم دل میں دینی حرارت بہت موجود تھی۔ چونکہ اسی زمانہ کے لگ بھگ آریہ سماج کا فرقہ ہندوؤں میں نیا نیا جاری ہوا تھا۔ لہٰذا آغا صاحب نے بھی حمیّتِ دینی سے سرشار ہو کر آریوں اور عیسائیوں سے خوب گرما گرم مباحثے کئے جو خدا کے فضل سے کامیاب رہے۔

دہلی کے ایک حافظِ قرآن بدقسمتی سے تثلیث کی دل دل میں پھنس گئے (خاکسار نے بھی انہیں دیکھا ہے) فوارہ پر اکثر شام کو ان کا مناظرہ کسی نہ کسی فرقہ سے ضرور ہوتا۔ سفید برّاق لباس سفید داڑھی۔ پھر اہل زبان۔ وہ عیسائیت کے حق میں اور اسلام کے خلاف زہر اُگلتے۔ اُن کا مقابلہ ماسٹر محمد حسن آسانؔ۔ مولوی عمر دین اور آغا صاحب کیا کرتے۔ اور حق یہی ہے کہ اس کا منہ بند کرا دیتے۔

ایک دفعہ بمبئی میں پادری احمد مسیح دہلوی گئے۔ کسی نے آغا صاحب کو بھی خبر کر دی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میرا نام پادری کو ہرگز نہ بتانا۔ مگر جس وقت آغا صاحب نے تقریر شروع کی وہ جھٹ پہچان گئے اور کہا

''............ارے کسی مناظر کو میرے سامنے لاتے۔اس بھانڈ کو کیوں لے آئے؟''

آغا صاحب نے جواب دیا:۔

''پادری صاحب! کسی بھلے مانس کے ہاں اگر کتا گھس آئے تو وہ خود اٹھ کر اسے نہیں دھتکارتا۔ بلکہ کسی نوکر کو کہہ دیتا ہے کہ اسے باہر نکال باہر کرو۔ پھر تمہارے مقابلے میں کسی مولوی کی کیا ضرورت ہے۔''

وہ چیخ کر بولا:۔''یہ مجلس مناظرہ ہے یا بھانڈوں کی منڈی؟''

آغا صاحب نے چمک کر جواب دیا کہ''بھانڈوں کی ہی منڈی سہی مگر چیت خورے تم ہو۔''

پادری صاحب:۔''ارے تو تو تھیئٹر کا نچیا ہے تجھ سے کون زبان لڑائے؟''

آغا صاحب:۔''اب میں تمہیں تھیئٹر میں نچاؤں گا''

غرضیکہ انہوں نے مارے پھبتیوں کے اسے اُلو کر دیا۔اور وہ مناظرے سے ہی منکر ہو گیا۔

آپ کے بے شمار ڈرامے بازار میں بکتے ہیں۔یہودی کی لڑکی۔صید ہوس وغیرہ اسی لئے آپ کو انڈین شکسپیئر کہتے ہیں۔نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

اک لطف کی نگہ ہے علاجِ شکست دل
جُڑ جاتا ہے یہ آئنہ سو بار ٹوٹ کے
دیکھا فریب، رہزنِ دنیا و دیں کہ حشر
یوں لُٹ کے خوش ہے جیسا کہ آیا ہے لُوٹ کے

☆☆☆

جہاں میں کشمکشِ جُہد کا ہے نام حیات
یقینِ مسئلہ جبرو اختیار نہ کر

☆☆☆

بے مہر التماسِ تمنا پہ ہنس پڑا
کتنے خجل ہوئے نگہِ التجا کے بعد
لب سی دیئے ہیں خوف شکستِ اُمید نے
کس سے کرینگے تیرا گلہ اب خدا کے بعد
سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

تسکیں کے ساتھ عمرِ خضر بھی تو دیجئے
کیونکر جئیں گے وعدہء صبر آزما کے بعد

وہ زمزمے جو روح کو کرتے ہیں مست حشر
پھر سن رہے ہیں عُرفی رنگیں نوا کے بعد

آخری زمانے کا ایک شعر ہے کہ بیمار تھے۔ ان کی محبوبہ ممتاز بیگم امرتسر والی پاس بیٹھی تھی۔ اُسے مخاطب کر کے کہنے لگے کہ ہمارے بعد یاد تو کیا کرو گی۔ وہ غمگین سی ہو گئی۔ اُس نے کہا۔ آپ بہت یاد آیا کریں گے۔۔ بولے

شہیدِ عشق کے ماتم میں چشمِ ناز پُرنم ہو
مبارک اسکا مرنا جسکے مرنے کا تمہیں غم ہو

(رسالہ لاہور ۲۸ راگست ۱۹۷۷ء)

شکریۂ یورپ

نظم جو ہندوستان کے مشہور انشاء پرداز، ڈراما نویس جناب آغا محمد شاہ حشؔر کاشمیری نے حسب ارشاد جناب حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی تلمیذ حازق الملک دہلوی انجمن حمایت اسلام کے لئے لکھ کر اٹھائیسویں سالانہ جلسہ میں پڑھی۔ باخذِ جملہ حقوق مینجر مرغوب ایجنسی لاہور نے یونین سٹیم پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کی۔ بارِاول قیمت ا (صفحہ ۲)

تمہید

(از قلم خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی)

۷۸۶ ھُوَالکُل یَا مُعِیْنُ

کشمیری آغا حشر نے شکریۂ یورپ کے نام سے جو نظم لکھی۔ وہ شاعرانہ تخیل اور فکرِ ذہن کی احسان مند نہیں ہے۔ اس کو محض نظم کی حیثیت سے سننا اور پڑھنا ظلم ہے کیونکہ اس میں جو کچھ ہے وہ مسلمانان عالم کے اضطراب درونی کا اظہار ہے۔

آغا حشؔر۔ میرے ہندوستان کے اُردو زبان کے، پرانی جان پہچان والے ہیں یہ وہی ہیں جن کو خدا نے اس صدی کا بے مثل ڈرامہ نویس بنا کر بھیجا۔

یورپ اپنے شکسپیئر پر فخر کرتا ہے۔ جو بیکن کا گراموفون ریکارڈ تھا۔ تو ہندوستان کو آغا حشر پر ناز ہے۔ جس کی کار رگداز طبیعت کسی بیکن کی رازدارانہ اعانت کی زیر بار نہیں۔ کہا جاتا ہے۔ اسلامی سٹیج پر آغا کا یہ پہلا پارٹ ہے۔ اگر پہلا وار ہے تو واقعی بھرپور ہے۔ نظم کے تیور۔ الفاظ کی بندش نرالی اور انوکھی روش سب گواہ ہیں کہ یہ نظم قیامت ہے یا قُربِ قیامت کی نشانی۔

یورپ کو اگر ایشیا کے ستانے، مسلمانوں کے ٹھکرانے میں مزا آتا ہے تو ہم کو آغا حشؔر کے اس طمانچہ سے لطف حاصل کرنا چاہیئے جو رخسارِ سفید پر دستِ سیاہ سے مارا گیا ہے۔ مگر ایسا نہ ہو کہ (صفحہ ۳) جنابِ مسیح کے پیرو انجیل کے قول پر عمل کر کے دوسرا رخسار بھی سامنے کر دیں۔ اور اس شاعرانہ شکریہ کے نازک ہاتھ کے بدلے کسی وحشی کو ہستانی کا ہاتھ سامنے آ جائے۔

آغا حشر نے اُردو ڈراموں کے ذریعہ ہندوستان اور اردو کی اتنی بڑی خدمت کی ہے۔ وہ ایک ایسی چلبلی، البیلی مگر فلسفیانہ طبیعت لے کر آئے ہیں جس کی داد نیم بیدار ملک سے ملنی دشوار ہے۔ ذرا خدا لگتی کہنا۔ اور حشؔر کی اس نظم کو دیکھنا۔ لفظوں اور معانی کے لشکر نا آشنا میدانوں میں اس شان سے چڑھ کر آئے ہیں۔ طبع مسلم کے کمانڈر نے کیسی ہوش رُبا مورچہ بندی کی ہے۔

شکسپیئر کو قبر کے سٹیج سے بلانا۔ ایشیا کے محشرستان میں صُور کی آواز سُنے۔ مقتولین کی کفن کشائی دیکھے۔

جو مسلمان دم توڑ رہا تھا۔ موت کی آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس کو عیسائی کی قاتل، بے رحم ٹھوکر کی جگہ جلا دیا۔ زہر کا گھونٹ آب حیات بن گیا۔ بجھی ہوئی راکھ کو ٹھنڈا اور مَلیا میٹ کرنے کی ایک چنگاری نمودار کردی۔

حشر کے ایشیائی دل نے اسی واسطے جفاپیشہ یورپ کا احسان مانا ہے، شکریہ ادا کیا ہے کہ۔ نہ تو ایسا کرتا نہ ہماری بیداری واحساس کی تیغ میانسے کھینچتی۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی احرار اس لطیف و پُر معنی نظم میں اپنے درد کی دوا نہیں تو تیمار داری کی سراپا تسلی ادائیں تو بہت سی پائیں گے اور جنابِ حشر سے تقاضا کیا جائے گا کہ وہ اسی قسم کی گرجتی برستی نظمیں اور لکھیں۔ تاکہ دلوں کی خشک سالیاں دور ہوں۔

(صفحہ۴) اس شکریہ کے اور تھینکس کا جواب شائستہ اور مہذب یورپ کی طرف سے بتقاضائے تہذیب ضرور ہونا چاہیئے۔ میں نہیں جانتا کہ قصوروار یورپ کیونکر ایشیا سے آنکھ سامنے کرکے اس ''تھینک یو'' کے جواب میں ''ڈونٹ مینشن پلیز''۔ کہہ سکے گا۔

نظم شکریۂ یورپ کا یوں تو ہر مصرعہ کوہِ آتش فشاں ہے۔ مگر آخر کی دعا نہایت موثر اور آدمی کے خاکستانی پیکر میں ہلچل ڈالنے والی ہے۔ جس کا جواب اُفقِ محفوظ پر ایک آنکھ کو یہ منقوش نظر آیا:

جناب آغا۔ اور سب مسلمانوں کو اطلاع دو اس کو یاد رکھیں:۔

سلام'' قولاً من رَّبٍ رَّحیم

یعنی رحمت والا پروردگار سلامتی کا قول دے چکا ہے۔ تو پھر مسلم حق پرست کیوں ہراساں ہوتا ہے۔ جب تک حق ہے حقدار سلامت رہے گا۔

حسن نظامی | از مکان علی میاں تاجر کلاہ انارکلی لاہور | (۲۱ مارچ ۱۹۱۳ء)

شکریۂ یورپ

صفحہ (۵)

مدتوں سے نغمہء توحید محوِ خواب تھا
سازِ ہستیء مسلمان تشنہء مضراب تھا
پیکر احساس خوابیدہ روحِ درد تھی
شعلہء ریزیء نوا ہائے اخوت سرد تھی
کر چکا تھا اپنی ہستی مسلم پر ہوش گم
گرمِ ہنگامہ تھے سب یہ محشرِ خاموش گم

(صفحہ ۶)

ماضیِ رنگیں تماشا، حیرتیء حال تھا
روزگارِ جلوہ زا کے لب پہ کیف الحال تھا
آمدورفتِ نفس لاتی تھی پیغامِ حیات
ورنہ نذرِ خود فراموش تھا ناکامِ حیات
چشمِ بینا حیرت طفلانہ کا گہوارہ تھی
صرفِ تعمیر تحیّر، طاقت نظارہ تھی
نغمہ سنج قدس چپ تھا گلشنِ تکبیر میں
بند تھا شور انا المسلم لب تقریر میں
مدفن صد جلوہء آشوب زا آیئنہ بود
یک جہاں بیقراری دم بخود در سینہ بود
وہ پیام آخری اسلام جس کا نام تھا
وہ ظہورِ حق کہ جو پروردہء الہام تھا

(صفحہ ۷)

وہ تجلّی حقیقت جو ضلالت سوز تھی
گرمیء قلبِ محمدؐ سے تپش اندوز تھی
روشنی دنیا کو دی جس مہر عالمتاب نے

رنگ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقتِ انساں کو بینا کر دیا
سنگریزے کو جلا دے کر نگینہ کر دیا
شعلے پیدا کر دیے خاکسترِ افسردہ میں
زندگی کی لہر دوڑا دی حیاتِ مردہ میں

(صفحہ ۸)

شورشِ ہنگامہ آرا، آب و گِل میں ڈال دی
شور بادل کا تڑپ بجلی کی دل میں ڈال دی
ایک ہلچل پڑ گئی جذباتِ زنگ آلود میں
آگ سی گویا لگا دی ،تودہء بارود میں
بارہا نالید و گفت اے قومِ ما بیدار شو
حصّہ خود از حریفاں گیر و گرم کار شو
پُر ز غوغا شُد جہاں شورم زہفت اختر گذشت
پنبہ در گوشی چیرا؟ برخیز ،کآب ازسر گذشت
مایہء صد آفت ہست ایں گوش ناشنوائے تو
ہوش کن زِ امروز گردد خوار تر فردائے تو
شرم کن محوِ ادائے کُفر ساماں کردہٖ
آں دل و جانے کہ اوّل نذرِ قرآں کردہٖ

ایکہ فطرت زم و ہمت ہمچو آہن داشتی
قطرہ بودی مگر طوفان بدامن داشتی
پُر کن از صہبائے دوشیں ساغرِ ایام را
باز انگِ جلوہ دِہ! از صبح ماضی شام را

(صفحہ ۹)

صرف نسیان ہیبتِ غرناطہ و بغداد شد
باز بر خواں آں سبق کور خُلق! از یاد شد

سطوتِ فاروقی بن ،شیوۂ حیدر بگیر
تاج از کسریٰ سنان و باج از قیصر بگیر
حال استقبال ہر دو حاصل تدبیر تُست
ہاں بجہد آمادہ شود راست تُو تعمیر تُست
ہاں چھڑک پیشانی ظلمت پہ افشانِ سحر
ٹانک دے دامانِ شب میں پھر گریبانِ سحر
بہرہ ور کر دل کو سوزِ احمدِ بے میم سے
جگمگا دے بزمِ جاں کو شمعِ ابراہیم سے
اپنی ہستی نذر دے ملّت کی قربان گاہ کو
زندہ کر دنیا میں آئینِ خلیل اللہ کو

(صفحہ۱۰)

ڈال دے شورِ نوا معمورہء ظلمات میں
دوڑ جا آہنگ بن کر سازِ موجودات میں
ملک کو بھر دے سُرورِ آسماں پرواز سے
گرم کردے رُوحِ مستی شعلۂ آواز سے
حُسنِ آرائش سے زینتِ عالم امکاں کر دے
خلعتِ تجدید آئین کُہن ساماں کر دے
کلیاتِ دہر کی اک شرح نو تحریر کر
نظمِ ہستی کی نئے الفاظ میں تفسیر کر
طرحِ نَو انداز و بنیاد جہاں از سر فگن
شعلہ در وپیراہنی آتش بہ خشک و تر فگن
تیری لب بندی سبق آموز گویائی ہوئی
طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی

(صفحہ۱۱)

آج اُن ذرّوں کو ہی ناز اپنی تابانی پہ ہے
تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے

منتظر نظارے ہیں چشمِ خمار آلود کھول
اُٹھ ! کلیدِ فتح بن قفلِ درِ مقصود کھول

☆☆☆

اے خوشا غفلت ! جو ممنونِ اثر کچھ بھی نہیں
کان نے سب کچھ سنا دل کو خبر کچھ بھی نہیں
گو صدائے ہمت اقرا تا بگوش آتی رہی
نالہ بن کر پیہم آواز سروش آتی رہی
پھر بھی ننگِ زندگی آسودۂ خواری رہا
سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا
جب تغافل اپنا شیوۂ خفتہ قسمت نے کیا
اورہی سامانِ بیداری مشیّت نے کیا

(صفحہ۱۲)

دفعتہً از جلوہء عیسیٰ اُفق تابندہ شُد
قُم باذِنی گفت مغرب رُوحِ مشرق زندہ باد
(یہ بند ضبط کیا گیا تھا)

اے زمینِ یورپ اے مقراضِ پیراہنِ نواز
اے حریف ایشیا اے شعلہء خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیاد افگنی کاشانہ ہے
تیرے دم سے دنیا ساری آج ماتم خانہ ہے
اشکِ حسرت زا سے چشمِ حریت نمناک ہے
خونچکاں رُودادِ اقوامِ گریباں چاک ہے
صرف تصنیفِ ستم ہے فلسفہ رانی تیری
آدمیت سوز ہے تہذیب حیوانی تیری
عظمتِ دیرینہ نالاں ہے تیری برتاوٗ سے
دُھل گیا حُسنِ قدامت خون کے چھڑکاوٗ سے

(صفحہ۱۳)

جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سُونا کر دیا
جنّتِ دُنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا
اُٹھ رہا ہے شورِ غم خاکسترِ پامال سے
کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے
بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بُلبلے
گرچہ اک دُنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے
امتِ خیر الوریٰ لیکن تیری ممنون ہے
کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ ملت کھل گئی
چوٹ کھا کر بھر گیا دل لذّتِ ایثار سے
جلوے جاگے شیشۂ شکستہ کی جھنکار سے

(صفحہ ۱۴)

یک بیک خونِ تن بے جاں میں ہیجاں آ گیا
قطرہ دریا بن گیا دریا میں طوفان آ گیا
چونک اُٹھی روحِ اخوت ایک بادل خستہ ہوئے
پتیاں گل بن گئیں گل مل کے گلدستہ ہوئے
ہو گئیں بکھری ہوئی اینٹیں بہم تعمیر کی
مل گئی ہر ایک کڑی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی
بُت شکن وحدت پرست اک جسم اک جاں ہو گئے
غُل ہوا دنیا میں پھر کافر مسلمان ہو گئے
از کرم بپذیر یا رب جوش بے اندازہ را
تا قیامت زندہ دار ایں زندگی تازہ را
آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے

(صفحہ ۱۵)

اے دعا ہاں عرض کر عرشِ الٰہی تھام کے
اے خدا رُخ پھیر دے اس گردشِ ایام کے
صلح تھی کل جن سے اب وہ برسرِ پیکار ہیں
وقت اور تقدیر دونوں درپے آزار ہیں
ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزشِ غم کیلئے
کررہے ہیں زخمِ دل فریاد مرہم کے لئے
رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن تیرے محبوبؐ کی امت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

(حشرؔ)

(رسالہ لاہور ۲۸ راگست ۱۹۷۷ء)

برطانوی آئین کی ایک دلچسپ روایت

رسالہ ''خالد'' بابت ماہ جنوری، فروری ۱۹۸۲ء میں چوہدری کریم الدین صاحب نے انگلستان کے آئین پر بہت ہی اختصار سے تبصرہ کیا ہے مگر اصل چیز تشنۂ تکمیل رہ گئی ہے۔ اُنہوں نے بتایا ہے کہ انگلستان میں بادشاہ (یا ملکہ) کی حیثیت محض ایک سربراہ کی ہے تمام اختیارات وزیر اعظم اور دارالعوام (House of commons) کے ہیں۔ بیشک دارالامراء بھی موجود ہے مگر وہ بھی عوام کے نمائندوں کے پاس کردہ بلوں کو رد نہیں کر سکتے۔ عام مقولہ ہے کہ The king can do no wrong یعنی بادشاہ ہر الزام سے بری ہے۔ مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ کیوں بادشاہ سے تمام اختیارات چھین لئے گئے ہیں اور یہ کب واقع ہوا؟

اِس کا پتہ لگانے کے لئے ہم کو آج سے ۳۳۳ برس پیچھے جانا پڑے گا جب انگلستان میں بادشاہ چارلس اوّل حکمران تھا۔

ویسے تو چارلس بڑا معقول اور شریف آدمی تھا۔ اچھا لکھا پڑھا تھا مگر اُس نے اپنی پارلی منٹ کے مشوروں پر کبھی بھی عمل نہ کیا۔ پارلی منٹ کو صرف اُس وقت طلب کرتا جب اُسے روپے کی ضرورت ہوتی یا نئے ٹیکس عائد کرنے ہوتے۔ اس کے بعد پارلی منٹ برخاست ہو جاتی۔ تیسری دفعہ جو پارلی منٹ آئی اُسے بجٹ وغیرہ کی منظوری کے بعد ۱۱ سال تک مطلق نہیں پُوچھا۔

بیدار مغز سمجھدار لوگوں نے کئی دفعہ بادشاہ سے زبانی بھی اور تحریری بھی درخواستیں کیں کہ حضور اپنے غلاموں کو امورِ سلطنت میں مشورہ کے لئے طلب فرمائیں مگر اُس نے بے رُخی کی۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں بادشاہ سے کدورت پیدا ہونے لگی۔ ایک دن بادشاہ کو بتایا گیا کہ آج پارلی منٹ میں آپ کے خلاف تقاریر ہوں گی۔ بادشاہ عین اجلاس کے وقت ایک دستہ فوج کا لیکر گیا اور سیدھا ہاؤس آف کامنز میں گھس گیا۔ سپیکر کو حکم دیا کہ فلاں فلاں پانچ ممبران کہاں ہیں؟ اُن لوگوں کو بھی علم ہو گیا تھا کہ بادشاہ ہمیں گرفتار کرنے آ رہا ہے وہ پہلے ہی بھاگ کر روپوش ہو گئے تھے سپیکر جس کا نام Lenthall تھا نہایت ادب سے کرسی صدارت سے اُٹھا اور بادشاہ کے قدموں میں سر جُھکا کر کہنے لگا کہ:۔

''Sir The birds have flown away.''

حضور! وہ پرندے تو اُڑ گئے۔ بادشاہ غم وغصہ سے واپس چلا گیا۔

اُس دن سے انگلستان میں رواج ہے کہ جس وقت پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہو بادشاہ دارالعوام میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہ رسم اب بھی دُہرائی جاتی ہے یعنی جب بادشاہ/ملکہ نے دارالعوام اور دارالامراء کو خطاب کرنا ہوتا ہے تو بادشاہ کا ملازم آتا ہے تو دارالعوام کے دروازہ کو تالا لگا دیتے ہیں۔ وہ تین دفعہ دستک دیتا ہے تو پھر کھولتے ہیں۔ اس ایلچی کو Black Rod کہتے ہیں۔

اب بادشاہ اور اُس کے مخالفین میں ٹھن گئی۔مخالفین کے سرکردہ آلیور کرامویل (Oliver Cromwell) اور اُس کا ایک قریبی عزیز جو مشہور زمیندار تھا جان ہمپڈن (John Hampden) تھے۔قصہ مختصر انگلستان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جو ۱۶۴۲ء سے ۱۶۴۹ء تک جاری رہی۔

شروع میں بادشاہ اور اُس کے حامی امراء کا پلہ خوب بھاری رہا مگر بادشاہ کے سپاہی دبنے لگے اور ساتھ ہی روپیہ پیسہ ختم ہوگیا تو ملکہ ہنریٹا (Henretta) جو فرانس کے بادشاہ کی بیٹی تھی انگلستان کے شاہی جواہرات، تاج برطانیہ اور دیگر قیمتی نوادرات کو فرانس اور ہالینڈ میں رہن رکھ کر روپیہ لے آئی۔وہ بھی ختم ہوگیا تو بادشاہ شمال میں سکاٹ لینڈ چلا گیا وہاں بھی کامیابی نہ ہوئی اور ایک شخص نے مخبری کرکے بادشاہ کو مخالفین کی فوج کے حوالے کر دیا۔

ویسٹ منسٹر ہال لنڈن میں فوجی عدالت قائم ہوئی۔بادشاہ کو الزام پڑھ کر سُنائے گئے تو اُس نے کہا کہ تم تو میرے ملازم ہو تم کو یہ حق کہاں سے حاصل ہوگیا کہ اپنے بادشاہ پر مقدمہ چلاؤ۔بادشاہت تو آسمان عطا کرتا ہے اور کوئی نہیں جو مجھے اِس اعزاز سے بے دخل کرے۔بے شک مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں گی مگر تم کون ہوتے ہو مجھ پر مقدمہ کرنے والے؟ اِس کو بادشاہ کے الفاظ میں Divine Right of kings کہتے ہیں۔

فوجی پہلے ہی بادشاہ سے بیزار تھے اُنہوں نے ایک نہ سُنی اور ۲۷/جنوری ۱۶۴۹ء کو موت کی سزا سُنا دی۔

اِس خوف سے کہ بادشاہ کے حامی شاید آخری مرتبہ اُسے چھڑانے کی کوشش کریں اُس کو عام دروازے سے نہیں بلکہ کھڑکی میں سیڑھی لگا کر نیچے اُتارا اور قریب ہی قتل گاہ میں لے گئے۔یہ ۳۰/ جنوری ۱۶۴۹ء منگل کا دن تھا۔بڑی سخت سردی تھی۔شاہی لباس اُتار دیا گیا۔بادشاہ نے دو قمیصیں پہنی ہوئی تھیں ایک اُتروالی گئی اور جلاد نے لکڑی کے کندے پر گردن رکھنے کا اشارہ کیا۔

بادشاہ نے اُس وقت بڑی متانت اور وقار سے مجمع کو مخاطب کر کے کہا کہ میں انگلستان کی آزادی کے لئے جان دے رہا ہوں۔جلاد نے کلہاڑا اچھالا۔گردن کٹ کر نیچے گر گئی۔خون کے دھارے بہنے لگے تو تمام مجمع سے آہوں اور سسکیوں کا شور اُٹھا۔جلاد نے کٹا ہوا سر اُٹھا کر سب کو دکھایا اور کہا:

"His head is off" عین اُس وقت آسمان سے برف گرنی شروع ہوگئی۔انگریز بہت تو ہم پرست قوم ہے۔حاضرین کی اکثریت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم سے بڑی بھاری غلطی ہوئی ہے ہم نے ایک بے گناہ شخص کو مار ڈالا ہے۔آسمان تو گواہی دے رہا ہے کہ اُس کا دامن برف کی طرح بے داغ تھا۔

اُس دن سے انگریزوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب کسی بادشاہ کو قتل نہیں کرنا۔اس کے اختیارات چھین لیئے جائیں تاکہ نہ وہ غلطی کرے اور نہ ہم اسے کوئی سزا دیں۔ہوتے ہوتے اب یہ حالت ہے کہ بادشاہ/ملکہ محض ایک علامتی عُہدہ ہے جس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔تمام اختیارات عوام کے نمائندوں کے ہیں جو وزیراعظم اور اس کیساتھ وزیروں کو مشورہ دیتے رہیں اور وہ امور سلطنت سرانجام دیتے ہیں۔بادشاہ محض دستخط کر دیتا ہے۔

چارلس کے قتل کے ۲۳۷ سال بعد.........۱۸۸۶ء میں جب ملکہ وکٹوریہ حکمران تھیں تو اُن کو ایک خط ملا جو

کسی ہسپتال سے ایک مریض عورت نے لکھا تھا کہ ملکہ معظمہ مجھے ہسپتال میں آ کر مل جائیں ایک قیمتی امانت اُن کے سپرد کرنی ہے ۔مَیں قریب المرگ ہوں ،چاہتی ہوں کہ یہ متاع اُن

! بادشاہ چارلس کی آخری گھڑیوں کے متعلق ایک انگریز شاعر نے حسب ذیل شعر کہا ہے۔

He nothing common did or mean.

upon this memorable scene.

کے سپرد کر جاؤں۔دو تین خط آئے تو ملکہ وکٹوریہ نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری Sir Henry Ponsonley کو بھیجا کہ اس عورت سے دریافت کرے کہ کیا بات ہے۔

اس مریضہ نے کہا کہ جس وقت چارلس اوّل کو قتل کیا گیا تو اُس کے آباء میں سے ایک شخص بادشاہ کا خادم خاص تھا۔وہ قریب کھڑا تھا۔جب جلّاد نے کلہاڑا چلایا تو گردن کی ایک ہڈی اُڑ کر نیچے پُرالی پر گری جسے اُس نے اُٹھا کر محفوظ کر لیا۔

وہ میرے پاس ہے میں اسے ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھ میں دینا چاہتی ہوں خود آئیں اور وہ ہڈی لے لیں۔

پرائیویٹ سیکرٹری نے جا کر ملکہ کو سارا واقعہ بتایا۔اُنہوں نے حکم دیا کہ وہ ہڈی میرے پرائیوٹ سیکرٹری کو دیدے وہ مجھے دیدیں گے۔اور اپنے بڑے بیٹے پرنس ایڈورڈ آف ویلز سر ہنری پونسٹن بائی اور اُس وقت کے ہوم سیکرٹری کو حکم دیا کہ تینوں سینٹ جارج کے گرجا میں (جو ونڈسر کیسل کے اندر ہے) اُس کے تہہ خانے میں سے چارلس اوّل کا تابوت نکلوائیں،مہریں توڑ دی جائیں اور اگر فی الواقعہ گردن کی ہڈی کا ایک ٹکڑا غائب ہو تو اس ہڈی کو نہایت احترام سے وہاں چپکا دیا جائے۔

جب تابوت نکال کر دیکھا تو واقعی ہڈی غائب تھی۔بادشاہ کی نعش بالکل اُسی طرح پڑی ہوئی تھی جس طرح کہ ۲۳۷ سال پہلے رکھی تھی اور اس کی شکل ذرا بھی مسخ نہ ہوئی تھی۔ہڈی کو پیوست کر کے تابوت پھر سے تہہ خانے میں رکھدیا گیا۔

اُس زمانہ سے انگلستان کا کوئی بادشاہ (خواہ وہ کتنا ہی خراب ہو) قتل نہیں کیا گیا صرف اسکے اختیارات سلب کر لئے گئے اس لئے امورِ سلطنت میں اُس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے،وزیراعظم اور کابینہ سیاہ کریں۔سفید کریں۔صُلح کریں۔جنگ کریں۔یہ بات کسی تحریر میں نہیں آئی مگر اس پر عمل ہو رہا ہے۔تاہم انگلستان کے بے اختیار بادشاہ کی لوگوں کے دلوں میں بے حد وقعت اور عزّت اور احترام ہے۔مشہور ہے کہ انگلستان میں چار چیزوں کا بڑا احترام ہے۔

۴	۳	۲	۱
اور چائے	کرکٹ	فٹ بال	بادشاہ سلامت

(ماہنامہ خالد اپریل ۱۹۸۲ء)

دو سبق آموز اور سچے واقعات

انسان کی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی کامیابی کے نشہ میں ایسے الفاظ منہ سے کہہ دیتا ہے جو بالآخر اس کے زوال کا باعث بن جاتے ہیں ایسے دو سچے واقعات ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ تا کہ احباب سبق حاصل کریں۔

۱۹۱۲ء میں انگلستان کی وائٹ سٹار کمپنی نے کئی کروڑ روپے کے خرچ سے ایک ایسا مسافر بردار جہاز تیار کروایا جو یورپ اور امریکہ کے درمیان مسافروں کو لے جایا کرے۔ اس جہاز میں اس وقت کی تمام ایجادات اور سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ یوں تو بے شمار کمرے تھے مگر ۱۶ کمرے کچھ ایسی صنعت سے بنائے گئے تھے کہ وہ بوقت ضرورت Watertight بن سکتے تھے یعنی خواہ کچھ ہو پانی ان کے اندر نہیں آسکتا تھا۔ جہاز کیا تھا۔ آرام و آسائش کا حرف آخر ہی تھا۔ اس وقت کے تمام جہازوں سے سائز میں بھی سب سے بڑا تھا۔ اس کا نام Titanic رکھا گیا۔ کولمبس نے جس جہاز میں سفر کرتے ہوئے امریکہ دریافت کیا تھا ٹائی ٹینک اس سے ۴۳۵ گنا بڑا تھا۔ اس کے پیندے دوہرے بنائے گئے تھے اور جہاز بنانے والی کمپنی نے گارنٹی دی تھی کہ یہ جہاز Un-Sinkable ہے یعنی یہ جہاز ہرگز ڈوب نہیں سکتا۔

۸؍اپریل ۱۹۱۲ء کو یہ عظیم الشان جہاز برطانیہ کی مشہور بندرگاہ ساوتھمپٹن سے روانہ ہوا اس پر کل ۲۲۲۴ مسافر سوار ہوئے۔ ان مسافروں میں یورپ اور امریکہ کے سرکردہ آدمی شامل تھے۔ رئیس بھی تھے۔ بڑے بینکر بھی تھے۔ فیشن چلانے والی مستورات بھی تھیں۔ ۱۰؍اپریل ۱۹۱۲ء کا سورج خیر و خوبی سے غروب ہوا۔ اور لوگ رات کا کھانا کھا کر آرام کے لئے بستروں پر چلے گئے جہاز نہایت شان سے تیز رفتاری کا ریکارڈ توڑنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ کہ اس کے وائرلیس آفیسر کو پے درپے کئی پیغامات ملے کہ تمہارے راستے میں آئس برگ قطب شمالی سے جنوب کی طرف بہتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ احتیاط سے چلو مگر ٹائی ٹینک کے افسروں نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ رات کے ساڑھے دس بجے ایک چھوٹے سے جہاز جس کا نام Californian (کیلے فورنین) تھا جو ٹائی ٹینک سے تقریباً دس میل دور تھا وائرلیس پر کہا Say oldman! we are struck here Snowbound by ice. (ترجمہ) بڑے صاحب ہم یہاں برف کے تودوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ٹائی ٹینک کے وائرلیس آفیسر نے بڑی رعونت سے جواب دیا کہ

Shut up. shut up .Keep out. I am Talking to cape race. You are Jamming my Signals.

(ترجمہ) ''خاموش۔ خاموش میرے راستے سے ہٹ جاؤ میں راس ریس سے باتیں کر رہا ہوں اور تم میرے

پیغامات کو خراب کر رہے ہو۔"

اس پر کیلیے فورنین کا بیچارہ وائرلیس آپریٹر خاموش ہو کر سونے کیلئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ابھی دس منٹ اس واقعہ کو نہ گذرے تھے کہ ایک عظیم الشان برف کا پہاڑ جہاز کے عین سامنے آگیا۔ یکا یک ٹائی ٹینک نے چکر کاٹا اور جہاز کے افسر نے جہاز کو تیزی سے پیچھے ہٹانا شروع کیا۔ آئس برگ کی ٹکر سے جہاز کے پیندے میں ۳۰۰ فٹ لمبا شگاف پیدا ہو گیا تھا۔ جہاز کے ۳۸ سالہ تجربہ کار کپتان نے اپنے انجنیئر کو بلوایا۔ وہ بیچارہ خود کپڑے اتار کر نیچے گیا۔ اور معائنہ کرنے کے بعد مع اپنے عملہ کے اس رخنہ کو بند کرنے کی تجاویز کرنے لگا۔ بیچاروں نے پوری تندہی سے کام کیا اور بڑے بڑے تختے چیر کر سوراخ کو بند کرنے لگے مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ تختے بھی بہہ نکلے۔ پانی کا دباؤ بے حد تھا۔ اس قدر پانی اندر آرہا تھا کہ جہاز کے تمام پمپ مل کر بھی نکال نہ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی قیمت سے زیادہ کام کیا۔ مگر پانی کے زور کے سامنے عاجز آ گئے اور کپتان سمتھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ تب کپتان نے پہلی مرتبہ وائرلیس پر امداد کے لئے اپیل کی۔ کہ آس پاس کے جو جو جہاز میری آوازیں سنیں۔ ہماری مدد کے لئے لپکیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ ٹائی ٹینک کے تمام انجن بند کر دئے گئے تھے۔ اور وہ سمندر میں بالکل ساکن تھا۔ تھوڑا سا ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ اور سر کے بل پانی کے اندر آہستہ آہستہ غرق ہو رہا تھا۔

حادثے کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد آخر کار حکم دے دیا گیا کہ لائف بوٹ سمندر میں اتار دی جائے۔ بدقسمتی سے نہ تو عملہ جہاز کو اور نہ ہی مسافروں کو کشتی اتارنے کی مشق کرائی گئی تھی سخت گھبراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ یعنی کسی فرد کو بھی یہ علم نہ تھا کہ ایسے حادثے کے وقت کیا کرنا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی کشتی جو اتاری گئی اس میں ۱۶۵ افراد کے لئے جگہ تھی۔ مگر گھبراہٹ میں صرف ۲۸ سوار ہوئے دوسری کشتی میں ۱۱۴۰ شخاص سما سکتے تھے مگر صرف ۱۲ سوار ہوئے۔

رات کو تقریباً ڈیڑھ بجے اندھیرے میں مسافر اتارنے میں اور بھی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اب ہر شخص کو یہ علم ہو چکا تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ جہاز کی تمام کشتیاں صرف اول اور دوئم درجے کے مسافروں کے لئے بھی پوری نہ تھیں۔ بیچارے تھرڈ کلاس مسافر تو کشتیوں تک پہنچ ہی نہ سکے۔ عورتوں اور بچوں کو پہلے سوار کرایا گیا۔ مردوں نے نہایت اعلیٰ وقار کا نمونہ دکھایا اور عملہ جہاز نے بہترین برطانوی روایات کی یاد تازہ کر دی۔ باوجود یکہ جہاز چل نہیں رہا تھا۔ مگر سٹوکروں نے آخری دم تک بوائلروں میں کوئلہ ڈالنے کی ڈیوٹی سر انجام دی حتیٰ کہ انجن روم پانی سے بھر گیا۔ جہاز کے ہال کمرے میں جہاز کا بینڈ Ragtime بجا رہا تھا (جو ایک قسم کی موسیقی ہوتی ہے) اور جب وہاں بھی پانی ان کے گھٹنوں تک آ پہنچا تو انہوں نے ایک اور گیت گانا شروع کر دیا جس کے ابتدائی بول یہ ہیں

Nearer My God to thee

باقی ماندہ مسافروں نے بھی اس میں شرکت کی۔

رات دو بجے کے بعد جلد ہی کیپٹن سمتھ نے اعلان عام کر دیا کہ اب تمام عملہ جہاز اپنی کوششوں کو بند کردے۔ اب وہ آزاد ہیں جو چاہیں کریں۔ اس سے زیادہ ڈیوٹی ان سے ممکن نہیں ہے۔

اس کے ۲۰ منٹ بعد جہاز نے آخری ڈبکی لگائی اور وہ سمندر کی تہ میں ....۲ میل نیچے..........غرق ہو گیا کیپٹن سمتھ اپنی جگہ پر کھڑا جہاز کے ساتھ ہی غرق ہوا۔ کل ۱۵۱۲ مسافر ڈوب گئے۔ مگر پھر بھی ۷۰۰ مسافر امدادی جہازوں نے (جو اپیل سنکر موقعہ پر آ پہنچے تھے) بچائے۔

ادھر برٹش پارلیمنٹ نے اور اُدھر امریکن سینٹ نے کمشن مقرر کئے جو حادثہ کے متعلق تحقیقات کر کے رپورٹ کریں کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے مگر وہ کسی ایک شخص پر الزام نہ دے سکے عرصہ دراز تک باقی بچ نکلنے والے مرد عورتوں کے بیانات اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔

ایک امریکن فوجی افسر نے آخری دم تک عورتوں اور بچوں کو کشتیوں میں سوار کرنے کی خدمت سرانجام دی۔ اور پیشانی پر بل نہ آنے دیا۔ کرنل ایسٹر نے اپنی نوجوان بیوی کو کشتی میں سوار کرا کے خود سگریٹ سلگا لیا۔ اور کہا کہ عزیز من! میں تم سے بعد میں آن ملوں گا۔ ایک خاتون نے کشتی میں بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ برسوں ہم اکٹھے رہے ہیں۔ اب کیونکر جدا ہو جائیں۔ غرضیکہ بے شمار دل دوز واقعات میں کہاں تک لکھوں In The midst of life we are in death. مدتوں تک پادری صاحبان نے گرجوں میں اسی موضوع پر وعظ کئے۔ مشہور برطانوی شاعر ٹامس ہارڈی نے ایک معرکے کی نظم لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔

دنیا کو اس حادثہ سے دو سبق حاصل ہوئے۔

۱۔ کوئی جہاز Un-Sinkable نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اگر تمام جہازوں میں وائرلیس کا آلہ نصب ہوتا تو اکثر جانیں بچ جاتیں (ان دنوں ابھی مارکونی کی یہ مفید ایجاد عام نہیں ہوئی تھی)

غرضیکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جہاز کمپنی کے ایک فقرے سے کس قدر نقصان ہوا کہ

Our ship is un-Sinkable

دوسرا واقعہ ۱۹۳۰ء کا ہے

جنگ عظیم اوّل (۱۸-۱۹۱۴ء) میں جب جرمنی والوں نے اہل انگلستان کو زک پہنچانے اور مرعوب کرنے کے لئے زیپلین قسم کے ہوائی جہاز بھجوائے اور ان کے ذریعے بم گرانے شروع کئے تو ۱۹۱۶ء میں ایک دن ایک

زیپلین L.33 ۔ Essex کے ایک گاؤں میں گرالیا گیا۔ جب اس پر فوج والوں نے پہرہ لگادیا اور ماہرین کی ایک جماعت نے اس کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ جہاز نہایت اچھی حالت میں ہے چنانچہ اس کو بطور نمونہ سامنے رکھ کر اہل انگلستان نے بھی ایسے جہاز بنانے شروع کردیئے۔ اس سے قبل انگریزوں کے پاس اس قسم کا ایک جہاز بھی نہ تھا۔ اور جرمنی پر جوابی حملے شروع کر دیئے۔

جنگ کے بعد انگریزوں نے اسی طرز کے جہاز تجارتی مفاد کے لئے بنانے شروع کئے اور ۱۹۱۹ء میں ۳۴۔R نامی جہاز بنایا۔ یہ بحر اوقیانوس پار کرنے کے قابل تھا۔ چنانچہ یہ سو گھنٹے میں انگلستان سے مانٹریال (کینیڈا) گیا۔ اور ۵۸ گھنٹے میں واپس آیا۔

پھر ایک اور جہاز R-۳۸ بنایا جس کو امریکن نیوی نے خرید لیا۔ مگر چوتھے امتحانی تجربہ کے وقت یہ دریائے ہمبر میں دو ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔ اور ۴۴ جانیں ضائع ہوئیں۔ لاکھوں روپے کا جو نقصان ہوا وہ علیحدہ رہا۔

اس حادثے کے بعد انجینئروں نے فیصلہ کرلیا کہ اس قسم کے جہاز چنداں محفوظ نہیں ہوتے۔ آئندہ ان کو نہ بنایا جائے۔ مگر ۱۹۲۹ء میں پھر خیال آیا کہ ایک اور تجربہ کرو۔ چنانچہ دو جہاز R-۱۰۰ اور R-۱۰۱ بنائے گئے ہر ایک ۵۰۰۰۰۰۰ مکعب فٹ کا تھا۔

جہاز R-۱۰۱ کو خاص طور پر انگلستان۔ ہندوستان کے مابین سفر کے لئے تیار کیا گیا۔ علاوہ عملۂ جہاز کے اس میں ۵۰ مسافروں کے لئے جگہ تھی۔ ۵۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو یہ جہاز انگلستان سے ہندوستان کے لئے رات کے تقریباً گیارہ بجے روانہ ہوا ان دنوں برطانوی وزارت ہوا بازی کے وزیر لارڈ ٹامسن ہوا کرتے تھے۔ روانگی سے قبل انہوں نے پارلیمنٹ میں اس جہاز کے روشن مستقبل کے متعلق ایک بیان دیا۔ ایک ممبر نے ان سے یہ سوال کیا کہ پہلے ہم کو ایسے جہازوں کے متعلق تلخ تجربے ہو چکے ہیں۔ کیا کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟ لارڈ موصوف نے حسب ذیل جواب دیا:

There is going to be no danger while I am incharge.

(ترجمہ) جب تک میں اس جہاز کا انچارج ہوں خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

بس یہی فقرہ معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہ خداوندی میں گستاخی شمار ہوا۔ ایک انسان اور اس قدر دعویٰ؟ خدا کی خدائی میں دخل؟ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جہاز لنڈن سے روانہ ہوا اور ابھی فرانس کی حدود میں ہی تھا کہ رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب برق و باراں کے طوفان میں جل کر گر گیا۔ صبح کو کسانوں نے ۴۶ لاشیں بکھری ہوئی پائیں لارڈ ٹامسن بھی انہی میں تھے۔ فاعتبروا یا اُولو الاَبصارِ

(ماہنامہ مصباح مئی ۱۹۶۰ء)

انگریزوں کے عطا کردہ خطابات

ہر مہذب گورنمنٹ اپنی وفادار رعایا، مخلص کارکنان اور خدمت اور جاں نثاری کا صلہ نقد انعام، جنس واملاک اور جاگیروں کی صورت میں یا خطاب دے کر کیا کرتی ہے اور یہ طریقے تقریباً تمام دنیا میں رائج رہے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے خطابات صحابہء کبار کو عطا فرمائے مثلاً حضرت علیؓ کو اسد اللہ اور حضرت خالدؓ بن ولید کو سیف اللہ وغیرہ۔

ہندوستان میں مغل شہنشاہوں نے بھی خطابات منعم خان، خانِ خاناں ، آصف جاہ ، آسمان جاہ، افسر الملک، دبیر الدولہ، سالار جنگ وغیرہ دیئے۔

مگر انگریزوں نے ایک نئی ایجاد کی کہ حروف مقطعات کی طرح کے خطابات بڑی فراخ دلی سے دیئے۔ انگریزی راج میں مسلمانوں کو خان صاحب ، خان بہادر، نواب ، سر، شمس العلماء، حاذق الملک ، وغیرہ دیئے جاتے ۔ ہندوؤں کو رائے صاحب ، رائے بہادر، راجہ ، سر، مہاموپادھیائے وغیرہ۔ سکھوں کو سردار صاحب ، سردار بہادر، سر وغیرہ۔ پارسی فرقہ کے افراد کو مسلمانوں جیسے خطابات عطا ہوتے تھے۔

انگریزوں کے خطابات کے متعلق مشہور ومعروف امریکن مورخ جان گنتھر نے اپنی کتاب "In-Side Africa" کے صفحہ ۳۴۹ پر لکھا ہے:۔(ترجمہ)

''گو انگریزی سلطنت کی وہ پہلی سی عظمت تو اب ماند پڑ چکی ہے تاہم وہ شاہی نظم ونسق کے معاملے میں اب بھی مہا استاد ہیں ۔اور ان کی تکنیک ایک وسیع اور دلکش دائرے کی صورت میں محیط ہے اس کی ادنیٰ سی مثال.........مگر اس قدر ادنیٰ بھی نہیں.........خطابات کی فہرست ہی لے لیں۔ افریقہ بھر میں بے شمار افریقن ، ہندوستانی اور عرب آپ کو ملیں گے جو اپنے ناموں کے آخر میں خطابات مثلاً او۔بی۔ای یا اسی قسم کے اور نام چپکائے پھرتے ہیں ۔ایسے اعزاز بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور سوائے جلے بھُنے قومی کارکنوں کے سب ان کے حصول کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ خدمات کا صلہ دینے کے لئے ،تالیفِ قلوب کے لئے ، بددلی دُور کرنے کے لئے اور اعلیٰ ترین خوشامد کا اس سے بہتر طریقہ کبھی ایجاد نہ ہوا تھا۔''

یہ خطابات ہندوستان میں وسیع پیمانے پر دیئے جاتے تھے ہر سال یکم جنوری کو اور بادشاہ کے یومِ پیدائش پر ''آنرز لسٹ'' اخبارات کی اشاعت بہت بڑھ جاتی تھی ۔لوگ بڑی بڑی کوششیں اور خوشامدیں کر کے یہ خطابات حاصل کرتے اور جب کسی کو خطاب ملتا تو اُسے اپنے احباب کو پارٹی دینی پڑتی تھی۔

مشہور ہے کہ ایک صاحبِ ثروت خاندان میں بہت سارے خطابی خان بہادر جمع ہو گئے ۔اسی خاندان کی

دوسری شاخ میں جو مالی لحاظ سے بہت کمزور تھی ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے خان بہادر رکھ دیا تا کہ کچھ تو برابری ہو سکے۔

میرے دیکھنے کی بات ہے کہ ۱۹۲۱ء میں لائل پور میں ایک ضلعدار نہر سردار امیر سنگھ تھے، ان کو حسنِ خدمت کے صلہ میں ڈپٹی کمشنر نے سردار بہادر کا خطاب دلایا۔ اُن کے ایک عقیدت مند نے قصیدۂ مدحیہ لکھا جس میں یہ شعر بھی تھا جو ہجوِ ملیح کی اچھی صورت ہے۔

"سردار" اور "امیر" تو پہلے ہی آپ تھے
امسال بن گئے ہیں "بہادر" امیر سنگھ

۱۹۱۲ء میں جب گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک جاری کی تو بڑے بڑے معزز ہندوستانیوں نے انگریزی خطاب ترک کر دیئے۔ اس معاملہ میں پہل ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے کی اور وائسرائے کو حسبِ ذیل خط لکھا:۔

"مجھے پنجاب کے واقعات سے (واقعہ جلیانوالہ باغ امرتسر) سخت دُکھ ہوا ہے۔ شاید گورنمنٹ آپ کو اس پر مبارک باد دے کہ اس نے عوام کو آئندہ کے لئے سبق سکھا دیا ہے مگر افسوس کہ شریف ہندوستانیوں کی اپیل کو گورنمنٹ نے ٹھکرا دیا ہے او ر اس کا جذبۂ انتقام زوروں پر ہے۔ لہٰذا اس بے عزتی

حسن رہتاسی مرحوم کہتے ہیں۔

نظر آتے ہیں کچھ پھرتے ہوئے حکام کے در پر
جو اپنی بہتری پاتے ہیں سرکاری خطابوں میں!

پر جو ہمارے بھائی بندوں کی کی گئی ہے میں اِس عزت کے نشان کے بغیر ہی رہنا چاہتا ہوں" (اور انہوں نے سَر کا خطاب واپس کر دیا۔)

اسی طرح خاندان شریفی کے مایۂ ناز دودمان حکیم اجمل خان صاحب نے بھی خطاب "حاذق الملک" واپس کر دیا۔ حالانکہ یہ خطاب اُن کو لارڈ ہارڈنگ کی سفارش پر ملا تھا جو خود حکیم صاحب کے گھر جا کر اُن کا مطب دیکھ آئے تھے کہ وہ کس طرح بغیر کسی طمع کے انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ بے شمار اَور ہندوستانیوں نے اپنے خطابات اور تمغے واپس کیئے۔ خود گاندھی جی نے تمغہ "قیصر ہند" واپس کیا۔

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کو جب گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن کی سفارش پر خطاب دینے کی تجویز ہوئی تو انہوں نے اِس شرط پر قبول کیا کہ اُن کے استاد علاّمہ میر حسن سیالکوٹی کو بھی خطاب ملے۔ چنانچہ اُن کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔ یہ خطابات یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو ملے تھے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے خطاب ملنے پر کسی نے ہندو اور مسلم لیڈروں کے خطاب کے متعلق رویّہ پر حسب ذیل

اشعار لکھے تھے

گوکھلے[1] سے جب یہ پوچھا لو گے سر؟
دائیں بائیں ان کا سر ہلنے لگا
اور جب اقبال سے پوچھا یہی
زیر و بالا ان کا سر ہلنے لگا
ماجرا جب یہ سُنایا قوم کو
محور گردن پہ سر ہلنے لگا
پہلے تو ملّت بیضا کے تھے سرتاج
اب سُنتے ہیں علّامہ سے ''سر'' ہو گئے اقبال
کل ٹھنڈی سڑک پہ کوئی کہتا تھا یہ گستاخ
سرکار کی دہلیز کے سر ہو گئے اقبال

بعض ستم ظریفوں نے انگریزی مقطعات کے نہایت مضحکہ خیز معنی پیدا کر کے ہنسی کے مواقع پیدا کئے۔ مثلاً موجودہ شہر سرگودھا جہاں آباد ہے ۱۹۰۰ء سے پہلے یہاں جنگل ویرانہ تھا اور ایک شخص گودھا نامی بھینسیں چرایا کرتا تھا اور ہندی میں سر بمعنی تالاب استعمال ہوتا ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیں کہ حسن رہتاسی نے کس خوبصورتی سے ''سر'' کا استعمال دکھا کر اپنی قادر الکلامی کا سکّہ جمایا ہے۔

تیری اِس نکتہ نوازی پر حسن حیران ہے
دیدیا گودھے کو پس از مرگ بھی 'سر' کا خطاب

O.B.E یا Owl of the British Empire اور K.C.M.G. کو Kindly Call Me God کو کہا کرتے تھے وغیرہ۔ مگر سال ۱۹۴۷ء (جو انگریزوں کا ہندوستان میں آخری سال تھا) کی آخری لسٹ پر جو ظریفانہ چوٹ احمق پھپھوندوی نے کی اس کی مثال نہیں ہے۔

جاتے جاتے بھی دے رہے ہیں خطاب
گو کہ فہرست اب کے چھوٹی ہے
سمجھیں اس کو غنیمت اہلِ وفا
بھاگتے چور کی لنگوٹی ہے

[1] مشہور مرہٹہ لیڈر گوپال کرشن گوکھلے جس نے سر کے خطاب کی پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا

لارڈ مونٹ بیٹن نے ۲۰۰ برس کی تجارت، محنت اور جنگ سے حاصل کردہ عظیم سلطنت اپنے عہدِ حکومت (۱۴۵ دن) میں ختم کر دی۔ انگریزوں کے ساتھ ان کے خطابات بھی ختم ہو گئے۔ سچ ہے۔
جدھر گیا بنیا اُدھر گیا بازار۔

(ماہنامہ خالد جولائی ۱۹۷۳ء)

''گُل شگفت''

خلاقِ اعظم نے مٹی میں کچھ ایسی تاثیر رکھی ہے کہ اگر ہم ایک ہی جگہ میں نیشکر، مرچ، کیلا، آم، چنے وغیرہ بودیں تو سب کا ذائقہ اور تاثیر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوگی۔ اسی طرح باغ میں مختلف اقسام کے پھول ہوتے ہیں۔ مگر سب کی رنگت۔ خوشبو اور تاثیر الگ الگ ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک گھرانے میں ایک ہی والدین کے بچے مختلف ناک، نقشہ، رنگت اور طبائع لیکر پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاندان میں بھی دو بچے ایسے پیدا ہوئے کہ ایک کی خوشبو سے زمانہ معطر ہو گیا اور دنیا کے ہر گوشے میں اس کے نام لیوا نہ صرف موجود ہیں بلکہ دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اور انشاء اللہ بڑھتے ہی چلے جائیں گے مگر دوسرے نے دنیا میں ایک ناپسندیدہ فضا پیدا کی کہ اب اس کا نام جاننے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

حضرت اقدسؑ کے ایک چچا مرزا غلام محی الدین تھے۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ یعنی مرزا امام دین۔ مرزا نظام دین اور مرزا کمال دین۔

مرزا امام دین کے متعلق تو تفصیل سے ذکر آگے آئے گا۔ مرزا نظام دین منجھلے بھائی تھے ان میں اس قدر درشتگی تو نہ تھی جو مرزا امام دین کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ مگر تاہم وہ مخالف اقدام میں اپنے بھائی کے شریک کار تھے۔ ان سب کے متعلق خدا تعالےٰ نے بذریعہ الہام بتا دیا تھا کہ یَنْقَطِعَ اٰبَائُكَ وَيُبْدَاءُ مِنْكَ۔ یعنی تیرے آباء کی نسل کاٹ دی جائے گی۔ اور تجھ سے شروع ہوگی۔ مرزا نظام دین کے لڑکے مرزا گل محمد صاحب حضرت خلیفۃ ثانیؓ کی بیعت کر کے اس الہام کی زد سے بچ گئے اور اب ان کی اولاد موجود ہے۔

تیسرے بھائی مرزا کمال دین بالکل تارک الدنیا ہو کر قصبہ قادیان کے باہر موجودہ باغ بہشتی مقبرہ کے جانب غرب اپنے مختصر سے باغیچے میں رہا کرتے تھے وہیں پر اُن کی قبر بھی ہے یہ شخص بے ضرر انسان تھا۔ طب میں اچھی مہارت تھی ان کے بعض نسخے بڑے کامیاب تھے۔ مرزا امام دین نے حضرت اقدسؑ کے مکان کے سامنے جو دیوار بنا کر دروازہ بند کر دیا تھا اس میں مرزا کمال دین نے جج متعلقہ کو اپنی تحریر بھجوا دی تھی کہ میرا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

(تحریر مورخہ ۱۲؍فروری ۱۹۰۰ء)

مرزا امام دین نے جب حضرت اقدسؑ کی طرف خلق کا رجوع دیکھا تو ان کے دل میں حسد پیدا ہوا۔ انہوں نے بھی اپنے گرد چوہڑوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا اور قادیان میں بالمیک کے نام کا مندر بنا کر سنکھ بجاتے۔ گھڑیال

بجاتے اور ''دید'' کرتے یعنی آنکھیں بند کر کے خدا کے تصور میں مگن ہوتے ۔ مرزا امام دین کی طبیعت دہریّت کی طرف شدت سے مائل تھی اور طبیعت میں بیحد ۔ استہزاء اور لغویت تھی ۔ حُقّہ کے بڑے رسیا تھے ۔ طبقہ جہلا سے خوب گاڑھی چھنتی تھی ۔ حضرت اقدسؑ کو دکھ دینے کے لئے ہر ایذا رسائی کی سکیم میں یہ ضرور شریک ہوتے اور جو شخص بھی حضرت کے خلاف محاذ کھڑا کرتا اس کے شریک ہو جاتے تھے ۔

حضرت اقدسؑ کی کتاب براہین احمدیہ کے شائع ہونے کے بعد آسمان سے وحی خفی کے ماتحت جب سعید طبع لوگوں نے قادیان کا رُخ کیا ۔ تو ان کو بھی خیال آیا کہ وہ بھی کوئی کارنامہ دکھائیں چنانچہ اپنے رسالہ ''گل شگفت [1] ''میں لکھا کہ ہم نے قادیان میں بالمیک جی کے مذہب کو فروغ دینے کے لئے مندر بنایا ہے ۔ جہاں ہر شام سنکھ بجایا جاتا ہے اور دید کی جاتی ہے لوگوں کو چاہیے کہ جوق در جوق آ کر شامل ہوں ۔ کچھ عرصہ سے ہمارے قریبی سے رشتہ دار نے ایک دکان سجائی ہے اور من گھڑت الہام سُناتا ہے اپنے مذہب کو فروغ دینے کے لئے اس نے کچھ لوگ اپنے گرد جمع کر لئے ہیں ۔ ان میں سے چار ٹھگ خاص طور پر مشہور ہیں ۔ ایک جموّں سے نکالا ہوا حکیم نور دین ہے دوسرا سیالکوٹ کا کریم بخش ہے [2] تیسرا محمد احسن ہے اور چوتھا بھیرہ کا فضل دین ہے ۔ مرزا غلام احمد جو الہام گھڑتا ہے یہ چاروں اس پر صاد کر دیتے ہیں اسے عوام الناس! اگر یہ شخص سچا ہوتا تو سب سے پہلے ہم اسے مانتے مگر یہ شخص مکّار ہے ۔ سچ ہے ؎

دنیا	کمائیے	مکر	سے
روٹی	کھائیے	شکر	سے

لوگوں کو چاہئے کہ اس کے دام میں ہرگز نہ آئیں ۔ (مفہوم)

جب حضرت مولانا نورالدین صاحبؓ پہلی مرتبہ ۱۸۸۴ء میں قادیان تشریف لائے تو حضرت نے یکّے والے کو واپسی کیلئے کرایہ بھی ادا کر دیا تھا ۔ یکّے والا حضرت مولانا کو مرزا امام دین کے دیوان خانہ میں لے گیا ۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص چارپائی پر بیٹھا حقّہ پی رہا ہے ۔ اور ارد گرد زمین پر چند نہایت ادنیٰ قسم کے لوگ بیٹھے ہیں ۔ حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ جب میری نظر اس شخص پر پڑی تو طبیعت نے کہا کہ یہ شخص براہین احمدیہ کا مصنّف ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ اتنے میں مرزا امام دین نے خود ہی پوچھ لیا کہ کیوں صاحب! آپ نے مرزا غلام احمد صاحب سے ملنا ہے؟ تو حضرت مولانا کی جان میں جان آئی ۔ مرزا امام دین نے ایک آدمی کو کہا کہ ان کو مرزا صاحب کے مکان کا رستہ دکھا دے ۔

ایک دفعہ حضرت اقدسؑ اپنے والد کی پنشن کی رقم وصول کرنے گئے ۔ تو مرزا امام دین بھی ہمراہ ہو گیا اور اس نے وہ روپیہ ادھر اُدھر خرچ کروا دیا ۔

(سیرت المہدی حصہ اوّل صفحہ ۴۳)

---

[1] گل شگفت کے علاوہ مرزا امام دین نے ''دین حق'' اور ''دو کافروں کی کہانی'' کتابچے بھی لکھے ۔

[2] مولوی صاحب کا اصل نام کریم بخش تھا مگر حضرت اقدسؑ نے تبدیل فرما کر عبدالکریم رکھا تھا ۔

ایک دفعہ مرزا امام دین نے حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کو قتل کرنے کا بھی منصوبہ بنایا تھا۔

(سیرۃ المہدی حصہ اوّل صفحہ ۲۳۰ طبع ثانی)

جب شاتم رسولؐ لیکھرام نے حضورؑ کی توہین کی مہم شروع کی اور وہ آریہ سماج کا پراپیگنڈہ زور و شور سے کرنے لگا تو مرزا امام دین قادیان سے لاہور پہنچا اور لیکھرام سے درخواست کی کہ وہ قادیان آئے اور وہاں پر آریہ سماج کی شاخ کھولے اور کہ مرزا صاحب خود بھی ممبر بنیں گے اور فی الواقعہ ممبر بن گئے ۔یہ ۱۸۸۵ء کا واقعہ ہے۔

(مجدد اعظم حصہ اوّل صفحہ ۴۷۳)

مرزا امام دین نے ۵ جنوری ۱۹۰۰ء کو حضرت اقدسؑ کے مردانہ حصے کے دروازے کے سامنے ایک دیوار اس طرح سے کھنچوا دی کہ مہمانوں کو مسجد مبارک میں جانے کے لئے بہت لمبا رستہ طے کر کے ہندو بازار میں سے گزر کر اور ایک پورا چکر کاٹ کر آنا پڑتا تھا۔ نیز مشترکہ خاندانی کنوئیں سے پانی لینے سے بھی منع کر دیا (یہ کنواں مرزا امام دین کے دیوان خانے میں اب بھی موجود ہے۔

حضرت اقدسؑ نے اپنے چند دوستوں کو مرزا امام دین کے پاس بھجوایا اور ان سب کو سخت تاکید کی۔اس کے ساتھ گفتگو کرتے وقت نہایت تحمل اور نرمی سے گفتگو کی جائے۔مگر وہ فوراً ہی مشتعل ہو گیا۔اور نہایت غصے سے کہنے لگا کہ "وہ خود کیوں نہیں آیا" (یعنی حضرت اقدسؑ خود میرے پاس آکر بات کرتے) اور گالیاں دینے لگ گیا۔وفد ناکام واپس آیا۔انہی دنوں کمشنر لاہور ڈویژن قادیان کے ایک قریبی گاؤں ہرچووالی میں نہر کے بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔وفد اس سے بھی جا کر ملا۔مگر اس نے بھی ایک نہ سنی اور کہا کہ تم مجھ پر رعب ڈالنے آگئے ہو وغیرہ

ادھر حضرت اقدسؑ دعاؤں میں لگے ہوئے تھے اور مجبوراً سرکاری عدالت میں نالش کردی۔مقدمہ جیتنے کی قطعاً امید نہ تھی۔متعلقہ زمین سرکاری کاغذات سے مرزا امام دین کی ملکیت ثابت ہوتی تھی۔حتیٰ کہ حضرت اقدسؑ کے وکیل جناب خواجہ کمال الدین صاحب کی بھی یہی رائے تھی کہ کچھ روپیہ ادا کر کے امام دین سے راضی نامہ کر لیا جائے۔

اب حضور کی دعاؤں نے اثر دکھلایا۔الہام ہوا (ترجمہ) چکی پھرے گی اور قضاوقدر نازل ہوگی یہ خدا کا فضل ہے جس کا وعدہ دیا گیا ہے یہ ضرور آئے گا اور کسی کی مجال نہیں جو اس کو رد کر سکے۔مجھے میرے خدا کی قسم ہے کہ یہی بات سچ ہے اس میں کچھ فرق نہ آئے گا اور نہ یہ امر پوشیدہ رہے گا۔اور ایک بات پیدا ہو جائے گی۔جو تجھے تعجب میں ڈالے گی۔یہ اس خدا کی مرضی ہے جو بلند آسمانوں کا خدا ہے۔میرا رب اس صراط مستقیم کو نہیں چھوڑتا۔جو اپنے برگزیدہ بندوں سے عادت رکھتا ہے۔اور وہ اپنے ان بندوں کو بھولتا نہیں۔جو مدد کرنے کے لائق ہیں سو تمہیں اس مقدمہ میں کھلی کھلی فتح ہوگی مگر اس فیصلہ میں اس وقت تک تاخیر ہے جو خدا نے مقرر کر رکھی ہے۔تو میرے ساتھ ہے اور میں تیرے ساتھ ہوں.........."

(تذکرہ صفحہ ۳۵۳، صفحہ ۳۵۴ طبع دوم)

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ سخت مایوسی کے عالم میں خواجہ صاحب نے ایک پرانی مسل دیکھی ۔ جس کے انڈکس یعنی خلاصہ سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیح موعودؑ کے والد حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب مرحوم بھی اس زمین کے مالک تھے اکیلا امام دین ہی مالک نہیں ہے ۔ جب یہ بات جج کے سامنے پیش کی گئی تو مقدمہ کی نوعیت ہی بدل گئی ۔ اس نے انڈکس دیکھتے ہی فیصلہ کر دیا کہ چونکہ مرزا غلام مرتضیٰ صاحب بھی اس زمین کے مالک تھے ۔ جہاں دیوار بنائی گئی ہے ۔ لہذا امام دین کا دعویٰ غلط ہے کہ وہ اس کا مالک ہے لہٰذا یہ دیوار فوراً گرائی جائے ۔ اور مرزا امام دین پر ایک سو روپیہ جرمانہ کر دیا گیا اور حکم ہوا کہ اس مقدمہ کے اخراجات جو چوالیس روپے بنتے تھے ۔ وہ بھی ادا کرے ۔

اتفاق سے اس دوران میں مرزا امام دین فوت ہو چکے تھے ۔ لہذا جرمانہ مع چوالیس روپے خرچہ مرزا نظام دین پر ڈالا گیا ۔ حضرت اقدسؑ کے مختار حکیم فضل الدین صاحب بھیروی نے چپکے سے ۔/۱۴۴ روپے کی ڈگری کا اجراء بھی کرالیا ۔ اور اسی چوہڑے نے وہ دیوار گرائی جس نے بنائی تھی ۔

جب مرزا نظام الدین سے مطالبہ ہوا تو وہ سخت پریشان ہوا اور کسی شخص کے ذریعہ حضرت اقدسؑ سے ملتمس ہوا کہ یہ سب رقم معاف فرمائی جائے کیونکہ وہ ادائیگی کی استطاعت نہیں رکھتا ۔ حضور کو جب علم ہوا تو وہ حکیم صاحب پر ناراض بھی ہوئے کہ حضور کی اجازت کے بغیر کیوں ڈگری کرائی آپ نے مرزا نظام دین کو بھی کہلوا بھیجا کہ میرے علم کے بغیر یہ کاروائی ہوئی ہے مجھے معاف فرمائیں ۔

(ماہنامہ خالد نومبر ۱۹۷۵ء)

گل شگفت

مرزا نظام دین وہ شخص تھا جو کسی احمدی کو قادیان کے جوہڑ سے (جس کو ڈھاب کہتے ہیں) مٹی نہ لینے دیتا تھا۔ ایک دفعہ سید احمد نور صاحب کابلی نے اپنے مکان کی تعمیر کے لئے مٹی لی تو مزدوروں سے اُن کی کدالیں اور ٹوکریاں چھین کرلے گیا۔ سیّد احمد نور صاحب نے مقابلہ کیا تو پولیس میں نالش کی مگر چونکہ ظالم خود تھا جلد صلح کر لی۔

یہ وہی ''حضرت'' ہیں جنہوں نے لیکھرام کو قتل کے بعد جب پولیس حضرتِ اقدس کے مکان کی تلاشی لینے کے لئے آئی تو دیگر کاغذات میں خود مرزا امام دین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ خطوط بھی نکلے جن میں ایک خاص چیز کا ذکر تھا۔ انگریز نے پوچھا کہ یہ خاص چیز سے کیا مراد ہے؟ تو حضرت اقدسؑ نے صاف صاف بتادیا کہ خط محمدی بیگم کے رشتہ کے متعلق ہیں اور امرِ معلومہ سے یہی مراد ہے یہ خط مرزا امام دین نے میرے نام لکھے تھے جو میرا حقیقی چچازاد بھائی اور محمدی بیگم کا حقیقی ماموں ہے۔ اس وقت مرزا امام دین پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔

(دیکھئے سیرۃ المہدیؑ حصہ دوم ص ۱۴۶۔۱۴۷)

احمدیہ چوک قادیان میں جہاں فخر الدین صاحب کتب فروش کی دکان تھی وہ جگہ حضرت اقدسؑ کی تھی وہاں پر ایک مکان بنانا تھا مگر مرزا امام دین اور نظام دین کے فتنہ کے خوف کی وجہ سے بنا نہ سکتے تھے کہ یہ ضرور رکوئی شرارت کریں گے۔ اتفاق سے ایک دن یہ دونوں ظالم قادیان سے باہر گئے ہوئے تھے تو ان کی غیر حاضری میں وہاں مکان بنوالیا گیا۔ جب وہ واپس آئے تو بہت غیظ وغضب کا اظہار کیا مگر کچھ کر نہ سکے۔

(سیرۃ المہدیؑ حصہ سوم ص ۲۶۰)

مرزا امام دین کی طبیعت میں سخت بے دینی کا خمیر تھا۔ حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحبؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ موسم گرما میں مسجد مبارک کے اوپر نماز عشاء ہونے لگی۔ حضرت مولوی عبدالکریم صاحبؓ امام الصلوٰۃ تھے تو نیچے مرزا امام دین نظام دین کے احاطے سے کئی ڈھول والے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ڈھول بجانا شروع کر دیا گویا وہ اپنی کارروائی سے نماز میں قرآن مجید کی آواز پست کرنا چاہتے تھے مگر چونکہ مولوی صاحبؓ بہت جہیر الصوت تھے انہوں نے بھی آواز بلند کردی۔ ادھر ڈھول والے بھی تیز ہوگئے۔ مولوی صاحب سورۃ قیامہ کی آیت اَولیٰ لَکَ فَاَولیٰ ثُمَّ اَولیٰ لَکَ فَاَولیٰ (ہلاکت تیرے لئے ہلاکت۔ پھر ہلاکت تیرے لئے ہلاکت) زور زور سے پڑھتے رہے۔ گویا شیطان سے مقابلہ تھا جو دیر تک جاری رہا۔ آیت بھی نہایت موقعہ کی تھی۔

(سیرۃ المہدیؑ حصہ سوم ص ۵۴)

آخر وہ دن بھی آیا کہ قادیان میں حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں طاعون پڑی مرزا نظام دین کے گھر کے بہت سے افراد مر گئے۔ مرزا نظام دین آیا اور حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کے در ے کی

چوکھٹ پر سر رکھ کر زار زار رویا اور کہا کہ حضرت جی ہماری مصیبت کا بھی کوئی علاج ہے؟ میں نے تو اب کوئی مخالفت نہیں کی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ مرزا جی میں خدائی تقدیر کو کیسے بدل سکتا ہوں؟ یہ واقعہ ۱۹۱۰ء کا ہے۔ آخری وقت میں مرزا نظام دین نے مخالفت کی شدت ترک کر دی تھی۔

(سیرۃ المہدی حصہ سوم ص ۱۴۶۔۱۴۷)

مرزا امام دین نے ایک دفعہ حضرت خلیفہ اولؓ سے کہا:۔

''میری طبیعت بچپن سے ہی سلیم تھی جب لوگ نماز پڑھتے اور رکوع و سجود کرتے تھے تو مجھے ہنسی آتی تھی۔''

(روایت حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ منصبِ خلافت ۲۹)

واقعہ یہ ہے کہ مرزا نظام دین کی طبیعت میں درشتگی پہلے بھی اتنی نہ تھی جتنی مرزا امام دین میں تھی مگر تاہم وہ اپنے بڑے بھائی کا شریک کار تو تھا۔ چونکہ حضرت اقدسؑ کو الہاماً بتایا گیا تھا کہ:۔

ینقطعُ اٰبائُکَ وَیُبْدَاُ مِنکَ یعنی تیرے آباء کی نسل قطع کی جائیگی اور تجھ سے نئی نسل کا آغاز ہوگا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہاں مرزا نظام دین کے گھر میں سے صرف اس کا لڑکا مرزا گل محمد حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی بیعت کر کے اس الہام کی زد سے بچ گیا۔ ان کی اولاد اب موجود ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ مرزا امام دین کا فوٹو موجود ہے۔ میں نے اصل فوٹو جو قد آدم سائز کا ہے صاحبزادہ مرزا رشید احمد صاحب کے گھر میں دیکھا ہے۔

مولوی عبدالرحیم صاحب درد نے اپنی انگریزی تصنیف ''لائف آف احمدؑ'' کے صفحہ ۵۲۳ پر شائع کر دیا ہوا ہے گو بہت چھوٹا سائز ہے تاہم حلیہ خوب نظر آتا ہے۔ مرزا امام دین حضرت مرزا سلطان احمد صاحبؓ کی دوسری اہلیہ کے والد تھے اور مرزا رشید احمد صاحب کے نانا ہوئے۔

ایک قیافہ شناس یورپین خاتون نے حضرت اقدسؑ کی تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ:۔

''یہ شخص بنی اسرائیل کا نبی معلوم ہوتا ہے۔''

مرزا امام دین کی حضرت اقدسؑ کے ساتھ شکل و صورت کے لحاظ سے مشابہت تو ضرور تھی مگر فرق وہی نور اور نار کا ہے

گر نباشد در مقابل روئے مکروہ و سیاہ
کس چہ دانستے جمالِ شاہدِ گلفام را

(ماہنامہ خالد دسمبر ۱۹۷۵ء)

ہم نے تاش کھیلی

یہ خاکسار ۱۸ نومبر ۱۹۰۷ء کو قادیان میں پیدا ہوا اور عزیز احمد نام رکھا گیا۔ ایک دن میری والدہ مجھے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں لے گئیں اور عرض کیا کہ یہ اکثر بیمار رہتا ہے اس کیلئے دعا فرمائیں۔

حضورؑ کو مجھ پر ترس آ گیا۔ اپنے ہاتھوں میں لیا اور دعا فرمائی۔ پھر پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ عرض کیا گیا۔ کہ اسکا نام عزیز احمد ہے۔ حضورؑ نے فرمایا کہ یہ نام تبدیل کر دو اور عبدالرحمان رکھو۔ ابھی حضورؑ دعا فرما ہی رہے تھے کہ میری والدہ نے مجھے حضورؑ کے ہاتھوں سے واپس اٹھا لیا۔ مبادا پیشاب کر دے، حضورؑ کی دعا کی برکت سے مجھے بے شمار فائدے پہنچے جن میں سے ایک یہ کہ لغو مشغلوں سے بہت شدید نفرت رہی ہے مثلاً تاش کھیلنا۔ تمباکو نوشی، سینما بینی اور پتنگ بازی وغیرہ۔

بچپن ہی سے مجھے کتب بینی سے محبت رہی ہے ایک دوست نے بڑی کوشش کی کہ مجھے تاش کا کھیل سمجھ میں آ جائے مگر میری طبیعت اس طرف راغب نہ ہوئی سوائے اس کے پتوں کے نام آ گئے۔ اور رنگ پہچان لیتا تھا۔

۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء کو خاکسار بذریعہ ٹرین چکوال سے قادیان جا رہا تھا۔ مندرہ جنکشن پر گاڑی تبدیل کرنی تھی مگر اسٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ گاڑی کئی گھنٹے لیٹ آ رہی ہے اور اس سے قبل ایک فوجی ٹرین آ رہی ہے۔ اگر اسمیں جگہ مل جائے تو بیٹھ جانا۔

فوجی ٹرین میں ایک مسلمان پلٹن کے سپاہی تھے۔ اُن سے کہا تو انکار کر دیا۔ ذرا الجاجت سے کہا تو ایک سپاہی کہنے لگا کہ اگر ہمارے ساتھ تاش کھیلو تو بٹھا لیتے ہیں۔

اب میرے لئے بڑی مشکل تھی۔ ایک تو مجھے تاش کی شدبُد کے سوا کچھ آتا نہ تھا دوسرے دلی نفرت۔ اگر ہاں کروں تو جگہ مل سکتی ہے اور انکار کروں تو شدید سردی میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ دل سے دعا کی کہ خدایا میں نے سالانہ جلسہ پر قادیان جانا ہے۔ اب کیا کروں؟ دل نے کہا کہ تم ہاں کر لو۔ میں نے کہا ضرور تاش کھیلوں گا انھوں نے مجھے اجازت دے دی اور میں گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اندر جا کر پھر دعا کی کہ خدایا اب عزّت تیرے ہاتھ میں ہے۔

گاڑی حرکت میں آئی۔ بہت سارے سپاہی میرے اردگرد بیٹھ گئے کہ دیکھیں یہ کیسا کھلاڑی ہے۔ کھیل شروع کرنے سے پہلے ایک صاحب نے جو حوالدار تھے بڑی مقطع ڈاڑھی بھی رکھی تھی۔ اپنا تعارف کرایا۔ میں نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

معلوم ہوا کہ وہ صاحب پلٹن کے امام الصلوۃ بھی ہیں اور بڑی خوبی یہ نکلی کہ ان کی ٹکّر کا تاش کا کھلاڑی بڑی مشکل سے ملے گا۔

میں اور بھی ڈر گیا کہ اب کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر عرض کیا کہ خدایا آج عزّت ر   ے پھر بھی

تاش کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔قادیان جانے کے خیال سے تاش کے پھندے میں پھنس گیا ہوں ورنہ تو جانتا ہے کہ میں اس چیز سے دُور بھاگتا ہوں

تاش کے پہلے پانچ پتے ملے تو میں نے ''پان'' ۔۔۔۔رنگ مقرر کیا۔دوسری تقسیم میں چار پتے ملے وہ بھی پان کے ہی نکلے۔تیسری تقسیم میں بھی باقی پتے پان کے میرے ہاتھ آئے۔

امام الصلوۃ صاحب کہنے لگے کہ ''شروع کرو'' میں خاموش رہا۔انہوں نے پھر کہا چلو میں نے کہا کہ ''چلو'' مجھے ڈرلگتا ہے کہنے لگے ''کیوں کیا بات ہے''؟ میں نے کہا آپ ایسے ماہر کے سامنے میں کیا چل سکتا ہوں۔مگر عرض کروں گا کہ آپ ہار مان لیں!''

وہ چونک کر کہنے لگے۔''کیوں''؟؟

میں نے تیرہ پتے اُن کے آگے پھیلا دیئے مجلس میں سناٹا چھا گیا۔مولوی صاحب نے سر جھکا کر باقی پتے اکٹھے کئے اور دوسری گیم کیلئے تیار ہوگئے۔اب کی بار رنگ ''چڑیا'' تھا اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ ''چڑیا'' کے نو پتے میرے ہاتھ آئے اور باقی چار پتے میرے ساتھی کے پاس تھے جو انہوں نے مجھے بڑی صفائی کے ساتھ چپکے سے دکھا دیئے تھے۔

میں نے کھیل شروع کرنے میں پھر تامل کیا تو مولوی صاحب کہنے لگے۔''اب دیکھوں گا کہ تم کس طرح جیتتے ہو!

میں زیرلب مسکرایا اور ان کی طرف غور سے دیکھا۔کہنے لگے۔''اب مزہ آئے گا''

میں نے کہا۔''ہاں ہاں ضرور آئے گا! آخر میں نے کہہ دیا کہ مکرم مولوی صاحب دوسری مرتبہ بھی ہار مان لیں!''

وہ شیر کی طرح بپھرے اور بولے'' روز روز عید نہیں ہوا کرتی''۔

میں نے کہا۔''خدا کے بندوں کیلئے'' ہوتی ہے وہ کہنے لگے۔''چلو چھوڑو مذاق اور اب شروع کرو'' میں نے کہا۔جناب ہار مان لیں! اور اپنے پتے پھر ان کے سامنے پھیلا دیئے۔ساتھ ہی میرے ساتھی نے بھی پتے کھول دیئے۔

اب تو امام الصلوۃ صاحب پھٹ ہی پڑے اور کہنے لگے۔''مرزائیا! کلام پڑھ کر تاش کھیلتے ہو؟''

میں زور سے ہنسنے لگا۔اور انہوں نے تاش اکٹھی کر کے فرش پر دے ماری اور علیحدہ ہو کر بیٹھ گئے ان کی حالت دیکھنے والی تھی۔تمام ڈبے میں سیاہی اکٹھے ہوئے اور حیران ہونے لگے۔مجھے یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں مجھے اٹھا کر باہر نہ پھینک دیں۔

اتنے میں وہ اٹھے اور اوپر والی برتھ پر لیٹ گئے اور لاہور تک کلام بھی نہ کیا۔لاہور پہنچ کر جب میں اترنے لگا تو بولے۔''سنو!'' کلام اللہ پڑھ کر تاش نہیں کھیلنا چاہیئے میں نے بہت کہا کہ میں تاش کھیلنا بالکل نہیں جانتا۔یہ بھی اتفاق تھا مگر وہ نہ مانے۔اس کے بعد میں نے آج تک تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔

(رسالہ تشحیذ الاذہان مئی ۱۹۷۶ء)

ادبی لطائف

ا۔ایک دفعہ اکبر آلہ آبادی کمشنر صاحب سے ملاقات کیلئے گئے ۔اکبر بہت دیر تک برآمدے میں بلاوے کے منتظر رہے ۔جب شرف باریابی پایا تواس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بعض نہایت ضروری امور سرانجام دینے تھے اس واسطے آپکو انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑی اور بعد میں کوئی تازہ شعر سنانے کی بھی درخواست کر دی۔اکبر نے پہلے تو کچھ عذر خواہی کی مگراس کے اصرار پر یہ فرمایا ۔

نئی تہذیب کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جنابِ ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

کمشنر صاحب بھی بڑے زود فہم تھے سمجھ گئے اور بہت معذرت کی مگراب کیا ہوسکتا تھا۔

۲۔مس گوہر جان کلکتہ والی اپنے وقت کی بڑی مشہور و معروف مُغنّیہ تھی ۔بڑے بڑے راجے ۔مہاراجے ۔ گورنر وغیرہ کے درباروں میں گایا کرتی تھی۔

کسی ایک ایسی ہی تقریب میں کسی شخص نے اسے بتادیا کہ وہ ہیں مشہور شاعر اکبر۔وہ نیاز حاصل کرنے کیلئے حاضر ہوئی اور شعر سنانے کا بھی مطالبہ کر دیا۔اکبر نے جواب دیا کہ اس مجلس کے برخاست ہونے پر شعر سنتی جانا۔مجلس کے بعد وہ پھر آئی اور مطالبہ کیا۔انہوں نے کہا لوسنو ۔

خوش نصیب ایسی بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

۳۔بھارت میں آج کل اردو زبان کی قطعاً کوئی قدر و قیمت نہیں رہی ۔بلکہ وہ ہندی کو رائج کر رہے ہیں وزیر اعظم نہرو نے بارہا اپنی قوم کو سمجھایا ہے ۔کہ اردو تو انہی کی اپنی زبان ہے اس کو فراموش نہ کریں ۔مگر تعصب کا بُرا ہو کہ سُنی ان سُنی کر دی گئی ہے۔

اسی حالت کے پیش نظر بھارت کے مشہور اردو شاعر جناب مصطفٰے خاں صاحب احمقؔ (جو عام طور پر احمق پھپھوندوی کے نام سے مشہور زمانہ ہیں) نے ۱۵۔اگست ۱۹۵۲ء کو جو لال قلعہ دہلی میں مشاعرہ ہوا۔اور پنڈت نہرو گاندھی ان کی صاحبزادی اندرا گاندھی ۔ان کی ہمشیرہ مسز پنڈت اور دیگر علماء عمائدین کی موجودگی میں حسب ذیل اشعار پڑھ کر سب کو لوٹ پوٹ کر دیا۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم دل دل کی باتیں کم سمجھتے ہیں
وہ کم سمجھیں یہ دیگر بات ہے۔ تاہم سمجھتے ہیں
بہت پٹتا میں احمق آج اظہار محبت پر
مگر یہ خیریت گزری۔ وہ اردو کم سمجھتے ہیں

۴۔ ۱۹۱۱ء میں مسجد کانپور کا غسل خانہ سرکار انگریز نے اس واسطے گرانے کا حکم دے دیا کہ وہاں سے سڑک سیدھی کر کے نکالنی مقصود تھی۔ اکثر معاملہ فہم مسلمان حضرات نے سمجھایا کہ غسل خانہ گرانے سے مسجد کی ہتک نہیں ہوتی۔ مگر مسلمان عوام نے ایک نہ سنی۔ سر جیمز مسٹن لفٹیننٹ گورنر یوپی تھے۔ انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا۔ بھلا کس کی مجال تھی کہ حکم شاہی کی تعمیل نہ کرے۔

ایک مسلمان اعلیٰ پولیس افسر کو حکم ہوا کہ تم جا کر غسلخانہ منہدم کرادو۔ اس نے مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑا ہو کر حکم دیا۔ مسلمانوں نے مزاحمت کی اور کئی لوگ پولیس کی گولیوں سے شہید ہوگئے مگر غسل خانہ گرادیا گیا۔

اس پر اکبر آلہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں چار اشعار کہے جو ہدیہء ناظرین کرتا ہوں تا کہ زبان محاورہ اور قوافی کا لطف اٹھائیں

کبھی ہندو ہے چکر میں کبھی مسلم ہے گردش میں
پھرا کرتا ہے یونہی چرخ ناہموار کا لٹو
خوشامد کا عراقی[1] اڑ رہا مسجد کے زینے پر
مسلماں ہی تو تھا آخر یہ اڑیل مشرقی ٹٹو
عنایت کی نظر اس وقت منشی رام[2] جی پر ہے
انہی آنکھوں کا تارا تھے مگر کل تک میاں چٹو[3]
[4]مری سرکار کا اُلّو نکل کر جا نہیں سکتا
کبھی ہندو بجر بٹو کبھی مُسلم نظر پٹو

نوٹ۔[1] عرب کا گھوڑا اصیل ہونے کے لحاظ سے اور عراق کا ٹٹو اڑیل ہونے کی وجہ سے مشہور زمانہ ہے۔ مسلمان قوم میں بعض حد درجہ کے خوشامدی ہیں۔ جنہوں نے غسل خانہ گرانے میں امداد دی تھی۔

[2] لالہ منشی رام جالندہری اصل نام ہے۔ سوامی شردھانند کا جو آریہ سماج کا مشہور بدزبان لیڈر تھا۔ اور آخر کار حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کشف کے مطابق ۱۹۳۴ء میں عبدالرشید کاتب دہلوی کے ہاتھوں پستول سے مارا گیا تھا۔ اور وہ جو حضور سے فرشتہ نے دریافت کیا تھا کہ "کہاں ہے لیکھرام" اور ایک اور شخص کا نام لیا کہ وہ کہاں ہے؟ (تفصیل کیلئے دیکھئے حقیقۃ الوحی) اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ یہ ان دنوں سرکار کے بڑے منظور نظر ہوتے تھے۔

[3] سے مراد مسلمان قوم ہے۔

[4] آخری شعر میں انگریزوں کی مشہور زمانہ پالیسی Divide and rule کی طرف اشارہ ہے۔ کبھی ہندوؤں کو آگے بڑھا دیتے تھے کبھی مسلمانوں کو۔ کبھی دونوں کو لڑا دیتے تھے۔

(ماہنامہ مصباح ۱۹۵۹ء)

ایک عجیب سچّا واقعہ

انگلستان میں ۱۶۲۵ء سے ۱۶۴۹ء تک شاہ چارلس اوّل حکمران تھا۔ یہ شخص اپنے والد جیمز اوّل کی طرح پارلیمنٹ کو قطعاً خاطر میں نہ لاتا تھا۔ جب روپے کی ضرورت ہوتی اجلاس بُلا کر حیلے بہانے سے روپیہ لے لیتا اور پھر جس طرح دل میں آتا خرچ کرتا۔

پارلیمنٹ کے ممبروں نے کئی بار تحریری درخواستیں پیش کیں کہ حضور! ہمارے حقوق کو پامال نہ کریں اور کسی قاعدے قانون پر چلیں مگر حضور کا جواب تھا کہ رعایا کا ہرگز یہ منصب نہیں کہ وہ بادشاہ پر اعتراض کریں۔ پارلیمنٹ کو بُلوانا، اُسے قائم رکھنا یا توڑ دینا میرے اختیار میں ہے۔ وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ بادشاہ کے اختیارات میں سے بادشاہت کی حفاظت بھی اسی کا کام ہے۔

ذاتی طور پر چارلس اول بہت اچھا آدمی تھا نیک تھا، مذہبی خیالات پر سختی سے قائم تھا۔ وہ بہترین آقا، بہترین باپ، بہترین دوست اور شریف آدمی تھا۔ کھانے پینے اور لباس میں اعتدال پسند تھا کوئی شخص اُسے ہیرا پھیری سے خوش نہ کرسکتا تھا۔ ایسی باتیں اُسے سخت ناپسند تھیں۔

مگر قسمت کی بات کہ اس کو مشیر کار نہایت بُرے ملے۔ ایک تو وزیر ڈیوک آف بکنگھم تھا جس کے رویہ سے رعایا سخت نالاں تھی۔ دوسرا بادشاہ کا بھتیجا پرنس رُوپرٹ تھا جو سپہ سالار بھی تھا۔ تیسری بادشاہ کی ملکہ ماریا ہنریٹا تھی۔ ان تمام اشخاص کی وجہ سے بادشاہ سخت بدنام ہوا۔

وہ اسلامی نظریہ کے مطابق کہا کرتا تھا کہ بادشاہ صرف خدا ہی بناتا ہے اور رعایا میں سے کسی کا حق نہیں کہ اُسے معزول کر سکے۔

جھگڑا بڑھتا گیا۔ انگلستان میں ایک قانون قدیم سے چلا آرہا تھا کہ ساحلی شہروں پر ایک ٹیکس جب بادشاہ چاہے عائد کرسکتا تھا۔ اس ٹیکس کیلئے پارلیمنٹ سے منظوری لینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ چارلس نے بھی یہی کام کیا۔ اس طرح کچھ روپیہ تو اُسے مل گیا مگر مخالفت بڑھ گئی۔ اس ٹیکس کو ship money کہتے تھے۔

جان ہمپڈن ایک معمولی زمیندار تھا اُس پر بھی ٹیکس عائد کیا گیا۔ گو نہایت قلیل رقم تھی مگر اُس نے اصول کی بناء پر ادائیگی سے انکار کر دیا۔ مقدمہ عدالت میں گیا۔ ججوں نے بادشاہ کے ایماء پر ہمپڈن کے خلاف ڈگری دیدی۔ اور چونکہ ممبر پارلیمنٹ بھی تھا عوام میں شور مچ گیا۔ بادشاہ نے چاہا کہ ہمپڈن سمیت کل پانچ ممبران پارلیمنٹ کو جیل میں ڈالدے اس غرض کیلئے چارلس پارلیمنٹ کے اجلاس کے وقت فوج لیکر دارالعوام میں چلا گیا اور جاتے ہی سپیکر ولیم لنتھال سے کہا کہ وہ پانچ ممبران کہاں ہیں جن کے نام میں پکارتا ہوں۔ چونکہ بادشاہ کی آمد کی خبر قبل از وقت

پارلیمنٹ کو مل چکی تھی وہ خاص ممبران خفیہ رستے سے شہر میں جا کر چھپ گئے جب بادشاہ نے نام پکارے تو سپیکر نے نہایت عزت اور احترام سے کرسی صدارت سے نیچے آ کر ٹوپی اتاری اور زمین پر گھٹنا ٹیک کر عرض کیا کہ ''حضور والا! وہ پرندے تو اُڑ گئے۔'' اور بادشاہ سخت کھسیانا ہو کر ناکام واپس آ گیا۔

اب بادشاہ اور عوام میں باقاعدہ خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ پہلے بادشاہ کا پلہ بھاری رہا مگر آلیور کرامویل نے جو پارلیمنٹ کی افواج کا جنرل تھا ماڈل آرمی تیار کر کے بادشاہ کو شکست دی اور گرفتار کر لیا۔

بادشاہ پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا۔ اُس نے بیان دینا چاہا مگر اس کی ایک نہ سُنی گئی ۳۰ جنوری ۱۶۴۹ء کو دو بجے بعد دوپہر وائٹ ہال کی ایک کھڑکی کی راہ سے نکل کر قتل گاہ کی طرف چلا۔ ایک اونچے پلیٹ فارم پر ہزارہا کے مجمع کے سامنے جلاّد نے دو جھٹکوں میں کلہاڑے سے قتل کر دیا۔

آخری ایام میں اُس نے نہایت استقلال، وقار اور صبر کا مظاہرہ کیا۔ انگلستان کے ایک شاعر اینڈرو مارول نے لکھا ہے کہ۔

He Nothing common did or mean upon this memorable scene.

یہ درست ہے کہ چارلس نے اپنی جان کی قربانی دیکر انگلستان میں بادشاہت کو ہمیشہ کیلئے بچالیا اس کے بعد کسی بادشاہ کو قتل نہیں کیا گیا ہاں اس کے تمام اختیارات مختلف قوانین مرتب کر کے ختم کر دیئے۔ اب انگلستان کے بادشاہ صرف نام کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ مصر کے بادشاہ فاروق نے خوب کہا تھا کہ اب دُنیا میں پانچ بادشاہ رہ جائیں گے۔ چار بادشاہ تاش کے اور ایک انگلستان کا۔

قتل کے معاً بعد جب اس کی نعش کو مصالحے وغیرہ لگا کر تابوت میں رکھنے لگے تو آسمان سے برف گرنی شروع ہوگئی۔ انگریز چونکہ سخت توہم پرست قوم ہے سب نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے، ہم نے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا۔ برف کا گرنا اس بات کی نشانی ہے کہ مقتول کا دامن صاف تھا۔ بعد میں نعش کو قلعہ ونڈسر کے گوتھک طرز تعمیر کے نہایت خوبصورت گرجا گھر کے تہہ خانہ میں دیگر شاہان انگلستان کے ساتھ رکھ دیا گیا۔

اس واقعہ کے ۲۳۷ سال بعد ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں جبکہ وکٹوریہ کو تخت نشین ہوئے ۵۱ سال گزر چکے تھے، ایک مریض عورت نے ہسپتال سے ملکہ وکٹوریہ کو خط لکھا کہ وہ مرنے کے قریب ہے، اور چاہتی ہے کہ اس کے پاس ایک ایسی امانت ہے جو وہ سوائے ملکہ معظمہ کے کسی اور کے سپرد کرنے کو تیار نہیں ہے۔

ملکہ وکٹوریہ نے توجہ نہ دی۔ دوسرا خط ملا تب بھی پرواہ نہ کی۔ تیسرا خط ملنے پر ملکہ وکٹوریہ نے اپنے پرائیوٹ سیکرٹری جنرل سر ہنری پونسن بائی کو ہدایت فرمائی کہ وہ فوراً ہسپتال میں جا کر اُس مریضہ کو ملیں اور دریافت کریں۔

اُس مریضہ نے بتایا کہ جس وقت شاہ چارلس اول کو قتل کیا گیا تھا تو اُس وقت عورت کا جدِ امجد بادشاہ کا خادم خاص تھا۔ قتل کے بعد اس نے گھاس پر دیکھا کہ بادشاہ کی گردن کی ایک ہڈی نیچے گری پڑی ہے جو اُس نے اٹھا کر رکھ

لی۔ وہ ہڈی اس مریضہ کے پاس ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھ میں دیدے۔ پرائیوٹ سیکرٹری نے جا کر تمام واقعہ ملکہ وکٹوریہ کے حضور عرض کر دیا۔

ملکہ وکٹوریہ نے فوراً حکم دیا کہ پرنس آف ویلز (جو بعد میں شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم بنے) اور پرائیوٹ سیکرٹری جنرل بونسن بائی اور تیسرے اُس زمانہ کے ہوم سیکرٹری تینوں بادشاہ چارلس اول کا تابوت نکلوائیں اور نعش کا معائنہ کر کے دیکھیں کہ کیا فی الواقعہ گردن میں سے ایک ہڈی غائب ہے؟

جب نعش نکلوا کر تابوت کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ نعش ذرا بھی خراب نہ ہوئی تھی اور گردن کے قریب سے ایک ہڈی غائب ہے۔

چنانچہ اُن تینوں نے وہ ہڈی جو اس مریض عورت نے پیش کی تھی نہایت احترام سے گردن کے ساتھ چپکا دی اور تابوت کو پھر سے بند کر کے مہریں لگا کر تہہ خانہ میں رکھوا دیا گیا۔ واپسی پر انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کو مشترکہ اطلاع نامہ پر دستخط کر کے اطلاع بھجوائی۔

یہ واقعہ پوری تفصیل سے ملکہ وکٹوریہ کی ایک نواسی پرنس میری آتی لوئیس نے اپنی کتاب My memories of six Reigns. ص ۱۷۲ جلد نمبر ۵ تحت لفظ ''چارلس'' میں لکھا ہے نیز انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۷۲ جلد نمبر ۵ تحت لفظ ''چارلس'' میں بھی مذکور ہے۔

(ماہنامہ خالد مارچ ۱۹۷۴ء)

حُسنِ مطالعہ یا لٹریری ڈائجسٹ

گذشتہ دنوں چند کتابیں مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ جن میں سے بعض ضروری اقتباس ہمارے سلسلہ کیلئے مفید ہو سکتے ہیں۔لھذا پیش ہیں۔

ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا
انسان یا پڑھے یا کسی کو پڑھا سکے

مسیحؑ بلادِ شرقیہ میں:۔

جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے خبر پا کر حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کی وفات کی خبر دی۔ تو پُرانی ڈگر کے لوگوں نے طوفانِ مخالفت اُٹھایا کہ یہ نیا عقیدہ جمہور مسلمین کے خلاف گھڑ لیا ہے۔ مگر حضور علیہ السلام نے قرآن مجید، حدیث شریف، کُتُبِ ائمۂ دین، کتب تاریخ اور کتب طب سے روز روشن کی طرح ثابت کر دیا کہ حضرت عیسیٰ وفات پا چکے ہیں۔

حضور علیہ السلام نے اپنی لاجواب تصنیف ''مسیح ہندوستان میں'' (جو حضورؑ کی وفات کے بعد شائع ہوئی) میں ثابت کر دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعہ ُ صلیب کے بعد تندرست ہو کر وہاں سے خدائی حکم کے ماتحت بنی اسرائیل کے دس دُور افتادہ قبیلوں کو پیغامِ حق پہنچانے کیلئے ہجرت کر کے مختلف ممالک کی سیاحت فرماتے ہوئے آخر میں ہندوستان آئے اور سرینگر کشمیر میں دفن ہوئے۔ اس مسئلہ کو جماعت احمدیہ نے اس کامیابی سے دُنیا میں پیش کیا ہے کہ اب غیر از جماعت علماء میدان چھوڑ گئے ہیں۔ تاہم دو مزید حوالے پیش کرتا ہوں جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وُرودِ ہند کی سند ملتی ہے

(ترجمہ): وٹیکن لائبریری میں ۴۰/۵۰ کتب ایسی ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ جوانی میں یسوعؑ ہندوستان گیا اور اپنی بعض تعلیمات ہندوستانی منبعوں سے اخذ کیں۔

World History by Hays,wayward and Moon /Macmillan.

حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کو فلسطین میں یہود نا مسعود کے ہاتھوں سخت تکالیف پہنچیں مگر اُسکے بعد خدا تعالیٰ نے اُن کو ایک نہایت ہی سرسبز پہاڑی علاقہ میں پناہ دی۔ وَاٰوَیْنٰھُمَا اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ ۔ کشمیر اور افغانستان میں بنی اسرائیل کے قبائل آباد تھے جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ جغرافیائی طور پر بھی دیکھا جائے تو فلسطین اور کشمیر میں بے شمار مماثلتیں موجود ہیں جن کا اعادہ یہاں ضروری نہیں ہے۔ آجکل امریکہ کی سپریم کورٹ کے ایک جج مسٹر ولیم۔ او۔ ڈگلس ہیں۔ ۱۹۵۰ء سے وہ مختلف ایشیائی ممالک کی سیاحت کر رہے ہیں اور اپنے تاثرات کو مختلف

کتب میں نہایت شستہ انگریزی میں شائع کر رہے ہیں۔اُن میں سے ایک کتاب Beyond the Himalayas میں لدّاخ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

(ترجمہ) ایک مشتبہ روایت یسوع کے متعلق بھی ہے۔ابتک یہاں پر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یسوع اس جگہ پر آیا تھا۔چودہ برس کی عمر میں وہ یہاں آیا اور ۲۸ برس کی عمر میں واپس گیا۔یہاں سے سیدھا مغرب کی طرف گیا اور پھر کسی نے اُس کی خبر نہ سُنی۔روایت میں تفصیلات بھی موجود ہیں۔جو بتاتی ہیں کہ یسوع نے ہمیس ۱؎ کی طرف عیسیٰ کے نام سے سفر اختیار کیا۔(ص ۱۵۲)

چونکہ مصنف کے عقیدہ کے خلاف یہ بات ثابت ہورہی ہے۔اس واسطے اُسنے بجا طور پر اسے ''مشتبہ'' قرار دیا ہے اور لداخیوں کا یہ خیال کہ پھر حضرت عیسیٰ کی کوئی خبر نہ سُنی گئی بھی درست ہے کیونکہ اگر ہم کوئی اچھی سی اٹلس لیکر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ لداخ سے سرینگر ہوائی جہاز کی اُڑان میں پورے ۴۰۰ میل ہے۔اس زمانہ میں جبکہ سفر کی سہولتیں میسّر ہیں یہ سفر سخت مشکل ہے تو اُس زمانہ میں پھر کس نے خبر دینی تھی۔ایک احمدی شاعر نے نظم میں سرینگر کو غیر فانی بنایا ہے۔

اے سرینگر کرامت کا تری قائل ہوں
منتخب تجھ کو کیا عیسیٰؑ کی تُربت کیلئے

بنگال کے متعلق ایک پیشگوئی۔

لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے ۱۹۰۵ء میں بنگال کو مشرقی اور مغربی دو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔جس پر ہندو بنگالیوں نے ہندوستان کے طول وعرض میں پریس اور پلیٹ فارم سے مخالفت کی آگ بھڑکائی۔مگر لارڈ کرزن بھلا کوئی ماننے والی آسامی تھے؟ اُدھر برطانیہ کے مشہور وزیر خارجہ سرایڈورڈ گرے نے اس کو A settled fact کہہ کر ختم کر دیا۔

کسی شاعر نے اُس زمانہ میں کیا خوب شعر اسی بارہ میں کہا تھا۔

خوب جی بھر کے ''سرایڈورڈ گرے'' دیکھ چکے
ہم غریبوں کے سیہ خانے کا ویراں ہونا

مگر خدا تعالیٰ نے حضرت امام الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بذریعہ الہام خبر دی کہ ''پہلے بنگالہ کی نسبت جو کچھ حکم جاری کیا گیا تھا۔اب ان کی دلجوئی ہوگی''۔(تذکرہ ص ۵۸۹)

۱؎ لداخ سے اوپر بُدھوں کی ایک مشہور خانقاہ ہے۔

یہ الہام ۱۱ فروری ۱۹۰۹ء کو ہوا۔ اُن دنوں لارڈ منٹو وائسرائے تھے ۱۹۱۰ء میں وہ چلے گئے۔ بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کا بھی انتقال ہو گیا۔ تو ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو شاہ جارج پنجم نے دہلی میں ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ اور اپنی زبان خاص سے بنگال کی تقسیم کو منسوخ قرار دیا۔ چنانچہ جارج پنجم کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے:۔

"King george 5 his life and reign by harold nicholson.P 168"

(ترجمہ) دربار کے خاتمہ پر جب وائسرائے اپنی تقریر ختم کر چکے تھے۔ تو بادشاہ سلامت خود اٹھے۔ جس پر سبھی حیران ہوئے، اور نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ تقسیم بنگال کو منسوخ کیا جاتا ہے۔

غور فرمائیں کہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کی پیش گوئی کس شان سے پوری ہوئی؟ یوں کوئی کہتا پھرے کہ آخر مرزا صاحبؑ نے کیا معجزہ دکھایا۔ چشمِ بصیرت رکھنے والوں کیلئے تو بے شمار نشان ہیں۔ مگر تعصب کی نظر رکھنے والوں کا کیا علاج؟

(ماہنامہ خالد مارچ ۱۹۶۲ء)

آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہ طُور کی!

چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں جب عیسائیت نے عروج پکڑا تو یونان میں بھی یہ مقبول ہوئی ۔ ان دنوں یونان کی حکومت بہت وسیع تھی اور مصر بھی اسکا ایک ماتحت صوبہ تھا۔ یونان کلیسا کے آرچ بشپ سکندریہ میں ہی رہتے تھے چنانچہ اس وقت سے لیکر اب تک سنائی کا علاقہ جس میں کوہ طور واقعہ ہے۔ انہی آرچ بشپ کے حلقہ میں ہے کوہ طور پر جانے کیلئے مذکورہ صدر بشپ سے تحریری اجازت حاصل کرنی ہوتی ہے جس کے بغیر وہاں کے راہب کسی کو مقامات مقدسہ کی زیارت نہیں کراتے ۔ ویسے سیاسی طور پر سنائی مصری حکومت کا حصہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام جب اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکلے تو موجودہ Bitter lakes (تلخ آب جھیلوں) میں سے گذرے تھے ۔ آج تو اس جگہ نہر سویز بہہ رہی ہے ۔ اُس زمانہ میں یہاں نرسل کے جھاڑ تھے اور یہیں فرعونِ مصر غرق ہوا تھا۔

سویز سے فاران تک

اگر ہم سویز کے مقام پر کھڑے ہو کر نہر کے پار پتھر پھینکیں تو وہ سنائی کے علاقہ میں گرے گا۔ نہر کا پل پار کر کے پتھریلے علاقہ میں سے گزرنا ہوتا ہے ۔ پرانے وقتوں میں تو یہ سفر آٹھ دس دن لیا کرتا تھا مگر آج کل تیز رفتار موٹروں کا زمانہ ہے اس لئے سویز سے صبح سویرے چل کر خانقاہ سینٹ کیتھرائن تک ہم مغرب کے قریب پہنچ سکتے ہیں مگر ہمیں چونکہ کوئی عجلت نہیں ہے اور ہم نے سیر کرنی ہے اس لئے موٹر پر آہستہ آہستہ چلیں گے۔

پورٹ توفیق سے ہمارا سفر جانب جنوب شروع ہوگا آپ یہ نہ خیال کریں کہ کوئی پکی کول تار بچھی ہوئی سڑک ہوگی بلکہ اس علاقہ میں سڑک سے مراد صرف اور صرف کسی پہلے گزرنے والی موٹر کار کے نشانات ہوتے ہیں ۔ جب کبھی اس علاقہ میں بارش ہو جائے تو بڑے بڑے پتھر لڑھک کر رہے سہے رستے کے نشانوں کو بھی مٹا جاتے ہیں۔ تب مصری حکومت سویز سے مرمت کرنے والی پارٹی بھجواتی ہے ۔ وہ جب راستہ صاف کر دیتی ہے تو گورنر سنائی اعلان کر دیتا ہے کہ سینٹ کیتھرائن کو جانے والی سڑک کھل گئی ہے۔

جس وقت کبھی ریتلے اور کبھی پتھریلے علاقہ میں موٹر بھاگ رہی ہوتی ہے تو قدم قدم پر خیال آتا ہے کہ اب ہم چند دنوں کے لئے تہذیب وتمدن کو چھوڑ کر بے آب وگیاہ ویرانوں میں جا رہے ہیں جہاں پر کبھی بنی اسرائیل برسوں پھرتے رہے تھے ۔ کوسوں تک نہ کہیں سبزہ ، نہ پانی اور نہ آبادی خشک چٹانیں ہیں یا جلے ہوئے پہاڑ ۔ تمام علاقہ زرد بھورے رنگ کی پہاڑیوں سے اٹا پڑا ہے ۔ تاہم اس ویرانے میں بھی کہیں نہ کہیں چند انسان مل ہی جاتے ہیں جو ادھر اُدھر سے لکڑی فراہم کر کے اس کا کوئلہ بناتے ہیں اور سویز آکر فروخت کرتے ہیں۔

اور آگے بڑھیں تو پہاڑیاں بھی بلند ہونے لگتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ان پہاڑیوں میں عجیب وغریب رنگ پائے جاتے ہیں گلابی، ہلکے نیلے، پیلے اودے اور ہلکے سبز۔ دوپہر سے قبل ہم خلیج سویز کے کنارے ایک ڈاک بنگلہ میں پہنچیں گے اس مقام کا نام ابوزنیمہ ہے یہاں پر سمندر کے کنارے سیپ بہت ملتے ہیں جن کے نہایت پیارے رنگ ہوتے ہیں۔ آپ ذرا غور کریں ان سیپوں کی بھی عجیب قسمت ہے ان کو ہم بہت شوق سے تلاش کرتے ہیں۔ کھولتے ہیں اور پھر نہایت بددلی سے پھینک دیتے ہیں۔ ابوزنیمہ سے چند میل پر مینگنیز کی کانیں ہیں جو ان کانوں سے نکالا جاتا ہے اور ٹرکوں میں لاد کر قاہرہ لے جایا جاتا ہے۔

اب ہمارا راستہ قدرے بلند پہاڑوں سے گزرتا ہے۔ سورج ان کے پیچھے سے طلوع ہوتا ہے اور جب تک کافی بلند نہ ہو جائے دھوپ اس وادی میں نہیں آسکتی اور جب دھوپ چمکنے لگتی ہے تو یہ وادی اشرقت الارض بنور ربھا کا نظارہ پیش کرتی ہے۔ اور تازگی کے لحاظ سے زندہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

اب ہمارا راستہ ''ویرانہ ءزن'' میں سے گذرتا ہے یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گستاخی سے پیش آتے ہوئے کہا تھا کہ تو ہم کو کہاں لے آیا ہے۔ جا تو اور تیرا رب لڑتے پھرو۔ ہم تو یہاں سے آگے بڑھنے کے نہیں اور پھر اس بے عملی اور بزدلی کی وجہ سے یہ بنی اسرائیل چالیس برس تک اس بیابان میں جس کی وجہ سے اس ساری وادی کو بھی فاران کہا جاتا ہے بھٹکتے پھرے تھے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مصر کی سبزیاں، پیاز، لہسن، دالیں وغیرہ طلب کی تھیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خدا تعالیٰ کی حکمت سے بٹیر اس کثرت سے آجایا کرتے تھے کہ ہاتھوں میں آپ گرے پڑتے تھے اور ذرہ سی کوشش سے ایک شخص اپنی جھولی بھر کرلے جاسکتا تھا اور جس قدر وہ چاہے مَن مل جاتا تھا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہ تھے اور اس خوراک کو ناپسند کرتے تھے۔ غرض یہ زمانہ بنی اسرائیل کے لئے بڑے ابتلاء کا زمانہ تھا۔

بہرحال یہ میدان طے کرنے کے بعد اگر ہم مشرق کو مڑ جائیں تو پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک اور وادی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ تقریباً ۳۰ میل لمبی ہے۔ دو رویہ نہایت بلند قامت پہاڑ آسمان سے باتیں کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ گھاس، پھول اور جھاؤ کے جس قدر بھی رنگ ہوسکتے ہیں وہ سب قدرت نے اِن پہاڑوں میں بکھیر دیئے ہیں۔ انسانی آنکھ یہاں کے قدرتی مناظر سے سیر نہیں ہوسکتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ خود قدرت کا بھی ان حسین رنگوں کے امتزاج سے دل بہل رہا ہے۔ سورج کی روشنی میں یہ رنگ اور بھی نکھر جاتے ہیں۔ یہاں قدرت اپنے تمام حسن لازوال سے مرصّع نظر آتی ہے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ یہی جگہ تو خدا کی تجلی گاہ بنی تھی۔

غرض تھوڑی دُور آگے بڑھ کر چھوٹے چھوٹے پرندے اُڑتے نظر آتے ہیں۔ جس سے خیال ہوتا ہے کہ انسانی آبادی یہیں کہیں قریب ہی ہوگی۔ تھوڑی دیر مزید سفر کرنے کے بعد دُور سے ایک سیاہ خیالی سا نظر آنے لگتا ہے اور قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ نخلستان ہے۔ اسی نخلستان کا نام فاران ہے۔ اس میں ایک باغ بھی ہے جس

کے اندر مکانات ہیں۔ باغ چار دیواری کے اندر ہے۔ دروازے کو کھٹکھٹانے سے اور سوراخ سے جھانکنے سے ہم کو ایک بوڑھا ڈاکو نما یونانی پادری نظر آئے گا جو آج سے ۹۰ سال پہلے کی بندوق اٹھائے چلا آرہا ہے۔ وہ دیوار پر سے جھانک کر دیکھتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ آپ کو یہاں پر کیا کام ہے؟ آپ بتلاتے ہیں کہ ہم سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ کو پرمٹ لے کر جارہے ہیں اور یہاں ذرا ستانے کی غرض سے آئے ہیں تو وہ اس پر دروازہ کھول دے گا اور آپ باغ کی سیر کر سکیں گے۔ اندر نہایت خوشنما باغیچہ ہے۔ پھل، پھول اور ترکاریاں بہار دے رہی ہیں۔ سینٹ کیتھرائن کے راہبوں کو اسی مقام سے سبزیاں وغیرہ سپلائی ہوتی ہیں۔ قریب ہی ایک پرانے گرجا کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ جس کے چند ستون ابھی قائم ہیں۔

بعثتِ اسلام سے قبل بھی یہاں پر عیسائی پادری رہا کرتے تھے۔ فاران کی بستی کے اردگرد اور بھی کئی بستیاں آباد ہوئی تھیں اور قریبی پہاڑوں میں بے شمار عیسائی راہب رہا کرتے تھے۔ جگہ بجگہ پہاڑوں میں غار ہیں۔ اُن میں سے بعض میں اب بھی سالم انسانی ڈھانچے ملتے ہیں۔ اس آباد بستی کو اُس زمانہ کے وحشی قبائل نے محض لوٹ مار کے جذبہ سے تباہ کر دیا تھا۔ فاران کے خوشگوار سائے کو چھوڑ کر اب ہم دوبارہ سرگرم سفر ہوتے ہیں۔ پھر اسی چندھیا دینے والی دھوپ اور بلند پہاڑوں سے واسطہ پڑے گا۔ اب شام پڑ چکی ہے۔ کافی دیر سفر کرنے کے بعد ایک پہاڑ کا چکر کاٹ کر جو آگے بڑھیں تو کوہ طور کے دامن میں سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ یوں نظر آتی ہے جس طرح زمین پر ایک گھونسلا رکھا ہو۔ نہایت بلند پہاڑوں کے دامن میں یہ راہب خانہ بالکل حقیر سا نظر آتا ہے۔ مگر اسکی تاریخی عظمت بہت بڑی ہے۔ اب ہم اور قریب آگئے ہیں اور سرو کے درخت نظر آنے لگے ہیں اور ایک قلعہ نما عمارت بھی۔ شام کے جھٹ پٹے میں جب ہم اپنی موٹر کی تیز روشنی میں خانقاہ کی دیواروں پر دیکھیں تو تین چار کالی کالی شکلیں ہمیں نظر آئیں گی۔ یہ راہب ہیں جو ہمیں دیکھنے کیلئے اُوپر آئے ہیں۔ اب جس جگہ جا کر ہماری موٹر رُکے گی۔ یقیناً وہ جگہ اُس جگہ سے دُور نہ ہوگی جہاں پر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طُور سے واپسی کے منتظر رہے تھے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۴۰۰۰ فٹ بلند ہے۔ شام پڑتے ہی اس علاقہ کی ہوا بہت خنک ہو جاتی ہے اور سردی چمک اُٹھتی ہے۔ ہماری آمد سے اس مختصر سی بستی میں ایک چہل پہل نظر آنے لگی ہے۔ بچے، عورتیں اور مرد ہماری کار کے گرد جمع ہیں اور اسباب اُتارنے میں ہماری مدد کر رہے ہیں۔ موٹر یہیں رہے گی۔ اس پر خانقاہ کے خادم پہرہ دیں گے۔

کافی دیر کے بعد بڑا دروازہ کھلتا ہے۔ چند نوجوان پادری آگے آتے ہیں۔ علیک سلیک کے بعد ہم نے ان کو بشپ آف سنائی کا پروانہ راہداری دکھایا اور انہوں نے مطمئن ہو کر اندر آنے کی ہمیں اجازت دی۔

یہ زرد رُو پادری جو یونانی کلیسا کے مرید ہیں ۵۶۱ عیسوی سے اس طرح یکے بعد دیگرے ...... یہاں اقامت پذیر چلے آرہے ہیں۔ ان لوگوں کے بال لمبے ہوتے ہیں جو سر پر جا کر جُوڑا بنا لیا جاتا ہے۔ سروں پر کالی سیاہ ٹوپیاں ہوتی ہیں جن کی شکل کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔ اُن کی کالی سیاہ داڑھیاں نہایت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اُن میں

بعض راہب تو چند سالوں کے بعد دوسری جگہوں پر چلے جائیں گے اور بعض یہاں عمر بھر کیلئے مقیم ہیں۔ ہمیشہ اُن کی تعداد ۳۰ اور ۴۰ کے درمیان رہتی ہے۔ اُن میں بعض بوڑھے بھی ہیں۔ مگر یہ لوگ محض راہب نہیں ہیں بلکہ بڑھئی، فنڑ اور ہر قسم کے کاریگر ہیں اُن میں سے بعض کئی زبانوں کے ماہر ہیں ان کے پاس ریڈیو بھی ہوتا ہے تا کہ باہر کی خبریں سن سکیں۔ مہینے میں ایک بار tor سے ڈاک یہاں آتی ہے تو اخبارات اُن کو ملتے ہیں۔

عمارتوں کے چکّر میں سے گزرتے ہوئے پتھریلے راستوں پر چل کر ہم کو مہمان خانہ میں لے جایا جاتا ہے جو ایک بالا خانہ میں ہے۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد ایک نوجوان راہب ''عرق'' لے کر آجاتا ہے جو دراصل کھجوروں کا شربت ہوتا ہے کھانا کھلا کر مسافروں کو آرام کیلئے بھجوا دیتے ہیں۔

مہمان خانہ میں اس خانقاہ کے قواعد کی کتاب پڑی ہوتی ہے جو چار زبانوں میں ہوتی ہے یعنی یونانی، عربی، انگریزی اور فرنچ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے راہبوں کو کچھ نہ کچھ آمد بھی ہو جاتی ہے۔ موٹے موٹے قواعد حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ہر شخص جو اس احاطے کے اندر رات بسر کرنی چاہے وہ اپنی رہائش اور خوراک کیلئے ایک پاؤنڈ (مصری) روزانہ ادا کرے گا۔ بغیر خوراک کے نصف پاؤنڈ۔

(۲) اگر کوئی شخص خانقاہ کے باہر اپنے لائے ہوئے خیمہ میں رات بسر کرے تو وہ ۲۵ پیاسٹر ادا کرے گا۔ (۱۰۰ پیاسٹر = ۱ پاؤنڈ مصری)

(۳) اس خانقاہ میں داخلہ کیلئے ۲۵ پیاسٹر فیس مقرر ہے۔

(۴) کوہ سنائی پر جانے کی فیس ۲۵ پیاسٹر ہے۔

(۵) کوئی شخص کوہ سنائی پر اکیلا نہیں جا سکے گا۔ بلکہ خانقاہ کا ایک راہب ہمراہ ضرور جائے گا۔ اس کی فیس زائر کو ۵۰ پیاسٹر ادا کرنی ہوگی۔

رات کے ساڑھے ۳ بجے ایک گھنٹی بجتی ہے اور تمام راہب بیدار ہو کر عبادت کیلئے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ عبادت اُسوقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ سورج کافی بلند نہیں ہو جاتا۔

صبح سویرے ایک عجیب نظارہ نظر آتا ہے۔ پتھر کے ایک بڑے سے میز پر دو تین راہب غلہ کا ڈھیر لیکر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک ایک دانہ اٹھا کر دوسری جگہ ڈھیر لگاتے ہیں۔ پیچھے صرف کوڑا کرکٹ رہ جاتا ہے جو پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ صاف شدہ گندم خانقاہ کی مشین میں راہب پیستے ہیں جو اسی احاطے کے اندر واقع ہے۔

اب سورج اتنا بلند ہو چکا ہوتا ہے کہ قریبی پہاڑ کی اوٹ سے نکل آیا ہوا ہے اور اس کی خوشگوار چمک سہانی معلوم ہوتی ہے۔ اُس وقت ایک راہب آپ کو یہاں کے مقامات کی سیر کرانے کیلئے ہمراہ لے چلے گا۔ روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قلعہ نما بستی ہے جس کے احاطہ کے اندر عمارتیں کسی خاص ترتیب سے نہیں بنیں بلکہ حسب

ضرورت بناتے چلے گئے ہیں۔ان میں باقاعدگی قطعاً نہیں ہے اونچے نیچے مختلف وضع کے مکانات ہیں۔اس کی دیواریں ۵۶۱ عیسوی شہنشاہ روم قسطنطین اعظم نے بنوائی تھیں بعد میں مختلف عیسائی حکمرانوں نے اسکی مرمت کرائی۔ نپولین نے جب مصر پر قبضہ کیا ہے تو اُس نے بھی یہاں کی عمارت کی مرمت کرائی تھی۔اس عمارت میں جگہ بجگہ بُرج بنے ہوئے ہیں۔فصیل پر قدیم وضع کی توپیں بھی دھری رکھی ہیں جو حفاظت تو نہیں کرسکتیں مگر کرسمس کے موقعہ پر یا کسی اور خوشی کے موقعہ پر چلائی جاسکتی ہیں۔

اس خانقاہ میں آپ کو بلّیاں کثرت سے ملیں گی۔یہ نہ صرف خوراک کے قیمتی ذخیرہ کو چوہوں سے بچاتی ہیں بلکہ خطرناک سانپوں سے بھی (جو یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں) بچاتی ہیں۔بڑی بھوکی نگاہوں سے یہ مسافروں کو کھانا کھاتے دیکھتی رہتی ہیں۔اگر ایک ذرہ بھی خوراک کا گرے تو یہ چٹ کر جاتی ہیں بچاریاں آخر کریں بھی کیا۔حلقہ زُہاد کی بلّیاں ہیں۔انہوں نے دودھ، مچھلی، گوشت اور دیگر اعلیٰ قسم کی خوراک دیکھی ہی کب ہے۔

ایک جگہ ۴۰ فٹ بلند دیوار میں مضبوط چرخی لگی ہوئی ہے، عام طور پر خانقاہ کا دروازہ بند ہی رہتا ہے اور اسی چرخی کے ذریعہ چیزیں باہر سے اوپر لے جائی جاتی ہیں۔

یہاں کے خادم جو "جبلیۃ" کہلاتے ہیں دراصل اُن ایک سو رومن اور ایک سو مصری غلاموں کی اولاد ہیں جن کو شہنشاہ قسطنطین نے مع اہل وعیال لا کے یہاں آباد کیا تھا تا کہ ادنیٰ خدمات بجالایا کریں۔اب یہ لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور انہی کی خاطر اِس خانقاہ کے اندر عین گرجا سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔اِن لوگوں کو رات کے وقت اندر رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ان کی رہائش کے لئے باہر شیڈ بنے ہوئے ہیں جہاں یہ اپنے بال بچوں سمیت رہتے ہیں۔[illegible] بیرونی تجارتیں اور اقتصادی معاملات انہی کے ذریعے طے ہوتے ہیں۔خانقاہ کے راہب ان کو روٹی روزانہ سپلائی کرتے ہیں۔ہر مرد کو تین [illegible] اور ہر بچے کے لئے ایک روٹی کا راشن مقرر ہے۔صدیوں سے اِسی طرح راہب ان کو کھانا دے رہے ہیں۔

احاطے کے اندر ہی ایک بڑھئی کا کارخانہ بھی ہے۔ایک آٹا پیسنے کی مشین ہے۔ایک بیکری ہے۔اِن راہبوں کا کھانا نہایت سادہ ہوتا ہے۔عموماً لوبیا زیتون کے تیل میں پکا ہوا اور نان ملتے ہیں۔یہ نان پشاوری نان کی طرح نہیں ہوتے بلکہ سخت لکڑی کی مانند ہوتے ہیں جن کو بھگو کر کھاتے ہیں۔ہر نان پر خانقاہ کا نام درج ہوتا ہے۔کھانا ریفریکٹری میں کھاتے ہیں جہاں پتھر کی سِلوں سے بنی ہوئی میزیں [illegible] اور پتھر کے بنچ۔تمام کمرے میں جا بجا عیسائی اولیاء کی تصاویر بنی ہوئی ہیں۔کھانے کے دوران میں ایک راہب بلند آواز سے عیسائی اولیاء کی سوانح حیات پڑھ کر سُناتا ہے۔بشپ صاحب جب چاہیں گھنٹی بجا کر اُسے روک سکتے ہیں۔مرکزی گرجا پہلے تو سینٹ جان کے نام پر منسوب تھا جسے church of Transfiguration یعنی کنسیہ ظہور جلالی بھی کہتے ہیں۔مگر بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے سینٹ کیتھرائن کر دیا گیا۔کیتھرائن ایک نوجوان عیسائی دوشیزہ تھی جو سکندریہ [illegible] عیسائیت

قبول کرنے کے جرم میں قتل کردی گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس نے آخری وقت میں دعا کی کہ اے خدا میری لاش کوہِ طور کے اُوپر پہنچا دے۔ چنانچہ فرشتوں نے لاش کو وہاں پہنچا دیا۔ کافی عرصہ کے بعد راہبوں نے ہڈیاں پائیں اور اس جگہ انہیں دفن کردیا گیا۔ اس کا سر اور جسم دو الگ الگ صندوقوں میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ گرجے میں عقیدتمندی کے مظاہر بے شمار ملتے ہیں۔ گرجا کافی تاریک ہے۔ اندر داخل ہو کر سوائے سونے چاندی کی چمک اور بلور کی دمک کے کچھ نظر نہیں آتا۔ خیال آتا ہے اس لق ودق ویرانے میں جہاں میلوں تک آبادی وسبزہ کا کوئی نشان نہیں ہے یہ مختصر سا مقام کس قدر آباد اور پُر رونق ہے۔

بیت معمور یہ ویرانہ ہے

جس قدر بھی سونے چاندی کے نذرانے کسی خانقاہ یا گرجے کیلئے پیش کئے گئے ہیں یہ یونانی گرجا اُن سب سے سبقت لے گیا ہے۔

گرجا کے بارہ ستون بازنطینی عہد کی یادگار ہیں۔ جو سال کے ہر ماہ کے ایک ایک شہید کے نام پر معنون کئے گئے ہیں۔ یہاں چھت پر جو نقوش ہیں وہ قسطنطنیہ کے سینٹ صوفیہ (مسجد ایا صوفیہ) کی طرز کے ہیں۔ دیوار پر بائیبل کے مختلف مناظر کو تصویری زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک میں حضرت موسیٰ کو دس الواح دیئے جانے کا نظارہ ہے۔ ایک جگہ حضرت عیسیٰ جلوہ گر ہیں اور اس قبہ دار عمارت میں تو بلوریں لیمپ بھی لٹک رہے ہیں۔ اسی گرجا کے تہ خانے (Crypt) میں کیتھرائن کی ہڈیاں محفوظ ہیں۔

اب ہمارا ہمراہی راہب ہم کو ہدایت کرتا ہے کہ جُوتے اُتار دیئے جائیں کیونکہ اب ہم اُس جگہ کے عین سامنے کھڑے ہیں۔ جہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جھاڑی میں آگ بھڑکتی دیکھی تھی۔ اس تنگ وتاریک محراب دار نصف دائرے سے ہر زائر کو ایک گہرا قلبی لگاؤ ہوتا ہے۔ اس مقام پر گرجا کا قدیم ترین حصہ بجنسہٖ موجود ہے۔ جھاڑی کے مقام پر چاندی کی ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ اصل چاردیواری سنگ مرمر کی بے عیب سلوں سے چھپی ہوئی ہے۔ ۳۴۲ عیسوی میں ملکہ ہلینیا نے بصرف زرِ کثیر اسے بنوایا تھا۔ وہ خود یہاں آئی اور یہ گرجا تعمیر کرایا۔ اُس وقت اُس عورت کی عمر ۸۰ سال تھی۔ مگر محبت اور شوق کے سامنے اُس نے اپنے آرام کی پروانہ کی۔

اِس خانقاہ میں ایک قیمتی لائبریری بھی ہے۔ کتابیں پتھر سے بنے ہوئے ایک کمرے میں نہایت سلیقہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ ہر کتاب کی پُشت پر یونانی اور عربی میں اُس کا نام درج ہے۔ موجودہ کتب یونانی، عربی، سریانی، فارسی اور حبشہ کی زبانوں میں ہیں۔

اِسی لائبریری میں بائیبل کا ’’نسخہ سنائی‘‘ بھی ہوتا تھا جس کو ایک عیسائی عالم نقل کرنے کے لئے ۱۸۴۴ء میں روس لے گیا مگر اُس وقت کے زارِ روس نے اُس کو تبرک سمجھ کر خود رکھ لیا اور اُس کی عکسی نقل نہایت خوبصورت جلد

کرا کے یہاں بھجوادی۔ یہی نسخہ موجودہ روسی حکومت نے ۱۹۳۳ء میں برٹش میوزیم لنڈن کے پاس پانچ لاکھ ڈالر کے عوض فروخت کر دیا۔ جہاں آجکل یہ نہایت حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔ اب تک اس قیمتی نسخہ کی جدائی کا صدمہ راہب محسوس کرتے رہیں سیرین زبان میں اناجیل کے وہ نسخے بھی موجود ہیں جو چوتھی یا پانچویں صدی میں لکھے گئے تھے۔ ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی نے یہاں سے کچھ نقل کرنا ہو تو پانچ پاؤنڈ مصری فیس ادا کرے۔

آیئے ذرا باغ کی بھی سیر کریں۔ یہ تقریباً بارہ کنال کے احاطے میں پھیلا ہوا ہے سبزہ پورے جوبن پر ہے۔ اور اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ سرو کے درخت اس میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ناشپاتی، سیب، بادام اور زیتون وغیرہ کے درخت پائے جاتے ہیں۔ اور گلاب سمیت تمام قسم کے پھول بھی موجود ہیں ان کی آب پاشی اکثر جبلیہ لوگ ہی کرتے ہیں۔

اسی باغ کے درمیان ایک سفید کمرہ ہے۔ جس میں مرحوم راہبوں کی ہڈیاں جمع کی ہوئی ہیں۔ کمرہ فرش سے چھت تک بھرا ہوا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک کرسی پر ایک نہایت پُرانا غبار آلود انسانی پنجر بیٹھا ہوا ہے۔ آپ دیکھ کر ڈر نہ جائیں یہ تو ۵۸۱ء عیسوی میں فوت ہونے والا راہب سٹیفن ہے۔ اُس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ مجھے اس خانقاہ کی دربانی عطا کی جائے۔ وہ اب تک مُردوں کی دربانی کر رہا ہے۔ بائیں طرف کھوپریاں جمع ہیں۔ دائیں طرف بازو پڑے ہیں۔ باقی جگہوں پر دیگر اعضاء رکھے ہیں قاعدہ یہ ہے کہ وفات کے کچھ عرصہ بعد ہڈیاں جمع کر لی جاتی ہیں اور یہاں ڈال دیتے ہیں۔ بشپ صاحبان کو صندوق میں رکھتے ہیں۔ ایسے بہت سے صندوق لیبل لگا کر ایک زمین دوز کمرے میں جمع کئے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں ایک مجبوری بھی لاحق ہے وہ یہ کہ پتھریلی زمین میں قبر نکالنی مشکل ہے ارد گرد کے پہاڑوں ہی پر لاشیں پڑی رہتی ہیں جب ہڈیاں رہ جاتی ہیں تو اُن کو جمع کر لیتے ہیں۔

کوہ طُور پر جانے کیلئے پُرانے راہبوں نے بڑی محنت سے ۳۵۰۰ سیڑھیاں بنائی تھیں۔ بعض جگہ پر یہ چڑھائی خطرناک بھی ہے۔ نصف کے قریب راستہ طے کرنے کے بعد ایک میدان آتا ہے۔ یہاں سرو کا ایک درخت بھی ہے۔ قریب ہی ایک دروازہ بنا ہوا ہے جس میں سے گزرتے وقت عیسائی لوگ اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں تاکہ پاک ہو جائیں۔ یہاں پر ایک چھوٹا سا حجرہ بھی بنا ہوا ہے جس میں سال میں ایک مرتبہ آکر راہب عبادت کرتے ہیں۔ چوٹی پر سے ارد گرد کا منظر نہایت عجیب ہوتا ہے چونکہ فضا نہایت صاف ہوتی ہے اس واسطے دُور دُور تک نگاہیں کام کر سکتی ہیں۔ مشرق میں خلیج عقبہ اور راس محمدؐ صاف نظر آتی ہے۔ شمالی جانب سلسلہ کوہ سنائی پھیلا ہوا ہے۔ نیچے کی طرف وادی سبائیہ میں اونٹوں کے راستے سفید دھاگوں کی مانند نظر آتے ہیں۔ یہاں پر ایک چھوٹا سا گرجا بھی بنا ہوا ہے اور پاس ہی ایک ننھی سی مسجد بھی موجود ہے جہاں ارد گرد کے عرب مسلمان سال میں ایک دفعہ آکر حضرت موسیٰؑ کی یاد میں قربانی ادا کرتے ہیں۔ اس گرجا میں ایک رجسٹر بھی رکھا ہوا ہے جس میں زائرین کو دستخط کرنے پڑتے

ہیں اور وہ عرصہ بھی درج کرنا ہوتا ہے جو اُن کو اُوپر آنے میں لگا ہو۔ دو گھنٹے اوسط ٹائم صرف ہوتا ہے۔

جونہی کوئی زائر چوٹی کے اُوپر پہنچتا ہے ہمراہی راہب اس گرجا گھر میں ایک موم بتی روشن کر دیتا ہے۔ اور جس وقت نیچے اُترنے لگتے ہیں اُسے بُجھا دیا جاتا ہے۔ اس گرجا میں ایک غار ہے جس میں ایک آدمی بخوبی سما سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس وقت خدا تعالیٰ نے تجلّی فرمائی تھی تو حضرت موسیٰؑ اس غار میں جا چُھپے تھے۔

اب سورج غروب ہونے کو ہے۔ زائرین خاموشی سے نیچے اُترتے ہیں۔ رات خانقاہ میں بسر کر کے اُسی ان عجیب و غریب تاریخی مناظر کے روحانی تصورات میں کھوئے حسب ذیل شعر گنگناتے ہوئے واپس اپنے وطنوں کو لوٹ آتے ہیں۔

عہد موسیٰ میں نہ تھا قابلِ جلوہ کوئی
ورنہ کیوں ایک پہاڑی پہ نمایاں ہوتا

اعتراف۔۔ یہ مضمون حسب ذیل کتب سے ماخوذ ہے۔

1.MoUNT SINIA/A.M.B.Dobson.

2.The Desert of the Exedus E.H. palmer.

3.The National Geographic Magazine/ u.s.A.December..1948

4.THrough the Land of the Bible/ H.V.Morton.

(ماہنامہ مصباح مئی ۱۹۶۱ء)

چائے

انگریز بے شک برصغیر سے چلا گیا مگر اپنے ورثے کے طور پر ہمیں تین چیزیں دے گیا ہے جنہیں ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوڑ سکتے ایک انگریزی زبان، دوسری بناسپتی گھی اور تیسری چائے۔

ہم پنجابی بولیں یا اردو، غیر شعوری طور پر الفاظ ہماری زبان پر انگریزی کے آ ہی جاتے ہیں۔

بڑے بوڑھے ہمیں بتاتے ہیں کہ ان کے بچپن میں کبھی کبھار جب برفانی ہواؤں کے ساتھ بارش ہوتی تو گھروں میں چائے پکائی جاتی تھی ورنہ کوئی نہ جانتا تھا کہ یہ بھی کوئی پیش کرنے والی چیز ہے جنگ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء) سے (۱۹۱۸ء) کے بعد ہمارے بے شمار سپاہی یورپ سے لوٹے تو وہ ضرور یہ شوق فرمانے لگے ۱۹۳۰ء کے قریب لپٹن چائے کمپنی والے بازاروں میں خود چائے پکا کر مفت پلایا کرتے تھے مگر عوام بے رغبتی سے پاس سے گذر جاتے تھے ادھر کمپنی والے اپنے مالک سر ٹامس کی طرح بڑے پختہ عزم کے مالک تھے۔ وہ بار بار آتے اور لوگوں کو اس کے فوائد بتاتے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر اشتہار لگائے گئے کہ گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ آج کل بھی بعض جگہوں پر یہ اشتہار نظر آتے ہیں۔

مگر یہ لپٹن کون تھا؟ ٹامس جانسن لپٹن ۱۰ مئی ۱۸۵۰ء کو گلاسکو میں ایک سبزی فروش کے ہاں پیدا ہوا۔ جوان ہو کر بیٹے نے باپ کی دکان کو ترقی دی۔ بہت جلد انہوں نے سیلون کی تمام چائے اور کافی خریدنے کا انتظام کر لیا۔ اور انگلستان بھر میں کافی، کوکو، بیکری، جام اور مربے وغیرہ کے سٹور کھول دیئے۔ اور تمام ملک میں چھا گئے، ہندوستان میں بھی اپنی تجارت کو فروغ دیا اور خوب نام پایا۔ ملکہ وکٹوریہ نے ۱۸۹۸ء میں سر کا خطاب دیا۔ سر ٹامس لپٹن کو کشتی رانی کا بھی بڑا شوق تھا ۱۸۹۹ء سے ۱۹۳۰ء تک پانچ مرتبہ بین الاقوامی کشتیوں کی دوڑ میں اپنی کشتی (SHAMROCK) مقابلہ میں بھجوائی مگر سوئے اتفاق سے ہر دفعہ بری طرح ہارے۔ اس دوڑ کا نام امریکہ کپ ریس ہوتا تھا۔ لیکن لپٹن نے ہمیشہ اپنی شکست کو نہایت وقار تحمل سے برداشت کیا اور کبھی ماتھے پر بل نہ لایا۔ بلکہ سپورٹس مین سپرٹ کا اظہار کیا۔ اس بات سے متاثر ہو کر پانچویں مقابلہ کے بعد امریکی فاتح گروہ نے ستم ظریفی کے طور پر سر ٹامس لپٹن کی خدمت میں ایک گولڈ کپ یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ آپ کے لئے ہے اُسے بھی لپٹن نے خندہ پیشانی اور وقار سے وصول کیا۔

چینی لوگ چائے کا تذکرہ ۲۷۳۷ برس قبل مسیح سے کرتے ہیں۔ الغرض چائے کا استعمال تاریخ کے دھندلکوں میں مستور ہے۔ نصف دنیا آج چائے کی عادی ہے۔ مگر تاہم کافی اوّل نمبر پر ہے امریکہ اور فرانس میں کافی زیادہ استعمال ہوتی ہے امریکہ میں چائے کی نامقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ ۱۷۶۵ء میں جب برطانوی پارلیمنٹ نے اپنا ٹیکس لگانے کا آخری حربہ ''سٹامپ ایکٹ'' کی صورت میں استعمال کیا اور اس کے بعد ایک اور ایکٹ کے ذریعے شیشہ

پنٹ اور چائے پر بھی بھاری ٹیکس عائد کردیا گیا۔اس پر عوام سخت مشتعل ہوئے کہ جب پارلیمنٹ میں ہمارے نمائندے نہیں لئے جاتے تو ہم پر ٹیکس کیوں عائد کئے گئے ہیں۔

اتفاق سے انہی دنوں انگلستان سے تین جہاز چائے سے لدے ہوئے بوسٹن کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے ،تاجروں نے مال وصول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ اپنی چائے واپس لے جاؤ۔بعض من چلے ریڈ انڈین مزدوروں کا سا بھیس بدل کر جہازوں پر گئے اور چائے کے بکس اٹھا کر سمندر میں پھینک دیئے۔اس واقع کو امریکہ کی تاریخ میں بوسٹن ٹی پارٹی Bostonta Party کہتے ہیں۔

ان دنوں عام طور پر چائے کو TEE یا TEA کہتے ہیں۔مگر چین والے CHAH یا TAY کہتے تھے۔ اور اسے نمکین پیتے تھے۔انگلستان میں چائے کا من دیلتھ کے زمانے میں آئی شیکسپئر کے کلام میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور چند سال کے اندر لندن میں ۲۰۰۰ چائے خانے کھل گئے اور اخبارات اسے

ہالینڈ سے سہ پہر کی چائے کا رواج چلا اور نیویارک تک پہنچا اس سے ساتھ ہی چائے دانیاں چاندی کی بننے لگیں ، چمچے اور دیگر لوازمات بھی وجود میں آئے ، عام طور پر بغیر دودھ کے پیتے تھے۔ پھر چائے کے ساتھ بسکٹ کا رواج چل پڑا۔

چائے کا پودا قدرتی شکل میں ۱۵ سے ۳۰ فٹ بلند ہوتا ہے۔مگر عموماً قطع و برید کر کے ۳ فٹ رہنے دیا جاتا ہے۔ پھول اس کے سفید ہوتے ہیں۔اور پتے ذرا چوڑے سے سبز رنگ ہوتے ہیں پنیری کے طور پر چائے کے پودے ۶ سے ۱۸ انچ کے فاصلے پر لگائے جاتے ہیں۔تین سال کی عمر میں پودا جوان ہو جاتا ہے اور عموماً ۲۵ سے ۵۰ سال عمر پاتا ہے۔

چائے کے ذائقے کا انحصار موسم زمین اور آب وہوا پر ہوتا ہے تازہ پتوں کو ہاتھوں سے توڑ کر ۱۸ سے ۲۴ گھنٹے تک دھوپ میں سکھاتے ہیں پھر ہاتھوں سے خوب مسلتے ہیں۔اس وقت ہندوستان دنیا میں سب سے زیادہ چائے پیدا کرتا ہے یعنی تمام دنیا کا ۱/۳ حصہ باقی ۲/۳ حصہ سیلون ، جاپان، انڈونیشیا، فارموسا، جارجیا آذربائیجان اور بحر اسود کے کچھ علاقے پیدا کرتے ہیں۔

اصل آرٹ چائے کا تیار کرنا ہے۔جاپان میں گھر بیٹیاں تین سال کا ایک کورس پاس کرتی ہیں۔ چائے کو تیار کرنے میں پانی چائے اور چینی وغیرہ کا حسین امتزاج، چائے کے برتنوں کی صفائی، نفاست، سلیقہ اور موقع محل کے مطابق موزوں الفاظ اور خود صاحب خانہ کا ذوق سلیم اور خلوص بھرا انکسار شامل ہونا نہایت ضروری ہے۔انگریزی میں کہتے ہیں۔

مختلف ممالک میں چائے پینے کے مختلف طریق ہیں۔چائے کے وطن میں چائے ہر جگہ ہر موقع پر پیش کی جاتی ہے۔مگر بغیر دودھ کے اور وہ بھی نمکین، خصوصاً سبز چائے تو نمکین ہی مزہ دیتی ہے۔

بعض لوگ چائے بھی گھی ڈال کر پیتے ہیں تاکہ خشکی نہ کرے، بعض چھوٹی الائچی ضرور ڈالتے ہیں بعض لوگ چائے کو ٹھنڈی کر کے برف ڈال کر پیتے ہیں۔لاہور کے گاڑی بان اور مزدور چائے میں بہت سا دودھ ڈال کر گڑ کا بڑا ڈھیلا ڈال دیتے ہیں۔اور اسے خوب پکنے دیتے ہیں۔ایک ڈرائیور چائے بھی ہوتی ہے۔یہ بہت Strong چائے ہوتی ہے۔اور چینی بھی پنجاب کے معیار کے مطابق ہوتی ہے۔اس سے نیند اڑ جاتی ہے۔اور انسان اپنے آپ کو چست محسوس کرتا ہے۔

آجکل جتنی چائے انگلستان میں استعمال ہوتی ہے۔وہ ایک ریکارڈ ہے۔اگر خوانخواستہ کسی آسمانی حادثہ سے چائے مہیا ہونی بند ہو جائے تو امریکن اور فرنچ لوگ تو محسوس نہیں کریں گے۔مگر انگریز تو زندہ ہی مر جائیں گے۔نہ کوئی کام کر سکے گا۔نہ سوچ سکے گا، انگریزوں کو سمجھنے کے لئے چائے کو سمجھنا چاہیئے۔یعنی چائے اس طرح پینی چاہیئے۔جس طرح یہ قوم پیتی ہے یعنی گرما گرم تازہ تیز دودھ والی اور میٹھی اور وہ بھی دن میں کئی مرتبہ۔ہسپتال کی نرسوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دن میں کم از کم ۲۰ مرتبہ چائے پیتی ہیں تاکہ بدن میں چستی محسوس ہو۔

ڈاکٹر جانسن جو موجودہ انگریزی ادب کا بابا آدم ہے۔کے متعلق لکھا ہے۔

اس کی بڑے حجم کی چائے دانی آج تک کیمبرج یونیورسٹی میں سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔وہ لکھتا ہے کہ۔

جونہی میں چائے خانے میں قدم رکھتا ہوں تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں تفکرات سے آزاد ہو گیا ہوں، ایک طرح کا امن اور سکون محسوس ہونے لگتا ہے۔

انگریز کے نزدیک چائے خانہ وہی بہتر ہے جہاں موٹے موٹے شہتیروں کی چھت ہو چھینٹ کے پردے ہوں اور خود ساقی گول مٹول، ہنس مکھ، خوش مذاق اور نقرہ باز ہو چائے خانہ میں سلجھے ہوئے دوستوں کی مجلس ہو، جہاں علمی ادبی سیاسی، شکار، فٹ بال اور کرکٹ پر مہذب گفتگو ہو انگلستان میں چار چیزوں کی پرستش کی حد تک عظمت پائی جاتی ہے۔شاہی خاندان ونڈسر کیسل، کرکٹ اور فٹ بال، چائے

غور کا مقام ہے کہ بوسٹن میں چائے نے انگریزی حکومت کو گنوایا۔مگر ہندوستان میں چائے نے حکومت کو استواری بخشی، اب تو ہمارے ملک میں بھی یہ عوامی امرت بن گئی ہے، تھکے ماندوں کا علاج، بجھے ہوئے دلوں کو بیدار کرنے والی فرح بخش، سکون بخش سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچانے والی، جس طرح پہلے پتھر کا زمانہ دھات کا زمانہ ہوتا تھا۔آج کل چائے کا زمانہ ہے چاہے آج کل عروج پر ہے۔مگر ہر کمالے را زوالے کو بھی مدنظر رکھا جائے تو عین ممکن ہے کہ آئندہ ہونے والی ایٹمی جنگ میں اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔اس وقت میرا بھی چائے کا وقت ہو گیا ہے۔لہٰذا اب رخصت چاہتا ہوں۔

انشاءاللہ پھر کبھی Over a cup of tea ملیں گے۔اتنا عرصہ آپ بھی چائے کی پیالی میں طوفان

(ہفت روزہ جوبلی)

نمک

یوں تو اللہ تعالےٰ نے انسان کے لئے بے شمار نعمتیں مہیا فرمائی ہیں مگر نمک ہماری زندگی کا نہایت اہم جزو ہے۔جو امیر اور غریب سب کی صحت اور عام چستی کو برقرار رکھنے کے علاوہ خوراک کو مزیدار بناتا ہے۔عام نمک جس کا کیمیائی نام سوڈیم کلورائڈ (nacl) ہے۔دو شکلوں میں ملتا ہے،یعنی چٹانی نمک کی صورت میں اور سمندری نمک کی صورت میں۔

چٹانی نمک،وہ ہے جو قدرت نے پاکستان کو وافر طور پر عنایت کیا ہے،سمندری نمک سمندر کے کنارے ریت یا چھوٹی چھوٹی ڈلیوں کی صورت میں پایا جاتا ہے یا سمندر کے پانی کو آگ پر گرم کر کے جو تہہ نشین مادہ رہ جاتا ہے۔وہ نمک ہوتا ہے۔بھارت والوں کو چٹانی نمک میسّر نہیں ہے چٹانی نمک عموماً بے رنگ ہوتا ہے۔تاہم سُرخ زردی مائل اور بھورے رنگ کا بھی عام طور پر ملتا ہے۔وسط افریقہ۔تبت وغیرہ ممالک میں یہ نمک بطور اعلیٰ تحفہ کے پیش کیا جاتا ہے یعنی ممالک میں زرِمبادلہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

قدرت نے بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کے پانی میں نمک باقی سمندروں کی نسبت زیادہ رکھا ہے۔ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سالٹ لیک سے نمک نکالا جاتا ہے۔بھارت میں جھیل سانبھر راجپوتانہ سے بھی نکلتا ہے۔

رومی قوم کے عروج کے زمانہ میں سپاہیوں کو تنخواہ کے عوض نمک دیا جاتا تھا۔اور اس کو اصطلاح میں (usne salari) کہتے تھے آجکل انگریزی لفظ salary یعنی تنخواہ یا روزینہ اسی سے نکلا ہے۔

قدیم سے نمک دوستی کا ایک نشان سمجھا جاتا ہے۔الفاظ نمک حلال،نمک خوار،نمک پروردہ وغیرہ اسی سے نکلے ہیں۔سورۂ ہود آیت ۶۹ میں حضرت ابراہیمؑ کے دو مہمانوں کا ذکر ہے۔جب حضرت ان کے لئے بھنا ہوا گوشت لے کر آئے تو انہوں نے نہ کھایا تو آپ ڈر گئے کہ یہ ہمارا نمک نہیں کھاتے کوئی دشمن ہی نہ ہوں۔آخر ان مہمانوں نے واضح طور پر بتایا تو خوف دُور ہوا۔کیونکہ تمام دنیا میں دستور ہے کہ اگر کسی شخص کے گھر کا نمک کھالیں تو پھر اس سے غداری یا بیوفائی کرنا صرف کمینوں کا کام ہے۔ایسے ہی موقعہ پر فارسی محاورہ ہے کہ۔

نمک خوردن و نمک داں شکستن

کوہستان نمک کھیوڑہ ضلع جہلم سے عرصہ دراز سے نمک نکالا جارہا ہے اور یہ قدرتی خزانہ انشاء اللہ بہت دیر تک چلے گا۔انگریزوں کی آمد کے وقت جس قدر نمک ایک دن میں نکلتا تھا اس پر دو پیسے (اسی زمانہ کے آج کے نہیں) فی من کے حساب سے رائلٹی اس بیوہ مسلمان عورت کو دی جاتی تھی جو دراصل اس خطہ کی مالکہ تھی اور اسکے بیٹے امیر کبیر ہوکر ''راجہ'' کہلاتے تھے مگر آہستہ آہستہ انگریز (جو بدعہدی میں مشہور ہیں) نے وہ رقم بند کردی اور اسکے

بیٹے غریب ہو کر انہی کانوں میں مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے تھے ہندوستان میں انگریزوں نے سمندری نمک پر بھی ٹیکس لگا دیا تھا۔ جس کے خلاف سب سے پہلے گاندھی جی نے آواز اٹھائی اور ڈالڈی علاقہ بمبئی جا کر مع اپنے ۸۰ ہمراہیوں کے نہ صرف سمندر کے کنارے پڑا نمک اٹھالیا بلکہ وہیں پر سمندر کے کنارے چولہے پر پانی رکھکر اسے اڑا دیا اور نمک بنایا۔ گورنمنٹ نے اپنے رائج الوقت قانون کے ماتحت ان سب کو گرفتار کر لیا۔ تمام علاقہ میں لوگوں نے نمک سازی شروع کر دی آخر لارڈ اروِن وائسرائے نے یہ قانون ختم کر دیا۔ انہی دنوں کسی نے یہ شعر لکھا تھا۔

سب زخم میرے شور جراحت سے بھر گئے
گاندھی پے نمک جو گئے جیل خانے میں

اسی زمانہ میں ایک ذہین لڑکے نے تاریخ کے پرچے میں گاندھی پر نوٹ لکھتے ہوئے یہ فقرہ لکھا تھا۔ کہ یہ ''شخص اپنا نمک بنا کر کھاتا ہے''۔

جب انگلستان کے بادشاہ ہنری دوم کی دشمنی آرچ بشپ آف کنٹربری ٹامس بیکٹ سے حد کو پہنچ گئی تو اس نے ایک نمکین فقرہ کہہ کر اسے قتل کرا دیا۔

Is there none of my servants who eat my salt to rid me of this trubulent priest?

اس پر چار رئیس اُٹھے اور جا کر بیکٹ کو کنٹربری سے گرجا کے اندر قتل کر آئے۔

جب ہمایوں کے ایک توپچی رومی خاں نے بغاوت کی اور وہ پکڑا گیا تو بادشاہ کے پالتو طوطے نے اُسے دیکھ کر کہا تھا ''پھٹ پاپی رومی خان نمک حرام'' یعنی تم نے اپنے آقا کا نمک کھا کر غداری کی ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب داغ دہلوی بے سروسامان ہو کر رام پور پہنچے۔ تو نواب کلب علی خاں نے ان کی بڑی قدر کی انہوں نے حق نمک ادا کرنے کیلئے مدح میں ایک مثنوی لکھی جس میں وہ لکھتے ہیں۔

ہے عجب شہر مصطفےٰ آباد
اس کو رکھیو مرے خدا آباد
سب اسے رام پور کہتے ہیں
ہم تو آرام پور کہتے ہیں

اور آگے جا کر لکھتے ہیں۔

گر نمک خوار حیلہ گر نکلے
تو نمک پھوٹ کر نکلے

جن دنوں سر عبدالقادر انڈیا کونسل کے ممبر تھے۔انہوں نے جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کولندن بلوایا۔وہاں پر ایسے بے شمار ہندوستانی تھے۔جو حسن فرنگ کے متوالے ہوکر وہیں کے ہو چکے تھے اور وطن کا نام نہ لیتے تھے۔تو حفیظ نے ایک ایسی نظم لکھی جس کا عنوان ہے۔''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔''

اس میں ان لوگوں کو مخاطب کر کے لکھا کہ انگریزوں کا حسن بھی کوئی حسن ہے حسن وہی بہتر ہے جو ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔

اس حسن میں ہے ہلکا نمک بھی
مَے کا نشہ بھی لُطف گزک بھی

اور اس شعر کا تو جواب نہیں ہے۔

معشوقِ بے نمک کو کوئی پوچھتا نہیں
حسن ملیح کے ہیں نمک خوار سینکڑوں

یہ لڑکا آج کل ربوہ میں ایک مقتدر ہستی ہے۔

حافظ شیرازی نے بھی ایسے ہی حسن سے متاثر ہو کر کہا ہے کہ۔

اے پیکِ بے خجستہ چہ نامی فَدَیتُ لک
ہرگز سیاہ چُردہ نہ دیدم بایں نمک
خوباں سزدکہ بردَرَتُ آئند جُملگی
وانگاہ خاکِ پائے تو بوسندیک بیک

اردو شاعری نے بھی نمک کو لازوال بنا دیا ہے مثلاً ذوقؔ!

دیں گے جاں بوسۂ لعلِ نمکیں پر ہم بھی
جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمک خواروں کا
جتنا ہے نمک سب مرے زخموں میں کھپاؤ
پلکوں سے اٹھا دے نہ ہاتھوں سے گراؤ

کہتے ہیں کہ قیامت کے دن نمک ضائع کرنے کا علیحدہ حساب ہوگا خدا کہے گا کہ اب پلکوں سے اٹھاؤ۔

فارسی محاورہ جو عام گفتگو میں استعمال ہوتا ہے۔

''ہرکہ در کانِ نمک رفت نمک شُد''

اور عربی کا محاورہ بھی ہے۔

المذاح فی الکلام کالملح فی الطعام

حلوائی کی دکان پر بے شمار مٹھائیاں ہوتی ہیں۔ مگر نمک پاروں کا اپنا ہی مقام ہے ایک کہانی مشہور ہے کہ ایک راجہ کی سات بیٹیاں تھیں اس نے ہر ایک سے پوچھا تم کو مجھ سے کتنا پیار ہے۔ ایک نے کہا آپ اتنے میٹھے ہیں جتنا شہد۔ کسی نے کہا قند کے برابر میٹھے ہیں اور ساتویں نے کہا آپ مجھے نمک کی طرح پیارے ہیں۔ راجہ نے نمک کا نام سنکر اظہار ناراضگی کیا اور اسے گھر سے نکال دیا وہ جنگل میں چلی گئی وہاں کسی اور راجہ نے اسے دیکھکر شادی کر لی۔ آخر ایک دن اسکا باپ کہیں بھول کر ان کے ہاں جا نکلا۔ تو اس لڑکی نے سب کھانے میٹھے پیش کئے راجہ کہنے لگا کہ کوئی چیز نمکین بھی ہوتی تو اچھا ہوتا۔ اس پر وہ پردے سے نکلکر سامنے آگئی اور کہا۔ اب کیوں نمک یاد آیا ہے؟ راجہ نے اسے پہچان لیا اور بہت شرمندہ ہوا۔ اور پھر اس لڑکی سے صلح صفائی ہوگئی۔

جب اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کو انگریزوں نے مٹیا محل کلکتہ میں قید کر دیا تو اس گئی گذری حالت میں بھی حکم تھا کہ روزانہ ایک من نمک کا ٹکڑا منگوا کر اُسے اتنا دھویا کرو کہ اس کے اندر سے صرف ایک چھٹانک کے برابر رہ جائے تو وہ ہمارے خاصہ میں استعمال ہو۔

نمک سے بے شمار محاورے بنے ہیں۔ نمک پاش ہونا۔ نمک حلال۔ نمک حرام۔ حق نمک ادا ہونا دہلی میں مسجد فتح پوری شہر کے بیچ میں بڑی عالیشان مسجد ہے اس کے سامنے ایک حویلی نمک حرام کی حویلی کہلاتی ہے اس کا مالک سیٹھ بھوانی شنکر تھا اس نے اپنے آقا سے نمک حرامی کر کے یہ عظیم الشان حویلی بنوائی تھی۔ قدرت کا تماشا دیکھیں کہ بھوانی شنکر کو ایک حجام نے حجامت بناتے ہوئے استرے سے شہ رگ کاٹ کر مار ڈالا۔

اور حضرت بیدؔم وارثی کا حسب ذیل شعر جو انکے صاحبزادے مکرم محترم ایاؔز وارثی صاحب نے مجھے ایک خط میں بطور تبرک بھجوایا ہے تو فی الواقع کانِ نمک ہے۔

اے نمک پاش! تجھے اپنی ملاحت کی قسم
بات تو جب ہے کہ ہر زخم نمکداں ہو جائے

آجکل جبکہ چینی کمیاب ہوگئی ہے صرف نمکین باتیں ہی کرتے چلا جانا بھی کچھ بدمذاقی ہوگی اس لئے ختم کرتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ چینی اور نمک کا اپنا اپنا مقام ہے۔ فقط:۔

(ماہنامہ خالد دسمبر ۱۹۷۴ء)

صحرائے اعظم افریقہ

صانع قدرت نے عجائب خانہ دنیا کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔تین حصے پانی ہے اور ایک حصہ خشکی آگے پھر تین حصے ہے یعنی میدان، پہاڑ اور صحرا۔جغرافیائی لحاظ سے دنیا کے سات براعظم ہیں اور آٹھ صحرا۔

(۱)صحرائے گوبی (چین میں) (۵)صحرائے کالاہاری (جنوبی افریقہ)

(۲)صحرائے راجپوتانہ (ہندوستان میں) (۶)صحرائے اٹے کاما (جنوبی امریکہ)

(۳)صحرائے عراق وعرب (۷)صحرائے نواڈا (شمالی امریکہ)

(۴)صحرائے اعظم (شمالی افریقہ) (۸)صحرائے جنوبی آسٹریلیا۔

صحرا کی تعریف لغت کی رُو سے ویرانہ، بے آب وگیاہ جنگل، دشت، بیابان ہے محاروہ میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں کے دماغ میں صحرا ہے۔یعنی وہ سوجھ بوجھ سے فارغ ہے۔

صحرائے اعظم ایک وسیع وعریض خطہ ہے جس میں صحرا، پہاڑ، پتھریلا علاقہ اور جھاڑیاں ہیں۔ یہ شرقاً غرباً ۲۲۰۰ میل ہے اور ۸۰۰ سے لیکر ۱۴۰۰ میل عریض ہے۔صحرائے اعظم کو قدرتی طور پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) بعض ایسے حصے ہیں جو سطح سمندر سے نیچے واقع ہیں۔

(۲) صحرا کے عین بیچ میں ۸۸۰۰ فٹ بلند پہاڑ ہے۔جس پر کبھی کبھی برف بھی پڑتی ہے۔

(۳) نصف کے قریب صحرا ۱۰۰۰ افٹ بلند سطح مرتفع ہے۔

(۴) اسمیں بے شمار نخلستان بھی ہیں۔

(۵) ریتلا ولق ودق علاقہ۔

اصل صحرا کوہ اطلس کی جنوبی سطح مرتفع سے لیکر دریائے نائجر تک ہے۔اس میں باریک سفید ریت کے خطے ہیں۔اور ایسے علاقے بھی ہیں جہاں سوائے کنکریوں کے کچھ نہیں ہے۔وسطی علاقہ میں کبھی کبھی بارش بھی ہوتی ہے۔ جہاں جہاں نخلستان واقع ہیں وہاں کی سرزمین سے اچھا پانی نکل سکتا ہے۔ جو پینے اور زراعت کیلئے اچھا ثابت ہوا ہے۔صحرا میں زیر زمین دریاؤں کا ایک ڈھانچہ موجود ہے۔مگر یہ دریا ریت میں ہی گم ہوکر رہ جاتے ہیں۔Artislan wells بھی کام دے سکتے ہیں۔مگر سوال یہ ہے کہ اس قدر اخراجات کون برداشت کرے؟ کیونکہ اکثر آبادی تو خانہ بدوشوں کی ہے۔جو پیہم رواں دواں رہتے ہیں۔

جون۔جولائی اور اگست کے مہینے سخت گرم ہوتے ہیں اور تھرمامیٹر ۱۳۲ سے بھی اوپر نکل جاتا ہے مگر وسطی سطح

مرتفع میں نسبتاً ٹھنڈک ہوتی ہے۔اس علاقہ میں اکثر شمال مغربی تجارتی ہوائیں چلتی ہیں۔

پیداوار:۔صحرا میں جہاں جہاں نخلستان ہیں وہاں کھجور خوب پیدا ہوتی ہے۔بقدر ضرورت سبزی بھی اُگا لیتے ہیں۔چٹانی علاقوں میں کہیں کہیں کیکر کا درخت بھی ملتا ہے۔بعض پودے خلاقِ اعظم کی قدرتِ کاملہ کا عجیب نمونہ ہیں یعنی اُن کے پتوں پر بال سے ہوتے ہیں جو تھوڑی سی نمی کو بھی جذب کر کے درخت کیلئے آبِ حیات مہیا کرتے ہیں۔بعض پودے ایسے پائے جاتے ہیں جن کی جڑیں معمول سے بہت زیادہ گہری ہوتی ہیں اور بعض درخت تو پانی کی ایک بوند کے انتظار میں برسوں زندہ رہتے ہیں۔

جانور۔صحرا میں ہرن،غزال،گیدڑ،لومڑ،خرگوش،جنگلی چوہے اور چمگادڑیں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔کوہ اطلس کے دامن میں شتر مرغ۔عقاب اور بٹیر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔نخلستانی علاقوں میں بطخ اور بگلے وغیرہ بھی ملتے ہیں۔جنگل میں پھن دار سانپ چھپکلیاں وغیرہ پائی جاتی ہیں۔جانب غرب دلدلوں میں مگرمچھ بھی ہوتا ہے۔البتہ شیر اب نایاب ہو گیا ہے۔

آبادی۔کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں صحرا گھاس کا ایک خطہ ہوتا تھا۔اور اسمیں آبادی بھی بہت ہوتی تھی۔اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ بعض چٹانوں پر اب بھی ایسی تصاویر نقش ہیں جن میں دکھایا گیا ہے کہ سینکڑوں آدمی ایک بہت بڑے ریوڑ کو ہانکے جا رہے ہیں۔انہی نقوش میں بعض ایسے جانوروں کی تصاویر بھی ملتی ہیں جو اب نایاب ہیں۔بعض چٹانوں کے دامن سے پُرانے زمانہ کے دبے ہوئے لوہے کے اوزار بھی ملے ہیں۔

یہ تو مسلّم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں کی اولاد موجودہ دنیا میں آباد ہے۔

(۱) سامؔ کی اولاد یورپ،امریکہ،ترکی،فلسطین،ایران،عرب اور ہندوستانی لوگ ہیں۔انکے سفید یا گندم گوں رنگ بلند پیشانی۔سیدھے لمبے ناک۔ان کے امتیازی نشان ہیں۔

(۲) حامؔ کی اولاد حبشی نژاد لوگ ہیں جنکے بال گھنگریالے۔کالا رنگ۔چپٹی ناک اور ہونٹ بہت موٹے ہیں۔

(۳) یافثؔ کی اولاد چینی اور جاپانی ٹائپ کے لوگ ہیں۔اور صحرا کے باشندے تمام تر حامؔ کی اولاد ہیں۔

قبیلہ طوارغ۔وسطِ صحرا میں ایک قبیلہ طوارغ نامی پایا جاتا ہے۔یہ یہاں کے اصل باشندے ہیں۔یہ لوگ ہر وقت اپنا چہرہ گہرے نیلے رنگ کے نقاب سے ڈھانپ کر رکھتے ہیں۔اپنی آنکھوں کے نیچے نیلے رنگ سے گہرے حلقے بناتے ہیں۔ان نقابوں کی وجہ سے ان کے چہرے اور بھی خوفناک معلوم ہوتے ہیں غالباً دھوپ سے بچنے کیلئے یہ نقاب پہنتے ہیں ان لوگوں کی زبان تماچق ہے جو لکھنے کے کام بھی آتی ہے۔

ان لوگوں میں دو طبقے ہوتے ہیں امیر اور غریب۔امیر کام کرنا گناہ جانتے ہیں تمام کام غریب ہی کرتے ہیں۔یہ خانہ بدوش لوگ اپنے اپنے ریوڑ لیکر جگہ بجگہ گھومتے رہتے ہیں۔اُونٹ کا دودھ پی کر گزارہ کر لیتے ہیں۔کوئی خاص ضرورت ہوئی تو شہروں میں جا کر ایک بکری فروخت کی اور وہ پوری کر لی۔یہ لوگ نہایت صاف ستھرے

اور اُجلے رہتے ہیں اسی واسطے صحت مند بھی ہوتے ہیں۔اس زمانہ میں بھی پرانی طرز کی تلواریں لٹکائے پھرتے ہیں۔ہرن کی کھال سے نہایت اعلیٰ قسم کی ڈھال بناتے ہیں۔سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ لوگ چمچہ سے کھاتے ہیں۔

ان خانہ بدوشوں میں چائے کا بھی رواج عام ہے۔اگر مہمان تین کپ سے کم پئے تو اس بات کو میز بان کی ہتک سمجھتے ہیں اور اگر زیادہ پئے تو مہمان کو حریص سمجھا جاتا ہے۔

مرکزی شہر۔اگر صحرا نوردوں کا بھی کوئی مرکزی شہر ہوسکتا ہے تو ان لوگوں کا دارالخلافہ تمانرست ہے۔ جو دو ہزار باشندوں کی بستی ہے نہ تو یہاں کوئی ہسپتال ہے نہ تارگھر نہ ڈاکخانہ ٹیلی فون نہ بنک۔البتہ یہاں بجلی ضرور ہے۔وہ مقامی طور پر پیدا کی جاتی ہے اور صرف شام کے چھ بجے سے نو بجے تک مہیا کی جاتی ہے۔یہاں پر ایک سرائے اور ہوٹل بھی ہے۔

تجارت۔یوں تو کسی شخص کو کیا غرض پڑی تھی کہ صحرا کی جھلس دینے والی دھوپ میں اشیائے فروخت لے کر آئے۔مگر خدا تعالیٰ آخر اپنی اس مخلوق کو بھی رزق مہیا کرتا ہے۔اس لئے یہاں کے باشندے یہاں سے کھجوریں باہر بھجواتے ہیں۔چٹانی علاقوں میں کیکر کی گوند کافی پیدا ہوتی ہے۔تیسرے ہاتھی دانت بھی مل جاتا ہے۔چوتھے چٹانی نمک کثرت سے باہر جاتا ہے۔ان اشیاء کے بدلے میں دیگر ضروریات زندگی مل جاتی ہیں۔بھیڑ بکریاں اور اُونٹ بھی بکتے ہیں۔صحرا کی مشہور منڈی ٹمبکٹو ہے۔اب تو ان نخلستانوں میں ہوائی جہاز کے ذریعہ تازہ سبزیاں۔اخبارات۔پھل وغیرہ پہنچ جاتے ہیں۔

ذرائع آمدورفت۔صحرا کو عبور کرنے کا اصل ذریعہ تو اُونٹ ہی ہیں۔مگر ۱۹۲۰ء سے لاریاں بھی چلنے لگی ہیں۔آجکل جیپ اور ہوائی جہاز بھی عام ہوگئے ہیں۔اُونٹوں کے قافلے اب بھی اپنے مقام کو سنبھالے ہوئے ہیں، صرف مشکل یہ ہے کہ اونٹ اور اس کے مالک کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں ہوسکتے۔کیونکہ اونٹ کا کینہ مشہور خلائق ہے۔

چونکہ باقاعدہ سڑک یہاں پر کوئی نہیں ہے۔اس لئے عموماً اپنی یادداشت کے سہارے میں راہبر چلتے ہیں۔کبھی کبھی بھٹک ہی جاتے ہیں۔مگر صحرا میں بستیاں موجود ہیں وہاں سے راستے پوچھکر پھر چل نکلتے ہیں۔

بس سروس میں خرابی یہ ہے کہ اگر انجن میں خرابی ہوجائے تو کئی کئی دن وہیں ٹھہرنا پڑتا ہے۔عموماً یہ ہوتا ہے کہ ریڈیو کے ذریعہ دُوسرے مقام کو خبر دے دی جاتی ہے اگر موٹر بروقت نہ پہنچے تو اُدھر سے تلاش کرنیوالے چل پڑتے ہیں۔اور خطرہ ٹل جاتا ہے۔

صحرا میں تین قسم کی سرزمین ہوتی ہے۔خالص ریت کے تودے۔چٹانی علاقہ اور جھاڑیوں کا جنگل۔صحرا کے لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔مسافروں کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں۔لاری والے بھی احتیاطاً اپنے ہمراہ

لکڑی کے لمبے لمبے تختے جالی دار آہنی چادریں۔ کدالیں وغیرہ رکھتے ہیں۔ اگر لاری ریت میں دھنس جائے تو یہ ہتھیار خوب کام دیتے ہیں۔

ایک انگریز سیاح نے بڑے مزے کی بات لکھی ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو۔ اُونٹ کی جگہ لینے والی کوئی سواری نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اوّل تو پٹرول کا خرچ بہت آتا ہے۔ دوسرے موٹر یا جیپ ریت کے تودوں میں سے تو گذر نہیں سکتی۔ تیسرے اُونٹ کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ جیپ تو کھائی بھی نہیں جاسکتی!

صحرا میں رومن کیتھولک عیسائیوں نے ۱۸۴۷ء سے ایک مشن قائم کیا ہوا ہے۔ خانہ بدوشوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ مگر پادریوں کو یہ بھی اقرار ہے کہ ان لوگوں عیسائی بنانا نہایت مشکل امر ہے۔ کیونکہ ان کے دلائل سے وہ قائل نہیں ہوسکتے۔

تمانرست کے فرنچ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ آج تک تو یہاں پر کینسر۔ اپنڈے سائیٹس اور تپدق کا نشان تک نہیں ہے۔ مگر یورپین آبادی اپنے ہمراہ اب لے آئے تو لے آئے۔

(ماہنامہ خالد جنوری ۱۹۶۲ء)

کویت............بے شمار دولت اور پریشانیاں

الہ دین کے روایتی چراغ نے اس قدر دولت پیدا نہ کی ہوگی۔ جس قدر کویت واقع عرب کے زیرِ زمین تیل کے چشموں سے گذشتہ بارہ سال میں جمع ہو چکی ہے۔۱۹۴۶ء سے قبل عرب کے اس دور افتادہ گوشہ کو دنیا میں کوئی جانتا تک نہ تھا۔مگر تیل کے سیلاب عظیم نے حالات میں یکا یک تغیر پیدا کر دیا۔کویت کا رئیس جو قبل ازیں چیتھڑے لٹکائے پھرتا تھا۔اب انبار در انبار دولت کا مالک ہے۔اور وہ بے چارہ سمجھ نہیں سکتا کہ اسے کس مصرف میں لائے۔

سرزمین عرب کا یہ شمال مشرقی گوشہ جس کا رقبہ محض ۶۶۰۰ مربع میل ہے ۱۹۴۶ء تک بمشکل اپنی ایک لاکھ آبادی کو سنبھال سکتا تھا۔ان دنوں اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ چند پرانی طرز کی بادبانی کشتیاں تھیں۔جو خلیج فارس سے موتی نکالا کرتی تھیں مگر اس محنت کو بھی یورپ کی مصنوعی موتی بنانے کی کاریگری نے مفلوج کر دیا تھا۔

آج کویت کی دولت کا اندازہ اربوں میں لگایا جاتا ہے۔سالانہ آمد ۲۰ ارب روپیہ۔دنیا میں تیل پیدا کرنے والوں خطوں میں آج کویت کا مقام چوتھا ہے۔مشرق اوسط کی حکومتوں میں کویت کے رئیس کی آمد سب سے زیادہ ہے فی کس اوسط آمد ۲۰۰۰ ڈالر ہے (ڈالر=۵ روپے) یہ تمام دولت عملاً ایک شخص کے خزانے میں جمع ہوتی ہے۔جو گذشتہ دو سو سال سے خاندان مصباح کا سردار ہے) یہ قدیم قبائلی طرز کی گمنام ریاست تھی۔مگر دولت کی فراوانی نے اسے آج بیسویں صدی سے ٹکرا دیا ہے۔کثیر دولت کے ظاہری نشانات موٹر کاریں۔ٹیلی فون۔پختہ تارکول کی سڑکیں۔جدید طرز کے خوشنما ہوٹل، سینما۔ایرکنڈیشنڈ عمارتیں۔اور ہائی سکول وغیرہ ہیں۔اس سوشل انقلاب اور بے شمار دولت کی آمد نے تمام دنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی بے شمار خطرات بھی لاحق ہو گئے ہیں۔جو کسی دن نہ صرف کویت کو بلکہ تمام امن عالم کو اپنی خطرناک لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔

شیخ کویت۔۔۔سر عبداللہ السالم الصباح تقریباً ۶۶ سال کے پیٹے میں ہیں خوب لکھے پڑھے اور بڑے علم دوست آدمی ہیں۔باوجود اس قدر امیر کبیر ہونے کے وہ اپنی عادات کے لحاظ سے بڑے سادہ ہیں۔ان کی ایک بیوی ہے اور ایک ہی کیڈلک کار ہے اپنی رعایا کو اپنے بچوں کی طرح خیال کرتے ہیں۔بہت خدا ترس آدمی ہیں اس بے شمار دولت کو وہ خدائی امانت تصور کرتے ہیں اور جس محل میں رہتے ہیں وہ قدیم کچا محل ہے۔شیخ نے ہر ممکن طریق سے اپنے پڑوسیوں (عراق اور سعودی عرب) سے ہمیشہ صلح رکھی ہے مگر دولت کے اس بے پناہ ریلے نے ریاست کے اندر کچھ تخریبی عنصر بھی پیدا کر دیا ہے۔جس کو کچھ شہ فلسطین کے مہاجرین نے دی۔اور مزید ترغیب جمال عبدالناصر کے بھجوائے ہوئے مصری سکول ماسٹروں نے دی۔رہی سہی کسر ان غیر ملکی کاریگروں نے نکال دی۔جو کویت کے بے شمار مختلف قسم کے کارخانوں میں کلیدی آسامیوں پر کام کر رہے ہیں۔یہ تمام لوگ یہاں کی پسماندہ

اور سادہ لوح آبادی کو نئے نئے خیالات سے اکساتے رہتے ہیں۔ چنانچہ انتظام قائم رکھنے کیلئے شیخ کو ۲۴۰۰ جدید قسم کے اسلحہ سے مسلح فوج کے علاوہ ۱۰۰۰ پولیس بھرتی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں یہاں پولیس کا نام بھی نہ تھا۔

کویت کے ان تیل کے چشموں کا ٹھیکہ۔ شیخ موصوف نے ایک امریکن۔ انگلش کمپنی کو دے دیا ہوا ہے۔ جو آپس میں نصف نصف کے حصہ دار ہیں۔ آج سے ۵۹ سال قبل جب شیخ کے آباء نے ترکی کی حکومت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا تو برطانیہ کی عقابی نظروں نے اس نحیف شکار کو تاکا اور ''حفاظت'' کے بہانے اپنا اثر و رسوخ جمانا شروع کیا ہے آج برطانیہ اپنی تیل کی تمام ضروریات کا نصف کویت کے چشموں سے پورا کر رہا ہے۔ اور کویت کی انبار در انبار دولت انگلستان کے مختلف بنکوں میں محفوظ ہے۔ جس کی بدولت خود انگلستان کی ساکھ دنیا کی منڈیوں میں بہت مستحکم ہو گئی ہے۔

اپنی رعایا کے حق میں سر عبداللہ ایک مثالی حکمران بننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بہبودی کیلئے گذشتہ پانچ سالوں میں انہوں نے ۲۶۷ ملین ڈالر (ملین = دس لاکھ) خرچ کئے ہیں۔ جو پاکستانی لحاظ سے ۳۳،۵۰،۰۰۰۰۰ روپے بنتے ہیں۔ تمام کویت میں جابجا پختہ تارکول کی سڑکیں بنوائی گئی ہیں۔ دو رویہ درخت نصب کرنے کی مہم بھی جاری ہے جہاں پہلے سڑکوں پر گدھوں کے سوا کچھ نہ پھرا کرتا تھا۔ آج کل نہایت جدید قسم کی امریکن کاریں بھاگتی نظر آئیں گی۔ تمام آبادی کو سیراب کرنے کیلئے میٹھے پانی کے واٹر ورکس بنوائے گئے ہیں۔ سمندر کے پانی کو جدید طرز کی مشینوں کے ذریعہ میٹھا بنا دیا جاتا ہے۔ جو پمپوں کے ذریعہ شہر میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس سے قبل جہاز کے ذریعہ بصرہ سے میٹھا پانی منگوایا جاتا تھا۔ اور راشن کے طریق پر تقسیم کیا جاتا تھا۔

تمام بوسیدہ اور کچے جھونپڑے گرا کر ان کی جگہ جدید قسم کے مکانات تعمیر کرائے گئے ہیں ہر منہدم شدہ جھونپڑے کی قیمت کم از کم ۵۰۰۰ ڈالر شیخ نے اپنی گرہ سے ادا کی۔ بعض جگہوں پر ایک مربع گز کی قیمت ایک لاکھ روپیہ دیکر۔ اپنے وطن کے لوگوں کو سرفراز کیا گیا۔ ترقی پسندی کے اس بے پناہ شوق میں بعض سڑکیں ایسی بھی تعمیر ہو گئی ہیں۔ جو کہیں بھی نہیں جاتیں بلکہ صحرا میں ہی مدغم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ شیخ موصوف نے ایک نہایت خوبصورت یونیورسٹی کی عمارت بھی تعمیر کرائی ہے۔ اس میں سر دست ایک ہائی سکول جاری ہے۔ جہاں پر بچوں کے تمام اخراجات کتب، فیس، خوراک لباس، طبی سہولتیں وغیرہ شیخ کویت اپنے خزانہ سے ادا کرتے ہیں لڑکیوں کیلئے علیحدہ سکول جاری ہیں۔ اگر کوئی لڑکی سلائی کا آخری امتحان پاس کر لے تو رئیس کے ہاں سے اس کو سلائی کی مشین بطور تحفہ دی جاتی ہے۔ کھیل کے نہایت صاف ستھرے میدان بنائے گئے ہیں۔ مصری اساتذہ قرآن مجید کی تعلیم کے علاوہ جدید علوم میں درس دیتے ہیں۔ جو لڑکے ہونہار اور قابل ثابت ہوتے ہیں۔ ان کو اعلیٰ تعلیم کیلئے مصر بھجوایا جاتا ہے جہاں پر شیخ کی عنایت سے ان کو اس قدر رقم فی کس ملتی ہے جو ان کے مصری اساتذہ کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔

(ماہنامہ مصباح جولائی ۱۹۵۵ء)

حرُوفِ اَبجد اَور تارِیخ گوئی

علم الاعداد ایک فن جو معدوم ہوتا جارہا ہے

خدا تعالیٰ نے بے حساب کرم فرماتے ہوئے انسان ضعیف البُنیاَن کو عقل وفہم بخشی۔ خلق الانسان وعلمه البیـــان بے شمار قسم کے علوم عطاء فرمائے جن میں سے ایک علم ریاضی ہے، یہ تو خدا کو ہی علم ہے کہ سب سے پہلے کس نے کب اور کس طرح یہ علم ایجاد کیا۔ لیکن بہر حال اس علم کو معراجِ کمال تک پہنچانے میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصّہ ہے اسی طرح الجبرا بھی مسلمانوں کی ہی ایجاد ہے۔

اسی طرح دیگر علوم وفنون میں مسلمانوں نے بڑی بڑی ایجادات کیں۔ علم وفضل کے سمندر بہائے جن سے ایک دنیا سیراب ہوئی۔ فلسفہ، منطق، ریاضی، علمِ ہئیت۔ علمِ نجوم، علمِ ساخت وغیرہا۔ علوم وفنون میں مسلمانوں کا گراں قدر حصّہ ہے۔ انہیں میں سے ایک علمِ ابجد بھی ہے۔ اس علم کی بنیاد عربی حروف تہجی ہیں۔ علمِ ریاضی کی ایک شاخ ہے اس میں عربی، فارسی، ریاضی، فنونِ لطیفہ۔ اعلیٰ دماغی قابلیتوں اور قدرے اتفاقِ حسنہ کا بھی دخل ہوتا ہے بہر حال بڑا ہی دلچسپ فن ہے۔ دانشوروں نے ہر حرف کا ایک عدد مقرر کیا ہے۔ اس کے ذریعہ کسی عبارت مصرعہ یا شعر سے کسی خاص واقعہ کا سنہ نکل آتا ہے وہ حروف یہ ہیں:۔

اب ج د، ح و ز

۱ ۲ ۳ ۴   ۵ ۶ ۷

ح ط ی، ك ل م ن

۸ ۹ ۱۰   ۲۰ ۳۰ ۴۰ ۵۰

س ع ف ص، ق ز ش ت

۶۰ ۷۰ ۸۰ ۹۰   ۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۴۰۰

ث خ ذ، ض ظ غ

۵۰۰ ۶۰۰ ۷۰۰   ۸۰۰ ۹۰۰ ۱۰۰۰

مندرجہ بالا تمام حروف جن کے اعداد مقرر کئے گئے ہیں حروفِ تہجی ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر آپ یہ محسوس کریں گے کہ ان حروف میں اردو کے سات حروف غائب ہیں۔ یعنی پ، ٹ، چ، ڈ، ڑ، گ اور ء

علمِ ابجد میں ء کا عدد الف کے برابر ہے۔ پ، ٹ، ث، ڈ اور گ علی الترتیب ب، ت، ج، د اور ک کے اعداد رکھتے ہیں۔ اب آپ آسانی کے ساتھ کسی بھی نام کے حروف کو الگ الگ کر کے ان کے سامنے اس حرف کا عدد لگا کر

میزان کرلیں تو جو مجموعہ نکلے وہ اس نام کے پورے اعداد ہوں گے۔اسی طریق پر پرانے لوگ بچوں کے تاریخی نام رکھا کرتے تھے۔مثلاً ہماری جماعت کے مشہور شاعر حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکملؓ مرحوم کے والد حضرت مولوی امام الدینؓ مرحوم کا تاریخی نام ''چراغ دین'' تھا یعنی اس نام کے تمام حروف کے اعداد کا مجموعہ جو ۱۲۶۸ بنتا ہے یہ ہجری سنہ کے لحاظ سے آپ کا سنِ پیدائش ہے۔

بعض اور مثالیں اس سلسلہ میں مزید دلچسپی کا باعث ہوں گی:۔

(۱) حضرت خواجہ گنج بخش ہجویریؒ کی تاریخ وفات:

خانقاہِ علی ہجویری

خاک	جاروب	از	درش بردار
طوطیا	کن	بدیدۂ	حق بیں
تاشوی	واقفِ	دگر	اسرار
چونکہ	سردارِ	مُلکِ	معنی بود
سال و وصلش	بر	آمد	از ''سردار''

۴۵۸ھ (۱۰۷۲ء)

(۲) ہمایوں بادشاہ کی تاریخ تخت نشینی:۔

''کشتیِ زر'' (=۹۳۷ھ)

وفات:۔

''ہمایوں بادشہ از بام افتاد'' ۹۶۱ھ

(۳) شہنشاہ اکبر کی تاریخ وفات: الف کشیدہ ملائک زِ ''فوت اکبر شاہ'' = ۱۰۱۳-۱=۱۰۱۲ھ

(۴) شہنشاہ اکبر کا رضاعی بھائی مرزا محمد عزیز دیپال پور کا گورنر تھا اکبر اور شہزادہ سلیم وہاں دورے پر گئے تو اس نے بہت پرتکلف ضیافت دی اور تحائف پیش کئے۔تاریخ نکلی:۔

''مہمانِ عزیز اندشہ وشہزادہ'' = ۹۱۲ھ

(۵) راجہ بھگوان داس اور ٹوڈرمل دونوں ایک ہی سنہ میں فوت ہوگئے۔تاریخ ہوئی:

''بگفتا ٹوڈرو بھگوان مروند'' = ۱۰۴۸ھ

(۶) شہزادہ سلیم کی شادی راجہ مان سنگھ کی ہمشیرہ سے ہوئی۔اکبر بارات لے کر گیا۔تاریخ نکلی:۔

''قرانے شدہ ماہ و پروین را'' = ۹۹۳ھ

(۷) ابوالفضل کے والد شیخ مبارک کی تاریخ وفات:۔

''شیخ کامل''=1001ھ

(۸) ابوالفضل کوشہزادہ سلیم نے قتل کرادیا تھا۔

تاریخ نکلی ''تیغِ اعجاز نبی اللہ سرِ باغی ؎ بُرید''

۱۰۱۰ھ

دوسری تاریخ کے متعلق تاریخوں میں لکھا ہے کہ قتل کے بعد کسی دوست کوخواب میں ملا اور کہا کہ میری تاریخ تو ''بندہ ء ابوالفضل'' سے نکلتی ہے

(۹) تاریخ وفات جہانگیر:۔

''جہانگیر از جہان رفت''=۱۰۳۶ھ

(۱۰) تاریخ وفات عبدالرحیم خان خانان پسر بیرم خان:۔

''خان سپہ سالار گو''=۱۰۳۶ھ

(۱۱) ایک شخص کا جوان لڑکا فوت ہوگیا۔تاریخ کہی:۔

''داغِ جگر''=۱۲۲۸ھ

؎ ابوالفضل دراصل بے دین آدمی تھا اس نے اکبر کو''دینِ الٰہی'' پر ڈالا تھا۔حضرت خلیفہ اوّلؓ نے بھی اپنی بیاض میں اس کے متعلق حضرت مسیح موعودؑ کا قول نقل کیا ہے کہ''ابوالفضل نے کہا ہے۔''کُشتنِ انسان غازہ دلدل شُد'' ایسے معلوم ہوتا ہے کہ منکرِ نبوت تھا''

اگلے سال دوسرا لڑکا فوت ہوگیا۔تاریخ کہی۔

داغ دِگر=۱۲۲۹ء

(۱۲) ملکہ ہندوستان نور جہاں نے اپنا سنِ وفات خود کہا تھا:۔

تنِ عاجزہ چوں تہِ خاک شُد

فلک گفت: ''خس کم جہاں پاک شُد''

۱۱۰۶ھ

(۱۳) تاریخ بنائے (شاہ جہاں آباد) دہلی:۔

''شُد شاہِ جہاں آباد از شاہِ جہاں آباد ''

۱۰۵۸ھ

(۱۴) تاریخ بنائے شالامار باغ:۔

چوں شاہ جہاں بادشاہ حامیء دیں

آراستہ شالا مار با طرزِ متیں
تاریخ بنائے ایں زِ رضوان جُستم
گفتا کہ بگو ''نمونۂ خُلدِ بریں''

۱۰۴۷ھ

(۱۵) عہدِ شاہ جہاں میں چنیوٹ کے رہنے والے حکیم شیخ علم الدین انصاری نے شہر لاہور کے وسط میں عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی۔ چونکہ حکیم صاحب کا خطاب ''وزیر خان'' تھا اس لئے ''مسجد وزیر خان'' کہلاتی ہے تاریخ نکلی:۔

سالِ تاریخ بنائے مسجد عالی مقام
از خرد جُستم بگفتا ''سجدہ گاہ اہلِ فضل''

۱۰۴۴ھ

دوسری تاریخ:۔

تاریخ ایں بنائے چو پُرسید از خرد
گفتا بگو کہ ''بانیء مسجد وزیر خان''

۱۰۴۴ھ

(۱۶) شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بڑی بیٹی زیب النساء مدفون لاہور نواں کوٹ کی تاریخ وفات:۔

آہ زیب النساء بحکمِ قضا
ناگہاں ز نگاہ مخفی شُد
سالِ تاریخش از خرد جُستم
گفت ہاتف کہ ''ماہ مخفی شُد''

۱۰۸۰ھ

واضح رہے کہ شہزادی کا تخلص مخفی تھا۔

(۱۷) مشہور شاعر ابراہیم ذوقؔ دہلوی کی تاریخ وفات خود آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ثانی نے کہی تھی ۔

شبِ چار شنبہ بماہِ صفر
بہ حکمِ خداوند جان داد ذوقؔ
ظفرؔ روئے اُردو بہ ناخنِ زِ غم
خراشید و فرمود ''استاد ذوقؔ''

۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء)

(۱۹) میر انیس لکھنوی کی تاریخ وفات ان کے حریف مرزا سلامت علی دبیر نے کہی ۔

''طورِ سینا بکلیم اللہ منبر باللہ باغیں''

۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء)

(۱۹) سب سے پیاری تاریخ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی ہے جو حکیم مومن خان مومن نے نکالی تھی یعنی ۔

''دست ِ بے دادِ اجل سے بے سروپا ہو گئے

فقر و دیں ، فضل وہنر ، لطف و کرم علم و عمل''

ق ی ض ن ط ر ل م

۱۲۳۹ھ

قادر الکلام استاد نے کس خوبصورتی سے خوبیاں گنوائی ہیں اب اتفاق کہہ لیں یا ریاضی کا کمال کہ سولہ آنے کھری بات بھی کہہ دی اور حساب بھی پورا نکلا ۔اور کمال یہ کہ دوسرے مصرعہ کے درمیانی حروف کے مجموعہ سے یہ تاریخ نکالی ہے۔

(۲۱) رنجیت سنگھ کی داشتہ موراں نے جو لاہور کی ایک مسلمان لڑکی تھی ۔ٹکسالی دروازے کے باہر شاندار مسجد بنوائی ۔مسجد کی تاریخ ملاحظہ ہو:۔

بفضلِ ایزد دارائے افلاک

چو موراں مسجد سے آراستہ برِ خاک

بتاریخِ بنائے گفت ہاتف

''شدہ تعمیر للہ مسجدِ پاک''

۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء)

(۲۲) ملکہ وکٹوریہ کی تاریخ وفات :۔

''فخرِ بوستانِ بشر'' دوسری: ''غایت شفیق'' ۱۹۰۱ھ

(۲۳) حضرت مسیح موعودؑ کے فرزند مرزا مبارک احمد مرحوم ۱۳۲۴ھ میں فوت ہوئے ۔مکرم عبداللطیف خان صاحب اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکریٹری ربوہ کے تایا خان عبدالستار خان صاحب نے تاریخ کہی :۔

''جا مبارک تجھے فردوس مبارک ہووے''

۱۳۲۴ھ

(۲۴) داغ دہلوی کی تاریخ وفات ڈاکٹر اقبال نے ان کے نام سے ہی نکالی :۔

''نواب میرزا داغ'' ۱۹۰۵ء

(۲۵) حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے قرآن کریم حفظ کیا تو تاریخ نکلی

''حافظِ قرآن''(۱۳۴۰ھ)

(۲۶) حضرت قاضی اکملؓ کی والدہ کا نام مریم بیگم تھا ان کا کتبہ بہشتی مقبرہ قادیان میں لگا ہوا ہے تاریخ ہوئی۔

''مریم بے غم''

۱۳۴۲ھ

(۲۷) خاکسار راقم الحروف نے ایک صاحب شیخ عبدالرحمٰن مصری مراد ہیں۔ کے اپنے موقف سے ہٹ جانے پر تاریخ کہی تھی۔ ع

''جنابِ شیخ کو کعبے میں بھی خدا نہ ملا''

۱۹۳۷ء

ہماری جماعت میں حضرت مولوی عبیداللہ بسمل مرحوم فارسی زبان کے جید عالم و شاعر تھے۔ حضرت مولوی غلام رسول مرحوم راجیکیؓ اردو، فارسی اور عربی کے اور حضرت قاضی ظہور الدین اکملؓ اردو کے یہ تینوں بزرگ اور اسی طرح بعض اور شاعر فن تاریخ گوئی میں دسترس رکھتے تھے۔

افسوس کہ یہ دلچسپ فن ناپید ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ وضعداری نہیں رہی جو اگلے وقتوں میں تھی۔ اب تو یادیں باقی رہ گئی ہیں جو۔ ع

''گاہے گاہے باز خواں ایں قصہء پارینہ را''

کے تحت نوکِ قلم پر آجاتی ہیں۔

(ماہنامہ خالد مئی ۱۹۷۶ء)

لارڈ ڈفرن کا ایک سچّا واقعہ

فریڈرک ٹمپل ہملیٹن ٹمپل بلیک ووڈ نام تھا اور خطاب لارڈ ڈفرن تھا۔ لارڈ رپن کے بعد ۱۸۸۴ء میں ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے اور ۱۸۸۸ء تک یہاں رہے۔ اس سے قبل کینیڈا کے گورنر جنرل رہ چکے تھے۔ بعد میں برطانیہ کے سفیر بھی رہے۔ زمانہ سفارت میں ان کو ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جو ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ لارڈ ڈفرن کے ایک دوست نے جو شمالی آئرلینڈ کا رہنے والا تھا ان کو دعوت دی کہ کچھ دنوں کے لئے میرے ہاں آ کر مقیم ہوں۔ یہ وہاں چلے گئے۔ رات کو شب خوابی کا لباس پہن کر لارڈ ڈفرن سونے لگے اور بستر پر دراز ہوئے ہی تھے کہ بغیر کسی خاص وجہ کے بستر سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ کمرہ کی فضا میں ایک بجلی سی کوندی اور مہمان کے دماغ میں خوف اور ایک ان جانی سی نحوست کے خیالات پیدا ہوئے جسے وہ کبھی بھی بیان نہ کر سکے۔

کمرے میں پورے چاند کی روشنی تو پھیلی ہوئی تھی مگر اس میں ایک اُداسی تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک جھٹکا سا دیا یہ دیکھنے کیلئے کہ آیا وہ واقعی جاگ رہے ہیں نا۔ پھر سگریٹ سلگایا مگر دل پر ایک خوف سا چھانے لگا اور حالت دگرگوں ہونے لگی۔ انہوں نے خود ہی فتویٰ لگایا کہ وہ چاند سے مسحور ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی آئرلینڈ میں پرانے مکانات میں مردہ روحوں کے خوف کی کہانیاں مشہور ہیں مگر ان باتوں کے وہ قائل ہی نہ تھے۔ سوچتے رہے کہ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ کبھی درختوں کی سرسراہٹ سمجھتے کبھی رونے کی آوازیں آتیں۔ سمجھ نہ آتی تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

کافی انتظار کے بعد پھر وہی آہوں اور سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر سمجھے کہ شاید باہر کوئی شخص کراہ رہا ہے۔ سخت پریشان تھے۔ عین اس وقت چاندنی میں ایک آدمی نمایاں ہوا جس کے کندھوں پر ایک وزنی تابوت تھا۔ درختوں میں سے نکلا۔ لارڈ ڈفرن نے سمجھا کہ ضرور یہ شخص قبرستان سے لاش نکال کر تابوت سمیت لئے جا رہا ہے وہ نیچے اترے اور لان سے گزر کر اس کے قریب گئے اور بلند آواز سے کہا۔

''ارے یہ کیا لئے جا رہے ہو؟''

اس چیلنج پر اس شخص نے لارڈ ڈفرن کی طرف دیکھا۔ وہ چہرہ نہایت منحوس، جھریوں والا اور بدشکل تھا۔ یہ وہ ڈراؤنا چہرہ تھا جسے وہ برسوں نہ بھلا سکے انھوں نے اپنے ہوش وحواس مجتمع کئے اور پھر بولے

''کہاں جا رہے ہو؟''

جب اسے پکڑنا چاہا تو وہ ہیولہ غائب ہو گیا اور یوں معلوم ہوا جیسے لارڈ ڈفرن اُس آدمی کے بیچ میں سے گزر گئے ہیں۔ مگر وہ آدمی ہاتھ نہ آیا۔

شبنم آلود گھاس پر کسی پاؤں کے نشانات بھی نہ تھے وہ حیران و پریشان کمرے میں آئے اور اپنی ڈائری میں یہ واقعہ لکھنے لگے۔ صبح ناشتے کے وقت لارڈ ڈفرن نے اپنے میزبان سے دریافت کیا کہ کیا یہاں قریب کوئی شخص فوت ہوا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ عرصہ سے اس گلی میں تو کیا اردگرد کے علاقہ میں بھی کوئی نہیں مرا۔

کئی سال کے بعد جب وہ پیرس میں سفیرِ دولتِ برطانیہ تھے تو گرینڈ ہوٹل میں ایک دعوت عصرانہ تھی۔ ڈفرن صاحب کو بوجہ سینئر سفیر ہونے کے فوقیت حاصل تھی۔ ان کا سیکرٹری آگے بڑھا اور عرض کیا کہ آپ ہوٹل کی لفٹ میں تشریف لائیں تو پانچویں منزل پر جاسکیں گے۔ لارڈ صاحب لفٹ میں سوار ہونے کیلئے آگے بڑھے ہی تھے کہ معاً چند قدم پیچھے ہٹ گئے یکایک ان کے سامنے لفٹ والے شکل میں ہو بہو وہی چہرہ نظر آیا جو انہوں نے برسوں قبل رات کے وقت اپنے دوست کے ہاں دیکھا تھا اور خوفزدہ ہو گئے تھے۔ لارڈ نے اپنے سیکرٹری کو بھی ہاتھ کے اشارے سے لفٹ کی طرف جانے سے منع کر دیا۔

لارڈ ڈفرن نے اس لفٹ والے کو نہایت خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہی جھریوں والا منحوس سا چہرہ تھا مگر یہ بدشکل گرینڈ ہوٹل پیرس میں کیسے آیا؟

یہ خیالات ان کے دماغ میں اس قدر سرعت کے ساتھ گزرے جس طرح ایک ڈوبنے والے کے دماغ میں ڈوبتے وقت اس کی گزشتہ زندگی کے حالات فلم کی طرح گزرتے ہیں۔ لارڈ ڈفرن نے نہایت شائستہ الفاظ میں اوپر جانے سے معذرت کی اور اپنے سیکرٹری کو وہیں چھوڑ کر واپس آگئے۔ اس اثناء میں دوسرے معزز مہمان لفٹ میں سوار ہو گئے تھے لفٹ کا دروازہ بند کر دیا گیا اور لفٹ اُوپر کو اُٹھنے لگی۔ لارڈ ڈفرن ہوٹل کے مینیجر کے کمرے میں گئے اور اسے پوچھا کہ:۔

"یہ لفٹ مین کون ہے؟ کب سے آپ کے پاس ملازم ہے؟

اتنے میں بڑے زور کا دھاکہ ہوا اور ہوٹل میں شور وغل مچ گیا۔ سب لوگ لفٹ کی طرف دوڑے دیکھا کہ لفٹ کے سٹیل کے رسّے بہت بلندی پر جا کر ٹوٹ گئے تھے اور لفٹ مع سواروں کے دھڑام سے نیچے آگری اور تمام لاشیں قیمہ ہو چکی تھیں۔

یہ تاریخی واقعہ اس زمانے کے تمام اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ وہ منحوس چہرہ والا آدمی بھی لفٹ کے ساتھ ہی گر کر ہلاک ہو چکا تھا جسے لارڈ ڈفرن نے پہلی بار آئیرلینڈ میں اپنے دوست کے گھر دیکھا تھا۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

یہاں ضمناً یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ لارڈ ڈفرن نہایت شریف، معقول اور شائستہ انسان تھے۔ جامع مسجد دہلی کے بالکل قریب ڈفرن ہسپتال ان کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

علاوہ ازیں یہ وہی صاحب تھے جن کو ملکہ وکٹوریہ نے لکھا تھا کہ ان کیلئے کوئی موزوں اتالیق بھجوائیں جو ملکہ

معظّمہ کو اردو۔ فارسی اور اسلامیات پڑھائے۔ انہوں نے آگرہ کے حافظ شیخ عبدالکریم کو بھجوایا تھا اور تیرہ برس تک وہ ملکہ وکٹوریہ کے ہمراہ رہے۔

ملکہ کی دیکھا دیکھی لارڈ ڈفرن نے بھی بڑی محنت شاقہ سے بڑھاپے میں فارسی پڑھی تھی سر ایڈورڈ ڈینی سن راس (جو کلکتہ میں اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی رہے ہیں اور تقریباً سات آٹھ مشرقی زبانوں پر ماہرانہ عبور رکھتے تھے) نے اپنی سوانح عمری .BOTH ENDS OF THE CANDLE میں لکھا ہے کہ۔

''ایک دن لارڈ ڈفرن ان کے گھر پر خود آئے اور فارسی پڑھنے کی خواہش کی۔'' ایک شرط پر کہ لیڈی ڈفرن کو اس بات کا علم نہ ہو۔ سر ایڈورڈ نے ہنس کر پوچھا کہ اس میں کیا بات ہے؟ تو لارڈ ڈفرن نے کہا کہ میری بیوی کا خیال ہے کہ فارسی پڑھنا بالکل بیکار ہے۔ عربی پڑھی جائے تو ایک بات بھی ہے کیونکہ جنت میں حوروں کی زبان عربی ہوگی۔

(ماہنامہ تشحیذ الاذہان دسمبر ۱۹۷۵ء)

جمعہ 11-9-1981 دارالعلوم شرقی ربوہ

"گذشتہ رات خواب میں حضرت مسیح موعودؑ کی زیارت ہوئی۔ تو میں نے عرض کیا کہ دعا فرمائیں کہ قیامت کے روز پکڑا نہ جاؤں اور نجات ہو جائے۔ حضور نے فرمایا ہاں میں ضرور دعا کروں گا۔ پھر عرض کیا کہ یہ بھی دعا فرمائیں کہ ہمارے بعد ہمارے بچے احمدیت پر سختی سے قائم رہیں۔ حضورؑ نے پھر فرمایا ہاں میں دعا کروں گا اور مجھے تسلی دی۔"

عبیداللہ شاکر

یہ میرے اس خواب سے بالکل ملتا ہے جو میں نے پہلے عرصہ ہوا دیکھا تھا کہ ایک کمرے میں حضرت اقدسؑ ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں [illegible] بزرگ حضورؑ کے پیچھے کھڑے ہیں۔ لوگ ایک ایک کر کے ایک دروازے سے آتے ہیں اور اپنی عرض پیش کر کے دوسرے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں۔ جب میں حاضر ہوا تو میں نے اسی وقت ہی عرض کی کہ دعا فرمائیں میری نجات ہو جائے تو حضور نے مجھے غور سے دیکھا اور فرمایا ہاں انشاءاللہ نجات ہو جائے گی۔

عبیداللہ شاکر

جمعہ 11.9.1981

محترم عبدالرحمان شاکر صاحب نے علمی اور علم پرور ماحول میں آنکھ کھولی اور اپنے والد مکرم نعمت اللہ گوہر صاحب بی۔اے (رفیق حضرت مسیح موعود) کے علمی ورثہ سے حصہ پایا۔

آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اردو۔ عربی۔ فارسی اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ اس لئے ان زبانوں کی کتب ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ آپکا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ خلافت لائبریری میں خدمت کے دوران آپکو مطالعہ کی چاٹ لگ چکی تھی۔ جو تمام عمر جاری رہی۔ خاکسار کا بھی ابتدائی تعارف لائبریری میں ہی ہوا تھا۔ شاکر صاحب کی تحریر ماشاء اللہ دلچسپ اور معلومات افزاء ہوتی تھی۔ آپ کے مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ قادیان کے بزرگان سلسلہ جن میں حضرت مسیح موعود کے رفقاء بھی ہیں کی سیرت وسوانح

۲۔ جماعت احمدیہ کی تاریخ کے واقعات اور حضرت مسیح موعود کی پیشگوئیوں کے پورا ہونے کی تفصیل۔

۳۔ عام تاریخی واقعات۔ ۴۔ ادبی مضامین

ان مضامین کو پڑھتے ہوئے جو شخصیت سامنے آتی ہے وہ ایک بڑی علمی شخصیت کا تاثر ہے۔ مگر شاکر صاحب مرحوم اپنی ذات میں منکسر المزاج، ملنسار، مہمان نواز۔ علم نواز، پرانے تعلقات کو یاد رکھنے والے اور قادیان کی چلتی پھرتی تاریخ تھے۔ ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ چھوٹی سی بات کے استفسار پر معلومات کا دریا بہا دیتے تھے۔ طبیعت میں پاکیزہ مزاح کا پہلو تھا۔ علمی وادبی لطائف ان کی گفتگو کا حصہ تھے۔

خاکسار کو گھنٹوں ان کی خدمت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ آخری عمر میں وہ میری رہائش کے قریب منتقل ہو گئے تھے تو تقریباً روزانہ ان سے ملاقات ہوتی تھی اور علمی ادبی اور سلسلہ کے بزرگان کی باتیں ہوتی رہتی تھیں جب تک صحت نے اجازت دی خلافت لائبریری میں جاتے اور نئی کتب حاصل کر کے مطالعہ کرتے رہے۔ جب صحت بہت کمزور ہو گئی تو مطالعہ کا پوچھتے رہتے۔ گویا خاکسار کو کتاب کے مطالعہ کے بعد شاکر صاحب کی خدمت میں خلاصہ بھی پیش کرنا ہوتا تھا۔

خدا رحمت کنند ایں عاشقان پاک طینت را

مرزا خلیل احمد قمر